Scanned by CamScanner

تمام کتابیں بغیر کسی مالی فائدے کے پی

ڈی ایف کی جاتی ہیں ۔

مصنف کے خیالات سے ہمارا متفق ہونا

ضروری نہیں ۔

فیس بک گروپ

کتابیں پڑھئے

ایڈمن ۔ سید حسین احسن

0344-818-3736

0314-595-1212

غالب
اور
اُن کے مُعترضین
سید لطیف الرحمٰن

تاریخ طباعت — جنوری ۱۹۷۳ء

مقام اشاعت — کلکتہ

قیمت — ۱۲ روپے

ملنے کا پتہ

عثمانیہ بُک ڈپو

۱۲۵ رابندرا سرانی کلکتہ ۱

Scanned by CamScanner

بقائے نام سے فانی بھی مثلِ باقی ہے
کرو وہ کام جو بعد از فنا چلا رکھے

لطیفؔ

فہرست مضامین

سیّد لطیفُ الرّحمٰن

غالب نامم آورم نام و نشانم مپرس   ہم اسد اللہم و ہم اسد اللہیم
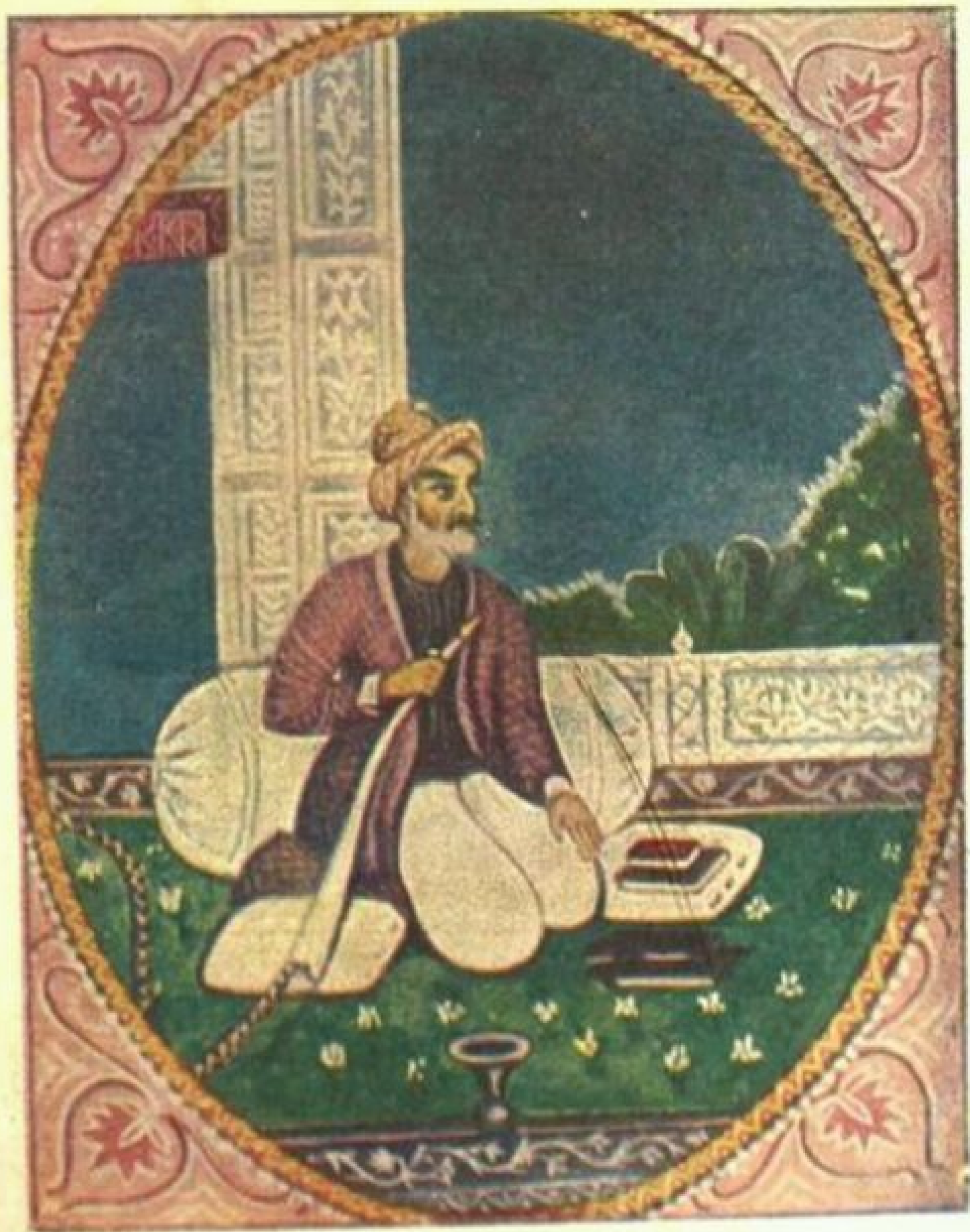
ہوگا کوئی ایسا بھی جو غالب کو نہ جانے   شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

عرض حال

۱۵ فروری ۱۸۶۹ء میں مرزا اسد اللہ خاں غالب کا انتقال ہوا تھا۔
۱۵ فروری ۱۹۶۹ء کو غالب کے انتقال کو پورے ایک سو سال ہو رہے تھے۔
اس موقع پر سوویت روس نے غالب کی صد سالہ برسی منانے کا اعلان کیا۔
ساری دنیا نے اس اعلان پر لبیک کہا۔ حکومت ہند نے وسیع پیمانے پر
صد سالۂ غالب منانے کا پلان مرتب کیا اور ۱۵ فروری ۱۹۶۹ء سے ۲۸
فروری ۱۹۷۰ء تک غالب کا صد سالہ منانے کی مدت مقرر کی۔ جیسے جیسے
وہ دن قریب آتے گئے، ویسے ویسے جوش و خروش بڑھتا گیا۔ میرے اندر
بھی جوش پیدا ہوا کہ مرزا غالب پر ایک مستقل کتاب لکھوں۔ لیکن میں اپنی کتاب
"تجلیات شورستان فارسی" کی طباعت کے سلسلے میں پریس والوں کی
نافرض شناسیوں اور بیہودگیوں کے دام میں اس بری طرح پھنسا ہوا تھا
کہ غالب پر مستقل کتاب لکھنا میرے لئے ناممکن ہو گیا۔ چنانچہ کتاب لکھنے کا ارادہ
ملتوی کر دیا۔ تاہم یہ چاہتا تھا کہ اس موقع پر غالب پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھوں۔
مگر ایسی کتاب نہیں کہ جس کے لئے لائبریریوں کی خاک چھاننی اور وقت نظر
سے کتابوں کی ورق گردانی پڑے۔ بلکہ ایسا کام ہونا چاہئے کہ شام کے وقت
جب محمد زناتھ پارک (یعنی سابق کرزن پارک) میں ہوا خوری کے لئے بیٹھوں تو
ہوا کھانے کے ساتھ ساتھ یہ کام بھی انجام دے سکوں۔ چنانچہ اس خیال کے

زیرِ اثر میں نے غالب کی تعریف میں پندرہ پندرہ بیس بیس شعروں کی غزلیں کہنی شروع کر دیں اور مہینہ بھر میں غالب کی تعریف میں دس غزلیں اور تیرہ رُباعیاں اور غالب کی زمینوں میں تیرہ غزلوں کے علاوہ چھ تمہیدی رُباعیاں کہہ لیں۔ ان تمام اشعار کو کتابی شکل میں "غالب سرائی" کے نام سے شائع کر دیا اور اپنی جھوٹی تسلی کر لی۔ لیکن یہ فخر میرے لئے مخصوص ہے کہ کلکتہ بلکہ مغربی بنگال سے غالب کے صد سالہ کے موقع پر "غالب سرائی" کے سوا کوئی کتاب یا رسالہ شائع نہیں ہوا۔ کلکتہ میں غالب کا صد سالہ ضرور منایا گیا لیکن صرف مشاعرے کر کے۔ لہٰذا "غالب سرائی" اگرچہ ایک معمولی سا بتیس صفحے کا کتابچہ ہے لیکن چونکہ ایک شاندار موقع کی کلکتہ کی واحد چیز ہے اس لئے اس کی کچھ نہ کچھ اہمیت ضرور ہے۔

غالب کے صد سالہ کے موقع پر انجمن ترقّیِ اُردو ہند شاخ کلکتہ غالب پر ایک کتاب شائع کرنے والی تھی جس میں غالب پر اہم مضامین شامل کئے جانے کو تھے۔ انجمن کے ارباب حل و عقد نے کلکتہ کے بعض اہل قلم سے غالب پر مضامین لکھنے کی استدعا کی۔ مجھ سے بھی فرمائش کی گئی۔ میں نے ان کی فرمائش کی تعمیل کرتے ہوئے ایک طویل مضمون لکھا۔ ایک خط کے ذریعہ مجھے اطلاع دی گئی کہ انتخاب کمیٹی نے کتاب میں شمولیت کے لئے میرا مضمون منظور کر لیا ہے۔ جب بقدرِ ضرورت مضامین دستیاب ہو چکے تو کتاب کی طباعت کی تیّاریاں شروع ہوئیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ کتاب کے بیشتر حصّے کی کتابت ہو چکی تھی۔ بعد میں میرے استفسار پر بتایا گیا کہ پوری کتاب کی کتابت ہو چکی ہے اور امروز فردا میں مطبع میں طباعت کے لئے جانے والی ہے۔ لیکن یہ کتاب اب تک منظر عام پر

نہیں آئی۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ انجمن والوں کو اُردو کی محبت کا دم بھرنے والوں سے جس تعاون کی توقع تھی وہ نہ مل سکا۔

میں نے غالب پر مستقل کتاب لکھنے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا لیکن ترک نہیں کیا تھا۔ اب جب انجمن ترقی اُردو غالب پر مجوزہ کتاب شائع نہ کر سکی۔ تو میں سوچنے لگا کہ اپنے مذکورہ مضمون کو بڑھا چڑھا کر ایک کتاب بنا دوں اور چونکہ "تجلیات شعرستان فارسی" اور مذکورہ مضمون لکھتے وقت میں غالب پر لکھی ہوئی بہت ساری کتابوں کا مطالعہ کر چکا تھا اس لئے مواد اکٹھا کرنے میں کچھ آسانیاں تھیں۔ لہٰذا کتاب لکھ ہی ڈالنے کا عزم بالجزم کر لیا۔ لیکن ساتھ ہی یہ خیال آنے لگا کہ طباعت کا مسئلہ حل کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ آخر یہ مسئلہ کیونکر حل ہو گا۔ میرے ایک شاگرد عزیز نے کہا کہ آپ کتاب لکھ ڈالئے۔ طباعت کا انتظام ہو جائے گا۔ عزیز موصوف کے دل بڑھانے پر میں نے زیر نظر کتاب یعنی "غالب اور ان کے معترضین" لکھ ڈالی۔ غالب کی تخلیقات کے بارے میں غالب کے مؤیدین اور معترضین کے خیالات کیا ہیں، غالب اور ان کے مخالفین میں کیا کیا ٹکراؤ ہوئے اور تائید و اعتراض کے سلسلے میں کیا کیا بال کی کھال نکالی گئی ان سب باتوں کو تفصیل اور تبصرول کے ساتھ اس کتاب میں جمع کیا گیا ہے۔ آخر میں "شخصیات کا تعارف" کے عنوان سے ایک باب شامل کر دیا گیا ہے۔ اس باب میں ان تمام لوگوں کا مختصر تعارف ہے جن کے نام ضمناً کتاب کے اندر آئے ہیں۔ لیکن چونکہ ان کے حالات معلوم رہنے پر مباحثات پڑھنے میں زیادہ لطف آئے گا اس لئے قارئین کے

واسطے بہتر ہوگا کہ پہلے ہی اس باب کو پڑھ لیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ معلومات کا انبار فراہم کیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ میری استعداد بہت کم ہے اس لئے اس کتاب کو جیسا ہونا چاہئے تھا نہ ہو سکی۔ مگر میں نے اس کتاب کے لکھنے میں بڑی محنت اور تحقیق کی ہے۔ اس لئے ارباب نظر سے اُمید ہے کہ میری محنت و تحقیق سے ضرور متاثر ہونگے۔ اس کتاب کا موضوع چونکہ خشک ہے اس لئے کتاب کو خشک ہونا چاہئے تھا۔ لیکن میں نے شگفتہ و سادہ زبان و بیان اور دلکش طرز تحریر اختیار کر کے کتاب کو خشک نہیں ہونے دیا۔

اس کتاب کی تالیف کے سلسلے میں مجھے جن حضرات کا تعاون حاصل رہا ان کا شکریہ ادا کرنا میرا اخلاقی فرض ہے۔ ان حضرات میں نیشنل لائبریری کے اسسٹنٹ لائبریرین جناب سید مقیت الحسن صاحب ایم۔ اے کا نام سرفہرست ہے۔ موصوف بڑے خوش مزاج انسان ہیں صرف اتنا ہی تعاون نہیں کرتے کہ مستعدی سے کتابیں نکلوا دیتے ہیں بلکہ ضروری اور کارآمد کتابوں کا پتہ اور مفید مشورے دے کر محققین کی مشکلات کو آسان بھی کرتے ہیں۔ مذکورہ لائبریری کے جونیئر ریفرنس اسسٹنٹ محمد عثمان صاحب بھی بڑی خندہ پیشانی سے ریڈروں کی مدد کرتے ہیں۔ ایشیاٹک سوسائٹی مغربی بنگال کے لائبریرین جناب سیب داس چودھری صاحب، جناب عبدالاحد عثمانی صاحب، جناب آغا صاحب (عثمانیہ بک ڈپو ......)، جناب قمرالحسن صاحب (بشیر حسن اینڈ سنس تاجران کتب کے مالک) اور عالی جناب

شانتی رنجن بھٹاچاریہ صاحب، خاص طور پر میرے شکریے کے مستحق ہیں۔
شانتی رنجن صاحب نے مجھے دو چار ایسی کتابیں دیں جو اس کتاب کی تالیف
میں بڑی مفید ثابت ہوئیں اور یہ کتابیں کلکتہ میں شاید ہی دستیاب ہوں۔
آغا صاحب مجھے مطالعہ کے لیے بہت ساری کتابیں مفت دیا کرتے ہیں جسکی
وجہ سے میری مشکلیں کم ہوگئیں۔ اب مجھے ان لائبریریوں کا شکریہ ادا کرنا ہے
جہاں سے مجھے نایاب بنیادی مواد کی کتابیں ملیں یہ لائبریریاں ہیں نیشنل لائبریری۔
ایشیاٹک سوسائٹی مغربی بنگال اور مکرمی شانتی رنجن بھٹاچاریہ صاحب کا
ذاتی کتب خانہ۔ آخر میں مجھے محبّی و مکرمی جناب عبدالرشید صدیقی صاحب (ملازم
گورنمنٹ آف انڈیا۔ چیف کنٹرولر آف ٹیلیگراف اسٹورس) کا شکریہ ادا کرنا
ہے انھوں نے کتاب کا مسودہ صاف کیا۔

اس کتاب سے پہلے میری اور بھی دو تین کتابیں منظر عام پر
آچکی ہیں جن کی تفصیل پیش کرنے سے پہلے اپنے بارے میں کچھ کہنا ضروری
سمجھتا ہوں۔

میں کلکتے کا خاص الخاص باشندہ ہوں۔ میرے آبا و اجداد بھی
کلکتے کے رہنے والے تھے لیکن مجھے اُردو اور فارسی زبان و ادب سے
ایک فطری لگاؤ رہا ہے۔ چنانچہ بنگالے سے پیدائشی تعلق ہوتے اور بنگالے
میں رہتے ہوئے بھی میں نے بنگلہ زبان کی بجائے اُردو کو بذریعہ تعلیم
کے طور پر اختیار کیا۔

میری تعلیم کی ابتدا ایک مسجد واقع نمبر ۱۶ ۔ اقبال پور لین خضر پور کلکتہ ۲۳

کے مکتب میں قرآن و دینیات کی تعلیم سے ہوئی۔ اس مکتب کے اساتذہ میں حضرت مولانا مولوی ابوصالح صاحب مجھ پر بڑے مہربان تھے۔ انھوں نے مجھے قرآن و دینیات کی تعلیم بقدر ضرورت دے کر انگریزی تعلیم کے راستے پر ڈال دیا۔ مولانا ابوصالح صاحب بابو میاں جونیئر مدرسہ خضر پور میں ہیڈ مولوی تھے۔ انھوں نے مجھے اس مدرسہ میں داخل کرا دیا اور میں دو ڈھائی سال تک وہاں تعلیم پاتا رہا۔

۱۹۳۳ء میں مجھے مدرسہ عالیہ کلکتہ (یعنی کلکتہ مدرسہ) کے بہرۂ انگریزی کی پانچویں جماعت میں داخل کیا گیا۔ ۱۹۳۹ء میں کلکتہ یونیورسٹی کے میٹریکولیشن امتحان میں درجہ اوّل میں کامیاب ہوا۔ میرے وقت میں خان بہادر مولوی محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسی باعظمت اور پُر وقار ہستی مدرسہ عالیہ کے ہیڈ ماسٹر تھے اور مدرسہ اس وقت اپنے عظیم الشان دور سے گذر رہا تھا۔ مولانا حافظ سید محمود باروی رحمۃ اللہ علیہ جیسے تجربہ کار، فرض شناس، دیانت دار اور فارسی، اُردو اور عربی کے زبردست عالم مدرسہ میں فارسی اور اُردو کے مدرّس تھے۔ چنانچہ مجھے جو تھوڑی بہت فارسی اور اُردو آتی ہے وہ انھیں استاذی المعظم کا فیضان ہے۔ ان دو واجب الاحترام حضرات کے علاوہ مولوی محمد رقیب صاحب، مولوی عبدالکریم صاحب، مولوی اصغر علی صاحب، مولوی محمد عثمان صاحب، مولوی محمد اکرام صاحب، مولوی محمد غلام سرور صاحب، مولوی وحید النبی صاحب، مولوی محمد عبداللہ صاحب، مولوی سید انوار صاحب، مولوی سلطان احمد صاحب، مولوی خلیل اللہ صاحب، مولوی محمد خلیل الرحمٰن صاحب

مولوی محمد خلیل صاحب، مولوی محمد شفیع صاحب اور پروفیسر عباس علی خاں بیخود صاحب مدرسے میں میرے اُستاد تھے۔ اللہ تعالیٰ دین و دُنیا میں ان بزرگوں کو اپنی رحمت سے سرفراز فرمائے۔

۱۹۴۲ء میں سینٹ زیویر کالج کلکتہ سے آئی۔اے کیا۔ میرے وقت میں فادر اسکیپیر ریکٹ (یعنی پرنسپل) تھے۔ پروفیسر ایس کے داس، پروفیسر متر، پروفیسر جے جے پنٹو، فادر برائن، فادر ٹروئین، فادر ریو، فادر گومز، پروفیسر عبد العلی فغاں اس کالج میں میرے اُستاد تھے ۱۹۴۴ء میں اسلامیہ کالج کلکتہ (یعنی مولانا آزاد کالج کلکتہ) سے بی۔اے کیا۔ ڈاکٹر عترت حسین زبیری پرنسپل تھے۔ پروفیسر سین، پروفیسر اندرا، پروفیسر طیب، پروفیسر منظفر الدین ندوی، پروفیسر اختر حسن، پروفیسر خلیل الرحمٰن، پروفیسر گوہا ٹھاکرتا، پروفیسر عبد السبحان، پروفیسر صادق، پروفیسر عباس علی خاں بیخود اس کالج میں میرے اُستاد تھے۔ میں نے بی۔اے تک تعلیم حاصل کی لیکن ایک غریب یتیم کا بی۔اے تک تعلیم حاصل کر لینا اللہ تعالیٰ کی خاص الخاص مہربانی پر دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ جب میں دو ڈھائی برس کا تھا تو میری والدہ فاطمہ خاتون کا اور جب میں آٹھ نو برس کا تھا تو میرے والد سید عزیز الرحمٰن کا انتقال ہو گیا۔ کئی برس خالہ خالو کے سایۂ عاطفت میں رہا۔ پھر بڑی ہمشیرہ عمدۃ الکبریٰ صاحبہ اور بہنوئی سید محمد عباس علی صاحب کے سایۂ عاطفت میں رہا انھیں دونوں نے مجھے بی۔اے تک تعلیم دلوائی۔

اپنی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں مولوی عبد الماجد رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر بھی ضروری

سمجھتا ہوں مولوی صاحب پارک سرکس میں ایک نائٹ اسکول کے مالک اور معلّم تھے۔ ان کا فیض بھی میرے شامل حال رہا۔ پہلے میں اس نائٹ اسکول میں طالب علم تھا۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد مولوی صاحب موصوف نے مجھے مدرّس مقرر کیا۔

تکمیل تعلیم کے بعد میں نے باقاعدہ معلّمی کا پیشہ اختیار کیا۔ ۲۳ر جنوری ۱۹۴۶ء سے ۲ر ستمبر ۱۹۴۷ء تک میں اسلامیہ ہائیر سکنڈری اسکول کلکتہ میں مدرّس رہا۔ ۳ر ستمبر ۱۹۴۷ء سے مدرسہ عالیہ کلکتہ کے بہرہ انگریزی میں معلّمی کر رہا ہوں۔

مجھے بچپن سے اُردو زبان اور ادب سے دلچسپی رہی ہے۔ بچپن ہی میں شعراء کا کلام شوق سے پڑھتا تھا۔ رفتہ رفتہ شعر خوانی کا ذوق شعر گوئی کے ذوق میں تبدیل ہو گیا۔ ۱۹۳۵ء میں جبکہ میں ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا مولانا آزاد کالج کلکتہ کا دوسرا سالانہ مشاعرہ پروفیسر عباس علی خان بیخود مرحوم کے زیر اہتمام اور علاّمہ رضا علی وحشت کلکتوی مرحوم کے زیر صدارت انعقاد پذیر ہوا۔ میں بھی ایک سامع کی حیثیت سے اس مشاعرے میں شریک ہوا اور علاّمہ وحشت کے کلام اور انداز غزل خوانی سے بیحد متاثر ہوا۔ ایک موقع پر میں نے اپنے تاثرات کا اظہار یوں کیا ہے۔

شعر اس کا سر بسر الہام ہے | یا مئے پُر کیف کا اِک جام ہے
شعر کیا پڑھتا ہے گویا دہر پر | ہو رہا ہے چرخ سے نازل اثر
ہم صفیر و ہم چمن اپنا لطیف | بلبلانِ خوشنوا کا یہ حریف

اس مشاعرے میں علامہ وحشت کا کلام خود علامہ کی زبانی سننے کے بعد میں موصوف کے کلام کا مطالعہ بڑے ذوق و شوق اور توجہ سے کرنے لگا۔ مجھ پر کلامِ وحشت کا اثر ایسا گہرا پڑا کہ میرا کلام زبان و بیان کے اعتبار سے وحشت صاحب ہی کے رنگ میں ہونے لگا۔ میرا ایک مقطع ہے۔

لطیفؔ اشعار میں کہنے لگا ہوں رنگِ وحشتؔ میں
نوا سنجوں کو ہے مرغوب اندازِ بیاں میرا

شاعری میں مجھے کسی سے تلمذ نہیں ہے۔ میں نے جو کچھ اکتسابِ فن کیا ہے (اگر کیا ہے تو) شعرا کا کلام اور نقادوں کی بالخصوص نیاز فتحپوری صاحب کی تنقیدیں پڑھ کر کیا ہے۔ مولانا آزاد کالج کلکتہ کے سوونیر ۶۸-۱۹۶۷ء میں ایک صاحب نے اپنے مضمون میں مجھے بھی وحشت صاحب کے تلامذہ میں شامل کیا ہے۔ لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ وحشت صاحب سے براہ راست میرا کوئی تعلق نہ تھا تلمذ کا دھوکہ کتاب "نساخ سے وحشت تک" کا مصنف ہونے کی وجہ سے ہوا ہے۔ میرا ایک مقطع ہے۔

لطیفؔ شعر میں کامل ہوا، مگر نہ ہوا
رہینِ منتِ اُستاد کسبِ فن کے لئے

میرے چند اشعار ہیں:۔

ذوقِ تعمیری حریفِ باغباں ہو جائیگا
پھر کسی ڈالی پہ میرا آشیاں ہو جائیگا

بتاؤں حال کیا اپنی تمناہائے پنہاں کا
مرے دل میں ہے نقشہ ایک امواجِ پریشاں کا

زمانہ جس کو کہتا ہے محبت کی بلاخیزی
وہ اظہارِ تمنا ہے دلِ طوفاں بداماں کا

مصیبت ہے لطیف اس کیلئے جس کو نہیں آتا
شبِ اُمید کو اُمیدواری میں سحر کرنا

مجالِ آسماں کیا ہے مٹادے اسکی ہستی کو
جو رہتا ہے زمانے میں حریفِ آسماں ہو کر

ہو گئی پوری اگر لطفِ تمنا پھر کہاں؟
یا خُدا نکلے نہ دل سے حسرتِ رعنائے دل

انھیں کے ہاتھوں میں پامالی وہ جس کو چاہیں نہال کر دیں
کسی کو اوپر چڑھا رہے ہیں کسی کو نیچے گرا رہے ہیں

دل کا رونا روئیے یا ان کا رونا روئیے
شومیٔ تقدیر ہے کہ باوفا کوئی نہیں

ہے بات سمجھنے کی یہاں کون ہے کس سے
میرا کہ تمھارا ہے ذہن دیکھ رہا ہوں

مہر کی طرح نہیں ان کی تجلّی ارزاں
حُسن تقدیر سے وہ برق فشاں ہوتے ہیں

خونِ محنت کی وہ چھینٹیں گنجِ مخفی بہار
فصلِ گُل آئی تو گلہائے بہاراں ہو گئیں

جاری رہے گا دہر میں فیضانِ انقلاب
غم ہے اگر تو آپ نہ پروائے غم کریں

راہ پیمائی کا جذبہ دل میں ہے مستانہ وار
کیا ہوا تاریک راتوں میں اگر مشعل نہیں

مشکلوں کے حل سے رُک جاتی ہے جب فکرِ عمل
پھر تو اچھا ہے کہ میری مشکلوں کا حل نہیں

زبانِ بے زباں سے سوزِ غم کی داستاں سُن لو
مِرے خاموش اشکوں سے مِرے دل کی فغاں سُن لو

مجھے شکوہ برائے شکوہ کرنا ہی نہیں آیا
لبِ شکوہ جو کھولے ہیں مِری مجبوریاں سُن لو

یہاں پہ کچھ ہے وہاں پہ کچھ ہے کہیں پہ کچھ اور کہیں پہ کچھ ہے
کسی کے حق میں سراب دنیا کسی کے حق میں شراب خانہ

اچھا وہی کہ جو نہ کرے شکوۂ جفا
یہ بھی نہ کہہ کہ مجھ پہ ستم ڈھا رہے ہیں وہ

بنا سکو گے نہ تا عمر آشیاں اپنا
کرو نہ تنکے اگر جمع آشیاں کے لئے

وفا کو میری سمجھتے ہو میری مجبوری
ذرا تو کر کے دکھاؤ وفا وفا کے لئے

رہینِ منتِ خونِ جگر میرا یہ گلشن ہے
چمن کا رنگ کہتا ہے کہ رنگِ گلستاں مجھ سے

فانیانِ قوم کا چرچا رہے گا حشر تک
زندگی ہمدردئ قومی سے لافانی ملی

کبھی ہنسا کبھی رویا مثالِ دیوانہ
کہا جو تیری نظر نے کیا وہی میں نے

دل کوئی بھر آیا نہ کوئی آنکھ بھر آئی
دیکھا تو نظر بھر کے مرا حال کبھی نے

بدنام کیا مجھ کو نظارہ طلبی نے
عادت کو بگاڑا ہے تری جلوہ گری نے

محفلِ دہر ہے شورش گہِ اربابِ ستم
نالۂ غم یہاں طوطی کی صدا ہوتا ہے

ظلم ہوتے ہیں مگر روکتا کوئی بھی نہیں
اب نہ کہئے کہ غریبوں کا خُدا ہوتا ہے

آپ کا طرزِ تخیّل ہے زمانے سے الگ
خود جفا کیجئے خود اہلِ وفا سے ڈرئیے

کیا نہیں بعد خزاں فصلِ بہار آتی ہے
دائمی چیز جفا ہے کہ جفا سے ڈرئیے

مرجاتی ہے وہ قوم کہ جس قوم کے افراد
دُنیا میں تگاپوئے دما دم نہیں کرتے

کرتا ہے مگر ظلم کا الزام نہیں ہے
افسونِ ادا ہے کہ وہ بدنام نہیں ہے

کلیجہ رکھتے ہیں تکلیفِ غم اُٹھانے کا
بلا سے کوئی اگر ذوقِ ناروا رکھے

سکونِ دل کی کہاں موت دل کی بات ہے یہ
کہ دل میں آدمی کوئی نہ مدعا رکھے

بنتا ہے اگر کام تو بس جوشِ جنوں سے
فرزانہ وہی ہے کہ جو فرزانہ نہیں ہے

تمھارا اندازِ بے نیازی بنا ہے وجہِ سکوت اپنی
سُنو تو کچھ التجا ہے میری نہیں تو کچھ التجا نہیں ہے

نہ مجھ کو جوشِ ستم کی پروا نہ کوئی چشمِ کرم کی خواہش
جفا بھی فانی، وفا بھی فانی، یہاں کسی کو بقا نہیں ہے

تو جا کے کہہ دے یہ واعظوں سے جبیں ہماری ہم اس کے مالک
ہم اپنے ذوق نیاز مندی کو وقف نازِ بتاں کریں گے

جفائے حُسن سے روشن وفا کا نام ہوتا ہے — وہ اپنا کام کرتے ہیں ہمارا کام ہوتا ہے
دل اپنا ہے نہ سر اپنا جنوں کا دور دورہ ہے — تمھیں جو دیکھ لے اس کا یہی انجام ہوتا ہے

لطیفؔ اہلِ نظر کو شوق سا رہتا ہے سننے کا
برنگِ شعر جو مجھ پر کبھی الہام ہوتا ہے

شعر گوئی کی طرف مائل تو میں ضرور رہا لیکن شاعر نہ بن سکا۔ بلکہ اپنے کو شعر کہنے سے عاجز ہی پایا۔ یہی وجہ تھی کہ میں رفتہ رفتہ نثر نگاری کی طرف مائل ہوتا گیا اور بالآخر میں تصنیف و تالیف کے کاموں میں منہمک رہنے لگا۔ تصنیف و تالیف کے کاموں میں مجھے وہ کامیابی حاصل ہوئی جو شاعری میں نہیں ہو سکتی تھی۔ علاوہ اس کے غزل کی شاعری کر کے ہوتا بھی کیا۔ غزل کہنا تو وہ فن ہے کہ جس کسی کو بھی ذرا خود نمائی کی ہوس ہوتی ہے وہ غزل کہنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کلکتہ میں غزل گو شاعر سینکڑوں کی تعداد میں ملیں گے مگر اچھے نثر نگار خال خال ہیں۔ اس لئے میں نے شاعری کی بجائے نثر نگاری کو اپنا فن قرار دیا اور اس فن میں مجھے کچھ دعویٰ بھی ہے۔ میں کہتا ہوں۔

ہر چند سخن گوئی کی مجھ کو جھجک ہے — شاعر مرے ہونے میں مجھے خود شک ہے
ہاں نثر نگاری میں ہے دعویٰ مجھ کو — تصنیف جو "نساخ سے وحشت تک" ہے

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ "غالب اور ان کے معترضین" کے علاوہ میری اور بھی دو کتابیں ہیں ان کتابوں میں اوّل کتاب "نساخ سے وحشت تک" ہے

اس کتاب میں ایک سلسلہ اُستادی و شاگردی کے بنگال کے چار اکابر شعرائے اُردو کا بھرپور تذکرہ اور ان کے کلام کا ایسا جامع و مانع انتخاب شامل کیا گیا ہے جو ان کے دواوین کے مطالعہ سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ اڈیٹر اور پروفیسر جناب ارشد کاکوی مرحوم اپنے ماہنامہ "ندیم" ڈھاکہ مورخہ اکتوبر ۱۹۶۰ء میں اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "نساخ، انسخ، شمس اور وحشت ان چار شاعروں کے حالات حیات، ان کے ماحول، ان کے مزاج و مذاق، ان کے فکر و فن، ان کے اساتذہ و تلامذہ کا بھرپور تذکرہ اس کتاب میں موجود ہے۔ یہ محض تذکرہ نہیں بلکہ تبصرہ بھی ہے۔ یہ تحقیق بھی ہے اور تنقید بھی۔ ہر شاعر کے منتخب کلام کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ تاریخ ادب کی کئی زنگ آلود کڑیاں صاف کی گئیں۔ کتنی باتیں منظرِ عام پر آگئیں۔ یہ کتاب خاصی محنت سے مرتب کی گئی ہے۔"

جناب ل۔ احمد، ڈاکٹر عندلیب شادانی، جناب خواجہ احمد فاروقی، جناب رشید احمد صدیقی اور پروفیسر شاہ مقبول احمد نے اس کتاب کے متعلق تحسین آمیز خیالات تحریری طور پر ظاہر کئے ہیں۔

دوسری کتاب "تجلیات شورستان فارسی" ہے۔ ہفتہ وار ندائے ملت لکھنؤ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "کتاب فارسی ادبیات کی مکمل و مسلسل تاریخ یا انتخاب نہیں، بلکہ دس فارسی شاعروں کا تذکرہ، تبصرہ اور نمونۂ کلام پر مشتمل دس تحقیقی مقالوں کا مجموعہ ہے۔ پہلا مقالہ شاہنامہ فردوسی پر ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ شاہنامہ کے زیرِ اثر ایران میں کیا کیا

انقلابات ہوئے ہیں۔ دوسرا مقالہ عمر خیام پر ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ یورپ اور امریکہ میں ان کی مقبولیت کی وجہ ان کا فلسفہ حیات ہے۔ تیسرا مقالہ خاقانی پر ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ وہ اپنے کو کن معنوں میں حسان العجم کہتے تھے۔ چوتھے مقالے میں حافظ شیرازی کی شریعت کی توضیح و تشریح ہے۔ پانچویں مقالے میں ایران میں علامہ اقبال کی مقبولیت کے دور کی تعین کی کوشش ہے۔ چھٹا مقالہ ایران کی شاعرہ پروین اعتصامی کے نذر ہے جس میں ان کے کلام پر تبصرہ اور ادبی مقام کی تعین ہے۔ ساتویں مقالے میں ملک الشعرا بہار اور ان کے کلام کا تعارف ہے۔ آخر میں بیدل، غالب اور سید محمود آزاد کے تذکرہ و تعارف کے ساتھ نمونہ کلام بھی شامل ہے۔ تمام مقالے علمی و تحقیقی ہیں اور مختصر ہونے کے علاوہ جامع ہیں۔ مصنف نے یوروپین مصنفین کی جدید تصنیفات سے استفادہ کیا ہے اور ان کے غلط فہمیوں یا غلط بیانیوں کی مدلل تردید بھی کرتے گئے ہیں۔ اس محنت و دیدہ ریزی پر مصنف بجا طور پر تحسین و آفرین کے مستحق ہیں۔ زبان بھی سادہ، شگفتہ اور دلچسپ ہے (ندائے ملت مورخہ ۲۱ ستمبر ۱۹۶۹ء)

انگریزی ہفتہ وار ریڈیانس دہلی میں جناب اے۔ اے۔ کے سوز صاحب تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "یہ کتاب ہندی و ایرانی فارسی شاعروں کا اچھا تعارف نامہ ہے۔ اس کتاب میں فارسی کے چھ ایرانی شاعروں اور چار ہندوستانی شاعروں کا تعارف کرایا گیا ہے۔ ایرانی شعرا، فردوسی، عمر خیام، حافظ، خاقانی، پروین اعتصامی اور بہار ہیں اور ہندوستانی

شعرا اقبال، غالب، بیدل اور سید محمود آزاد ہیں۔ یہ نمایاں ہے کہ مصنف
نے عملی طور پر پوری فارسی شاعری کا جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔
اگر وہ شیخ سعدی کو بھی شامل کر لیتے تو یہ پیش کش مکمل تر ہوتی۔ فردوسی پر مقالہ
فکر انگیز ہے۔ کیونکہ یہ موجودہ نصف صدی کی مخالفِ اسلام قومیت کو جس نے
ایران کو اپنے تسلط میں لے لیا ہے اور بہائی مذہب کی پیدائش کو بھی اس کتاب
میں شاہنامہ فردوسی سے منسوب کیا ہے۔ مصنف کہتے ہیں کہ فردوسی نے دو
باتوں کے زیرِ اثر شاہنامہ لکھا۔ ایک مخالف عرب ایرانی قومی جذبہ، دوسری
روپے کی حد سے بڑھی ہوئی خواہش۔ اگرچہ وہ کہتے نہیں مگر ان کے مقالے سے
یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ شاہنامہ کی مخالف اسلام قومیت کی بنا پر جس کی
وجہ سے آج کے ایرانی قوم پرستوں کے اندر مخالف عرب اور مخالف اسلام
جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔ محمود غزنوی نے فردوسی کی سرپرستی سے انکار کر دیا ہوگا۔
دوسرا مقالہ "عمر خیام یورپ میں" ہے۔ یہ یورپین زبانوں میں رباعیات
عمر خیام کے تراجم اور یورپ میں عمر خیام کی مقبولیت سے متعلق گراں قدر معلومات
سے بھرپور مقالہ ہے لیکن صفحہ ۵، میں مصنف بڑے خطرناک راستے پر چل پڑے
ہیں۔ عمر خیام کے فلسفۂ جبر و عیش سے پورا پورا اتفاق کرتے ہوئے مصنف نہ صرف
یورپ کی مروجہ نفسانی ڈھیل کو جائز قرار دیتے ہوئے نظر آتے ہیں بلکہ اس
بنا پر کہ خدا ہی نے گناہگاروں کے اندر گناہ کرنے کی صلاحیت ودیعت کی ہے۔
تمام گناہوں اور گناہگاروں کی تائید کرتے ہوئے معلوم دیتے ہیں۔ یہ پرچار
لطیف الرحمٰن جیسے صاحب علم کے شایانِ شان نہیں۔ حافظ کے سلسلے میں بھی

کم و بیش یہی باتیں کہی ہیں۔ لیکن یہاں انھوں نے مذہبی رسومات کی بجائے ان اخلاقی اقدار کی عظمت پر زور دیا جو تمام مذاہب میں مشترک ہیں۔ اقبال پر جو مقالہ ہے اس میں مصنف نے مولانا عبدالسلام ندوی اور اُنھیں جیسے دیگر لوگوں کی اس غلط فہمی کو دور کیا ہے کہ اقبال اپنی فارسی اور اسلام کی وجہ سے ایران میں مقبول عام رہے ہوں گے۔ لطیف الرحمٰن واضح کرتے ہیں کہ ایران میں اقبال کی مقبولیت استقلال پاکستان کے بعد ہوئی ہے لیکن وہ یہ ماننے سے انکار کرتے ہیں کہ اقبال صرف پاکستانی شاعر ہیں۔ بیدل اور غالب پر مضامین مختصر اور معلومات افزا ہیں۔ پروین اعتصامی اور بہار پر جو مقالات ہیں ان میں جدید ایران کی ان دو ادبی عظیم ہستیوں کے متعلق صرف قیمتی معلومات ہی فراہم نہیں کی گئی ہیں بلکہ حقیقت میں جدید ایران کی پوری سیاسی اور ادبی تاریخ کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔"

تجلّیات شعرستان فارسی میں غالب کے بارہ میں بعض باتیں غلط چھپ گئی ہیں۔ تعجب ہے کہ یہ غلطیاں کیونکر ہوئیں۔ بہرحال قارئین کرام سے گذارش ہے کہ اس کتاب سے مقابلہ کر کے تصحیح فرمالیں۔ غالب کی قاطع برہان کی تالیف سنہ ۱۸۶۰ء میں ہوئی تھی مگر کتاب سنہ ۱۸۶۲ء میں چھپی۔ "تیغ تیز" کا جواب "تیغ تیز تر" نہیں، بلکہ "شمشیر تیز تر" ہے۔ "ہنگامۂ دل آشوب" غالب کی کوئی کتاب نہیں ہے۔ "درفش کاویانی" تصحیح اور اضافہ کے ساتھ قاطع برہان کا دوسرا اڈیشن تھا۔ میں ان غلطیوں کی وجہ سے بےحد شرمندہ ہوں اور معافی کا خواستگار ہوں۔ اسی طرح سید محمود آزاد اور غالب کی کلکتہ میں ملاقات

صحیح نہیں۔ آزاد شاید اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔

میری تیسری کتاب نہیں بلکہ کتابچہ "غالب سرائی" ہے۔ اس کتاب کی توضیح کے طور پر اس کی تین رُباعیاں پیش کی جاتی ہیں۔

آتا نہیں فنکار سا گانا مجھ کو
آتا ہے مگر پیار نبھانا مجھ کو
تعریف میں جی کھول کے نظمیں لکھوں
صد سالۂ غالبؔ ہے منانا مجھ کو

اُردو کو جو غالبؔ نے عطا کی عظمت
گویا کہ ہماری ہی بڑھائی عزّت
جس بندۂ اقدس سے وقار ہے اپنا
اس بندۂ اقدس پہ خُدا کی رحمت

دعویٰ نہیں مجھ کو کہ سخنور ہوں میں
دعویٰ نہیں بُلبُل کے برابر ہوں میں
تقدیر میں غالبؔ کی ثنا خوانی تھی
دعویٰ ہے کہ غالب کا ثناگر ہوں میں

تعریفی رُباعیاں :-

شعروں میں بہاروں کا نظارہ دیکھا
غالب کے کمالوں کا تماشہ دیکھا
دریا نہیں کوزے میں سمندر پنہاں
دیوان میں ہر طرح کا جلوہ دیکھا

دیوان کا ہر شعر نرالا دیکھا
انسان کو انسان سے بالا دیکھا
اللہ رے غالبؔ کا دماغِ روشن
رنگین خیالوں کا اُجالا دیکھا

قدرت کو جو دیکھا تو خُدا کو پایا
الحاد بھی ایمان خُدا پر لایا
غالب بھی ہے قدرت کا نمونہ ایسا
غالبؔ کو جو دیکھا تو خُدا یاد آیا

غالب کا طلبگار زمانہ نکلا — انسان تو ایسا کہ فسانہ نکلا
اپنے کو وہ غالب کا چچا کہتا تھا — واللہ یگانہ تو یگانہ نکلا

آنے کا نہیں کام مرے پیمانہ — پھر ہوش نہ آئے تو چلوں میخانہ
دیوانگی آتی ہے برابر کے لئے — اے کاش جو غالب کا بنوں دیوانہ

ویسے مجھے کہتے ہیں لطیف الرحمٰن — اللہ نے بھرپور کیا ہے احسان
اُستاد ہوں، بی۔ اے، ہوں مصنف اچھا — غالب کا ثنا گر ہوں بطرزِ سحباں

ایک تعریفی غزل :-

واہ رے حُسنِ تقدیر تیرا اے ہندوستاں! — غالبِ معجز بیاں پیدا ہوا تیرے یہاں
نام روشن کر دیا تیرا جہانِ شعر میں — کس قدر انجم فشاں تھا غالبِ انجم بجاں
فارسی میں بے بدل تھا نثر میں عالی مقام — مجتمع تھیں ایک ہستی میں سبھی رعنائیاں
انجمن در انجمن کہنا اسے زیبا نہیں — دولتِ افکارِ عالی کا جہاں اندر جہاں
کاشفِ اسرارِ ہستی بن کے آیا دہر میں — رکھ دیا اس نے اُٹھا کر پردۂ رازِ نہاں
ہمسرِ الہام اس کا ہر خیالِ پُر بہار — ہر زمینِ شعر اس کی آسماں کا آسماں
فلسفہ گوئی سے اپنی پی گیا آبِ حیات — بات ایسی کہہ گیا کہ ہو گیا وہ جاوداں
ابرِ دریا بار تھا اس کا فلک پیما دماغ — طبع جب رکتی تھی اس کی اور ہوتی تھی رواں
"جلوۂ گل" کہہ کے بخشا جلوۂ گل شعر کو — جس جگہ ہے شعرِ غالب اس جگہ باغِ جناں
صاحبِ عرفان تھا اپنا ولیٔ بادہ خوار — باوجودِ میکشی توحید کا تھا نکتہ داں

عمر بھر دیتا رہا درسِ نیازِ عاشقی
عمر بھر کرتا رہا تعریفِ نازِ دلستاں

طاقتِ پرواز کی بھی داد دینی چاہیے
آسماں کے اس طرف پہنچا تخیّل کا دھواں

محفلِ دنیا میں شاعر اور بھی ہیں نغز گو
سب پہ بھاری ہے مگر غالب کا اندازِ بیاں

نو بنو افکار سے دیوان مالا مال ہے
قوتِ ایجاد اس کی صد بہارِ گلفشاں

بلبلانِ خوش نوائے بوستانِ شاعری
غالبِ شیوا بیاں کے سامنے ہیں بے زباں

پوچھتے کیا ہو زمیں والوں سے اس کا مرتبہ
رتبہ دانوں میں ہیں اس کے چاند تارے کہکشاں

زندگی میں جو اثر تھا آج بھی ہے وہ اثر
تذکرہ غالب کا آیا جھوم اٹھا سارا جہاں

سیم و زر کے رکھ دیے ہیں چند صفحوں میں پہاڑ
مختصر دیوان اس کا وزن میں سب سے گراں

سو برس سے بلبلِ دلی نوا زن عدن میں
بن گئی ہے ایک دلی کی طرح دلی وہاں

کام ایسا کر گیا غالب جہانِ شعر میں
تذکرہ ہوتا ہے اس کا داستاں در داستاں

مر گیا غالب شکن غالب مگر زندہ لطیف
پوچھتا کوئی نہیں دنیا میں چنگیزی کہاں

"غالب سرائی" لکھنے کا مقصد غالب کی تعریف ہی تعریف کرنا تھا لیکن "غالب اور ان کے معترضین" بالکل جداگانہ نوعیت کی کتاب ہے۔ اس لیے اس کتاب میں اکثر مقامات پر نقد و محاکمہ سے کام لینا پڑا ہے جس کے لیے میں غالب رحمۃ اللہ علیہ کی روح سے معافی مانگتا ہوں۔

سید لطیف الرحمٰن

امروز من نظامی و خاقانیم بدہر
دہلی ز من بہ گنجہ و شرواں برابرست

غالب

غالب کی فارسی شاعری

اُردو زبان کے ایک عظیم المرتبت بلکہ نادر الوجود شاعر کی حیثیت سے مرزا اسد اللہ خاں غالب تمام دُنیا میں روشناس ہیں اور فارسی زبان کے شاعر کی حیثیت سے قریب قریب گمنام ہو چکے ہیں۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ غالب فارسی زبان کے بھی ایک عظیم المرتبت شاعر ہیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ غالب کو اپنی اُردو شاعری کے مقابلے میں اپنی فارسی شاعری پر بہت گھمنڈ تھا۔ اسی گھمنڈ کے تحت انھوں نے کتنوں سے لڑائیاں مول لیں۔ وہ صرف یہ کہنے پر اکتفا نہیں کرتے کہ ان کا فارسی دیوان نقشہائے رنگا رنگ کا مجموعہ ہے بلکہ علی الاعلان دعویٰ کرتے ہیں کہ میرا فارسی دیوان آسمانی کتاب کا درجہ رکھتا ہے۔ کہتے ہیں

گر ذوق سخن بدہر آئیں بودے — دیوان مرا شہرتِ پرویں بودے
غالبؔ اگر ایں فن سخن دیں بودے — آں دیں را ایزدی کتاب ایں بودے

غالب نے اپنے فارسی شعروں کا مجموعہ اپنے ہی زیر اہتمام ۱۲۷۹ھ میں شائع کیا۔ عام دستور کے برخلاف تقریظ انھوں نے خود ہی لکھی۔ اس کی وجہ آسانی سے سمجھ میں آتی ہے۔ غالب کے خیال کے مطابق ان کے فارسی کلام کی معنوی بلندی اور نزاکت فکر کے علاوہ ان کی زبان و بیان کی فصاحت و ایرانیت کو سوائے ان کے کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ اس تقریظ میں

غالب اپنی فارسی شاعری کے متعلق فرماتے ہیں کہ "ہر یک (شعر) از روے شوخی و تاثیر خوبیٔ تقریر پیرایۂ گلوے بسمل و آویزۂ تواند" قصیدہ گوئی میں اپنے کو خاقانی اور مثنوی نگاری میں اپنے کو نظامی کا ہم پلہ تصور کرتے ہیں۔

امروز من نظامی و خاقانیم بدہر
دہلی ز من بہ گنجہ و شرواں برابرست

غزل میں نظیری اور علی حزیں کے ساتھ برابری کا دعویٰ کرتے ہیں

ز فیض نطق خویشم با نظیری ہم زباں غالب
چراغے را کہ دودے ہست در سر زود در گیرد

تو بدیں شیوۂ گفتار کہ داری غالب
گر ترقی نہ کنم شیخ علی را مانم

اپنے کو عرفی کا بدل سمجھتے ہیں۔

چوں نناز د سخن از مرحمت دہر بخویش
کہ برد عرفی و غالب بعوض باز دہد

مسیح شوکت عرفی کہ بود شیرازی مشو اسیر زلالی کہ بود خوانساری
بہ سومنات خیالم در آی تا بینی رواں فروز برد دوشہاے زناری

ناظم ہروی کی چند بیتیں مشہور ہیں جن میں عنصری سے لے کر جامی تک ہر زمانے میں جو شاعر سر برآوردہ ہوا ہے اس کا نام لیا گیا ہے وہ بیتیں ملاحظہ ہوں۔

شنیدم کہ در دور گاہ کہن شدہ عنصری شاہ صاحب سخن

چو اورنگ از عنصری شُد تہی — بہ فردوسی آمد کلاہ مہی
چو فردوسی آورد سر در کفن — بہ خاقانی آمد بساطِ سخن
چو خاقانی از دار فانی گذشت — نظامی بہ ملکِ سخن شاہ گشت
نظامی چو جامِ اجل در کشید — سر چترِ دانش بہ سعدی رسید
چو اورنگ سعدی فرو شد زکار — سخن گشت بر فرقِ خسرو نثار
ز خسرو چو نوبت بہ جامی رسید — ز جامی سخن را تمامی رسید

ناظم ہروی کے بعد کے ادوار میں جو شعرا اقلیم سخن کے تاجدار ہوئے غالب نے ایک بیت میں ان کے نام گنائے ہیں اور اس بیت کو ناظم کی مثنوی کے آخیر میں اضافہ کر دیا ہے۔ بیت ہے۔

ز جامی بہ عرفی و طالب رسید — ز عرفی و طالب بہ غالب رسید

اس بیت میں غالب نے گویا ظاہر کیا کہ غالب فارسی کے خاتم الشعرا ہیں۔ غالب اپنے کو شاعری سے بہت بلند سمجھتے تھے۔ ان کے دعویٰ کے مطابق ان کو شاعری کی ضرورت نہ تھی لیکن شاعری کو ضرورت تھی کہ ان کا فن بن کر آبرو حاصل کرے۔

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالبؔ
شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما

جہاں تک فارسی شاعری کا تعلق ہے غالب تو اپنے کو کیا کچھ نہ سمجھتے تھے لیکن ہند و پاکستان کے ارباب نقد و نظر غالب کو نہ صرف اساتذۂ ایران کی صف میں شمار کرتے ہیں بلکہ اگر مگر کر کے غالب کے بعض شعروں کو

ایرانی اساتذہ کے شعروں پر اس طرح ترجیح دیتے ہیں کہ دونوں برابر رہتے ہیں۔ یہاں چند ارباب علم و نظر کی رائیں پیش کی جاتی ہیں۔

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ ہمیشہ غالب کو ظہوری اور عُرفی کا ہم پلہ اور صائب و کلیم سے برتر سمجھتے تھے۔ نواب ضیاء الدین منیر کا قول تھا کہ ہندوستان میں فارسی شعر کی ابتدا ایک ترک لاچین (یعنی امیر خسرو) سے ہوئی اور ایک ترک ایبک (یعنی غالب) پر اس کا خاتمہ ہوا۔ سید غلام علی وحشت غالب کے بارہ میں کہا کرتے تھے کہ اگر یہ شخص عربی شاعری کی طرف متوجہ ہوتا تو عربی شعر میں متنبی یا ابو تمام ہوتا اور اگر انگریزی کی تکمیل کرتا تو انگلستان کے مشہور شاعروں کا مقابلہ کرتا (یادگار غالب)

مولانا الطاف حسین حالی یادگار غالب میں فرماتے ہیں کہ "مرزا کو فارسی زبان میں ہر قسم کے مضامین بیان کرنے میں ایسی قدرت حاصل تھی جیسی ایران کے بڑے بڑے خلاق و ماہر مسلم الثبوت اُستاد کو ہونی چاہئے۔ مرزا کا قصیدہ انوری و خاقانی کے قصیدے سے ٹکر کھاتا ہے اور مرزا کی غزل عرفی و طالب کی غزل پر سبقت لے جاتی ہے اور ان کی رُباعی عمر خیّام کی آواز میں آواز ملاتی ہے اور ان کی نثر کے آگے ابوالفضل کی نثر پھیکی اور بے اثر معلوم ہوتی ہے"

نظیری کے متعلق مرزا جلال اسیر کہتے ہیں۔

ہمچشمیٔ نظیری حد بشر نباشد

اور صائب کہتے ہیں۔

صائب چہ مجال است شوی ہمچو نظیری   عرفی بہ نظیری نہ رسانید سخن را

غالب نے صائب اور جلال اسیر کے خیالات سے اتفاق کیا ہے لیکن مولانا حالی غالب کے مقابلے میں نظیری کی برتری اور عظمت تسلیم کرتے ہوئے بھی دونوں کا موازنہ یوں کرتے ہیں۔

نظیری

نظر بہ ظاہر و صیاد در خفا خفتست
اجل رسیدہ چہ داند بلا کجا خفتست

غالب

بوادئ کہ دراں خضر را عصا خفتست
بہ سینہ می سپرم راہ گرچہ پا خفتست

حالی۔ نظیری کا بیان جیسا کہ ظاہر ہے بہت صاف اور نیچرل ہے اور گو یہ مطلع اس کے اعلیٰ درجے کے اشعار میں محسوب نہیں ہو سکتا لیکن مرزا کے مطلع سے بہر حال بہتر ہے۔

نظیری

کجا ز عشوۂ آں چشم نیم باز رہیم
کہ فتنہ خاستہ از خواب و پائے ما خفتست

غالب

دگر ز ایمنئ راہ و قرب کعبہ چہ حظ
مرا کہ ناقہ ز رفتار ماند و پا خفتست

حالی۔ ان دونوں شعروں میں سے ایک کو دوسرے پر مطلقاً ترجیح نہیں دی جا سکتی جو عاشقانہ مضامین پسند کرتے ہیں وہ ضرور نظیری کے شعر کو پسند کریں گے۔ مگر اس لحاظ سے کہ مرزا کا بیان عاشق اور غیر عاشق سب کے حالات پر حاوی ہے اور ہر شخص جس پر ایسی حالت گذرے اس کا مصداق ہو سکتا ہے یقیناً نظیری کے شعر پر فوقیت رکھتا ہے۔

نظیری

گہے بقلب شبم ترکتاز می آرد
کہ بر خراش قصب پائے در حنا خفتست

غالب

غمت بشہر شبی خوں زناں بہ بنگہ خلق
عسس بخانہ و شہ در حرم سرا خفتست

حالی۔ یہ سچ ہے کہ مرزا کے دل میں یہ خیال نظیری کے شعر سے پیدا ہوتا ہے مگر مرزا کی غیر معمولی اپچ اور بلند پردازی کے ثبوت کے لئے صرف یہی اقتباس کافی ہے کہ تھوڑے سے تصرف سے نظیری کے مضمون کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ نیز مرزا کے بیان میں حقیقت و مجاز دونوں پہلو موجود ہیں اور نظیری کا بیان مجازی معنی میں محدود ہے۔

نظیری	غالب
شمیم مہر ز باغ وفا نمی آید بہر چمن کہ تو بشگفتۂ صبا خفتست	ببیں ز دور و مجو قرب شہ کہ منظر را دریچہ باز و بدروازہ اژدہا خفتست

حالی۔ مآل دونوں کا یہ ہے کہ معرفت ذات محالات سے ہے۔ ہمارے نزدیک مرزا کا بیان نظیری کے بیان سے زیادہ بلیغ اور زیادہ دلکش واقع ہوا ہے۔

نظیری	غالب
طبیب عشق ببردہ طمع ز بیمارے کہ شب براحت ازیں درد بے دوا خفتست	بصبح حشر چنیں خستہ روسیہ خیزد کہ در شکایت درد و غم دوا خفتست

حالی۔ شعرائے متصوفین کے اصول کے موافق نظیری کے بیان میں یہ خلل تھا کہ وہ راحت کو ردی علامت بتاتا ہے۔ نظیری کے بیان سے گویا یہ لازم آتا ہے کہ عاشق صادق وہی ہے جو ہمیشہ بے چینی و بے قراری میں بسر کرے اور جب ایسا ہوگا تو کبھی شکایت بھی اس کی زبان سے نکلے گی۔ مرزا نے اسی لئے اس مضمون کو الٹ دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ بیمار حشر کے دن روسیاہ

اُٹھے جو درد دل کی شکایت اور دوا کی تلاش کرتا ہوا سویا ہے۔

نظیری	غالب
کس از معانقۂ روز وصل باید ذوق	درازیٔ شبِ بیداریٔ من این ہمہ نیست
کہ چند شب زہم آغوش خود جدا خفتست	زبخت من خبر آرید تا کجا خفتست

حالی۔ نظیری کا شعر زیادہ نیچرل اور حالی ہے اور مرزا کے شعر میں شاعرانہ لطافت اور خوبی نظیری کے شعر سے زیادہ ہے اور کوئی بات اس میں ان نیچرل بھی نہیں ہے۔

نظیری	غالب
شب اُمید بہ از روز عید می گذرد	بدیں نیاز کہ با تست نازمی رسدم
کہ آشنا بہ تمنائے آشنا خفتست	گدا بہ سایۂ دیوار پادشا خفتست

حالی۔ نظیری کا یہ شعر اس کی تمام غزل میں بیت الغزل ہے بلکہ اس کے دیوان کے ان بہتر نشتروں میں سے ایک نشتر ہے جو اساتذہ نے اس کی غزلیات میں سے انتخاب کئے ہیں۔ مرزا کا شعر گو نظیری کے شعر کی برابری نہیں کر سکتا مگر ایسے بلند شعر پر یہ شعر نکالنا مرزا ہی کا کام تھا۔ تشبیہ نہایت بلیغ اور دلنشیں واقع ہوئی ہے۔ یعنی مجھ جیسے ادنیٰ درجے کے آدمی کو تیری جناب میں جو نیاز حاصل ہے۔ اس سے مجھ کو ایسا ہی ناز ہے جیسا اس فقیر کو ہونا چاہیئے جو بادشاہی محل کی دیوار کے سائے میں پڑا ہو۔

نظیری	غالب
فسانہ صرف نظیری مکن کہ خواب کند	بخواب چوں خودم آسودہ دل براں غالب
شکستہ کہ بصد درد مبتلا خفتست	کہ خستہ غرق بخوں خفتہ است تا خفتست

حالی۔ نظیری کے شعر کا مطلب یہ ہے کہ نظیری کو فسانہ اس غرض سے سنانا فضول ہے کہ ایک شکستہ و کوفتہ آدمی (یعنی نظیری) جو طرح طرح کی تکلیف میں مبتلا ہو کر پڑ رہا ہے وہ سو رہے گا۔ مرزا کے شعر کا ماحصل یہ ہے کہ اگر میں سو بھی جاؤں تو اے غالب مجھ کو اپنی طرح آسودہ اور خوشحال نہ سمجھنا۔ کیونکہ بیمار یعنی میں جب سویا ہوں تو خون میں ڈوبا ہوا سویا ہوں۔ پس ایسے شخص کو جاگتے سوتے کیا راحت نصیب ہو سکتی ہے۔

نظیری اور غالب کے آٹھ آٹھ شعروں میں مولانا حالی نے غالب کے چار شعروں کو اور نظیری کے دو شعروں کو ترجیح دی ہے۔ باقی دو شعروں کا کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ اس طرح غالب کو غالب اور نظیری کو مغلوب کر چکنے کے بعد حالی صاحب کو سخن فہم اصحاب رائے کی گرفت کا خوف ہوا۔ اس لئے وہ آخر میں فرماتے ہیں کہ "ہماری غرض مذکورہ بالا غزلوں کے مقابلہ کرنے سے صرف اس قدر تھی کہ مرزا نے غزل میں نظیری کے تتبع کو جس درجے تک پہنچایا تھا اس سے لوگ اچھی طرح مطلع ہو جائیں۔ ورنہ اس غزل کے سوا اور جس قدر غزلیں مرزا نے نظیری کی غزل پر لکھی ہیں۔ ان میں شاید ہی کوئی غزل ایسی ہو گی جس میں نظیری کی غزل کا پلہ مرزا کی غزل سے بھاری نہ ہو۔"

(یادگار غالب)

غالب ظہوری کی اُستادی اور فکری گہرائیوں کو صمیم قلب سے تسلیم کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ "یہ لطافت معنوی کا حق اس بزرگ کے حصے میں آئی ہے۔ میں جانتا ہوں شرری اور عطار دنے مل کر ایک صورت پکڑی تھی اسم نورالدین اور تخلص ظہوری

تھا۔ غالب معنی کی جان ظہوری، ناطقہ کی سرفرازی کا نشان ظہوری۔ زیادہ کیا لکھوں (عود ہندی) لیکن مولانا حالی ظہوری اور غالب کی غزلوں کا موازنہ اس ڈھنگ سے کرتے ہیں کہ مدعی سست اور گواہ چست معلوم ہوتے ہیں۔

غالب	ظہوری
چو صبح من ز سیاہی بشام مانندست	بعشق قابل دیوانگی خردمنداست
چگویم زشب چند رفت یا چندست	برز جملہ کہ آزاد مرد ایں بندست

حالی۔ ظہوری کے شعر میں اس کے سوا کچھ جدت نہیں کہ اس نے اپنی عادت کے موافق اس میں بھی صنعت تضاد کا التزام کیا۔ یعنی دیوانگی پر خردمندی کا اطلاق کیا اور آزاد پر مقید کا۔ مرزا نے ایک معمولی خیال میں جدت پیدا کی ہے اور نہایت خوبی سے مطلب ادا کیا ہے۔

غالب	ظہوری
نگاہ مہر بدل سر نہادہ چشمۂ نوش	بشکر دیدۂ تر ترزبانیٔ دارم
ہنوز عیش باندازۂ شکر خنداست	کہ زہر گریہ طراوت دہ شکر خنداست

حالی۔ ظہوری کے یہاں وہی لفظی مناسبتیں جیسے دیدۂ تر اور ترزبانی یا زہر گریہ اور شکر خند بہ نسبت مرزا کے زیادہ ہیں۔ مگر مرزا کا شعر اس سے زیادہ بلیغ، نیچرل اور عاشقانہ ہے۔

غالب	ظہوری
بہ گفتہ کہ بہ تلخی بسا زپند پذیر	مگر کہ رخصتِ بیطاقتی شود مرہم
بروکہ بادۂ ما تلخ تر ازیں پند است	کہ گوش دل شدگاں ریش گشتۂ پند است

حالی۔ یہ قافیہ بھی جیسا کہ ظاہر ہے کہ مرزا کے یہاں بہ نسبت ظہوری کے زیادہ گرم بندھا ہے۔

ظہوری	غالب
چہ غم کہ عہد گسل دارد کشاکش را	دراز دستیٔ من چاک ارفگند چہ باک
کہ ہر گسستنی صد ہزار پیوندست	زبیش دلق و ورع باہزار پیوندست

حالی۔ باوجودیکہ ظہوری کے یہاں یہ قافیہ نہایت عمدگی سے بندھا تھا مرزا نے بھی اس قافئے کے باندھنے میں کچھ کم داد بلاغت نہیں دی۔ یہاں تک کہ ظہور کے شعر کو مشکل سے اس پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔

ظہوری	غالب
بگو حدیث وفا از تو باور ست بگو	زبیم آنکہ مبادا بمیرم از شادی
شوم فدائے دروغ کہ راست مانندست	نہ گوید از چہ بمرگ من آرزومندست

حالی۔ ظہور کا شعر بہت صاف اور لطیف اور مرزا کے شعر سے زیادہ نیچرل ہے۔ مرزا نے مضمون میں جدت تو پیدا کی ہے مگر یہ سن کر کہ معشوق ہمارے مرنے کا آرزومند ہے خوشی سے مرجانا واقعے کے خلاف ہے۔

ظہوری	غالب
زاہل مہر و محبت نشاں ندارم کس	وجود او ہمہ حسن است و ستیم ہمہ عشق
بمہر خویش و بہ بے مہری تو سوگندست	بہ بخت دشمن و اقبال دوست سوگندست

حالی۔ ظہوری کا شعر صاف ہے۔ اوّل دعویٰ کرتا ہے کہ مہر و محبت کا دنیا میں کہیں وجود نہیں اور اس دعوے پر اپنی محبت اور معشوق کی بے مہری کی قسم

کھاتا ہے جس کی خوبی اور لطافت ظاہر ہے۔ مرزا کا دعویٰ یہ ہے کہ معشوق کا وجود سراپا حُسن و جمال ہے اور میری ہستی سراسر عشق و محبت ہے اور اس دعوئے پر رقیب کے نصیب کی اور معشوق کے اقبال کی قسم کھاتا ہے جس میں ظہوری کی قسم سے زیادہ لطافت اور نزاکت پائی جاتی ہے رقیب کی قسم اس لئے کھائی جاتی ہے کہ جو وجود سراپا حُسن و جمال ہے وہ بالکل اسی کے حصے میں آگیا اور معشوق کے اقبال کی قسم اس لئے کھائی جاتی ہے کہ مجھ جیسا شخص اس کے سودائے عشق و محبت میں مبتلا بن گیا ہے اس کے سوا لفظی مناسبتیں جیسے حُسن و عشق، وجود و ہستی، دشمن و دوست اور بخت و اقبال یا تمام شعر کا متناسب اجزا میں تقسیم ہونا اس نے شعر کو بہت بلند کر دیا ہے۔

غالب	ظہوری
شمارِ کجروی دوست در نظر دارم	ز رہروان تو منزل شمار را کہ شمرد
دریں نوردِ ندانم کہ آسماں چند است	غم از کسی کہ ندارد اندہش چند است

حالی۔ مرزا کا بیان کسی قدر ظہوری کے بیان سے صاف ہے۔ مگر مضمون کے لحاظ سے دونوں شعروں میں کوئی لطافت یا خوبی معلوم نہیں ہوتی۔

غالب	ظہوری
بہ رنج از پئے راحت نگاہ داشتہ اند	شود گشتہ بایام گرچہ زنجیر است
ز حکمت ست کہ پائے شکستہ در بند ست	اسیر آنکہ بہ تارِ نگاہ در بند است

حالی۔ ظہوری کے شعر میں کسی قدر جدت ہے مگر شعر کی بندش سُست اور

ڈھیلی ہے۔ مرزا کے یہاں مضمون میں کچھ ایسی جدت نہیں مگر بیان نہایت
چُست اور ٹھیک ٹھاک ہے۔

ظہوری	غالب
ز بندگان نسزد آرزو خُدا نہ کند	اگر نہ بہر من، از بہر خود عزیزم دار
ہمیں بس است کہ ما بندہ او خداوند ست	کہ بندہ، خوبی او، خوبیٔ خداوند ست

حالی۔ ظہوری کے شعر میں "خُدا نکند" یا تو حشو ہے اور اس کے بعد
کچھ عبارت مقدر ہے یعنی "خدا نکند کہ ما آرزو بکنیم"۔ باقی شعر کے معنی ظاہر
ہیں۔ مرزا کا شعر ان کی غزل میں بیت الغزل ہے اور معناً ولفظاً دونوں طرح
ظہوری کے شعر پر ترجیح رکھتا ہے۔

ظہوری	غالب
اسیر عشق ظہوری نشانہ دارد	نہ آں بود کہ وفا خواہد از جہاں غالب
نشانہ اینکہ بہ بیداد دوست خرسند ست	بدیں کہ بُرسد و گوئید ہست خرسند ست

حالی۔ دونوں مقطع ہموار ہیں۔ مگر باوجود اس کے مرزا کا بیان بانکپن
سے خالی نہیں۔

سوائے ایک شعر کے حالی نے غالب کے سب شعروں کو ترجیح دی ہے۔

نیاز فتحپوری کی رائے

تیسری صدی سے لے کر گیارہویں صدی کے وسط تک تقریباً
ایک ہزار سال کی مدّت میں ایران نے جتنے قابل ذکر شاعر پیدا کئے وہ ہیں
رودکی، فردوسی، نظامی، انوری، سعدی، حافظ، کمال اسماعیل، صائب،

عرفی، نظیری، طالب آملی اور ابوطالب کلیم۔ ایک ہزار سال کے اندر قابل ذکر ایرانی شاعروں کی تعداد پندرہ سے آگے نہ بڑھ سکی۔ ہندوستان میں فارسی شاعری کا عام ذوق مغلیہ عہد سے فروع ہوا اور اس کے ساتھ ختم ہوگیا جو تقریباً دو سو سال کا عرصہ ہے۔ اس لئے اگر ہم ایران کے مقابلے میں ہندوستان کی طرف سے چار پانچ صدی کے اندر پانچ شاعروں کا نام بھی پیش کرسکیں تو یہ کوئی معمولی بات نہ ہوگی۔ آپ کو یہ سن کر حیرت نہ کرنا چاہئے کہ ہندوستان کے انھیں پانچ مشہور شاعروں میں ایک غالب بھی تھا۔ ہندوستان کا سب سے پہلا فارسی شاعر جس کا جواب جامعیت کے لحاظ سے ایران کی سرزمین بھی پیش نہیں کرسکتی خسرو تھا۔ ان کی شاعری و زباندانی کا یہ مرتبہ تھا کہ عرفی، حافظ اور جامی کو بھی اعتراف کرنا پڑا اور اگر ہم ان علوم و فنون کو سامنے رکھیں جن کے وہ ماہر تھے تو ایران کے تمام شعرا مل کر بھی خسرو کے پلہ کو ہلکا نہیں کرسکتے۔ دوسرا ہندی نژاد شاعر جس نے ایرانی شاعروں سے اپنا لوہا منوالیا فیضی تھا۔ یہ بھی اپنی جامعیت کے لحاظ سے دربار اکبری کے تمام شاعروں پر بھاری تھا اور ایک غزل کو چھوڑ کر اس میں تو بے شک وہ عرفی و نظیری کے برابر نہیں پہنچتا ورنہ اور تمام اصناف سخن میں اُستادانہ حیثیت کا مالک تھا۔ تیسرا شاعر جس کی شاعری معنوی حیثیت سے اپنا جواب نہیں رکھتی۔ مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی تھا۔ یقیناً بیدل کی شاعری ایرانی محاورات کی شاعری نہیں۔ لیکن جو زبان اس نے پیدا کی اس کی مثال نہیں ملتی۔ بیدل ہی کے ساتھ ہم کو میرزا مظہر جان جاناں کا نام

بھی لینا چاہیے جن کی غزل گوئی میں سعدی و مابعد سعدی دونوں زمانوں کا رنگ سمویا ہوا ہے۔ اس کے بعد ہندوستان کا صرف ایک شاعر رہ جاتا ہے جسے ہم ایران کے مقابلے میں پیش کر سکتے ہیں اور وہ ہے غالب جسے اس کی زباندانی اور معمولاتِ شعری کے لحاظ سے ان ایرانی شعرا کی صف میں جگہ دینی چاہیے جو اکبر اور جہانگیر کے دربار سے وابستہ تھے اور جن کی شاعری آج بھی متاعِ گراں ارز سمجھی جاتی ہے۔ (غالب نمبر نگار)

نیاز فتحپوری صاحب غالب اور نظیری کا موازنہ یوں کرتے ہیں۔

غالب	نظیری
نگاہ مہر بدل بر نداده چشمۂ نوش	درازدستی حسنے کہ گل بچشم ریخت
ہنوز عیش باندازه شکر خند ست	کہ تا بدامنم از جیب در شکر خند ست

نیاز۔ نظیری کہتا ہے کہ کسی حسن کی درازدستی نے میری نگاہ کے سامنے پھول دکھلائے ہیں کہ جیب سے لے کر دامن تک شکر خند نظر آتا ہے۔ شکر خند تبسم کو کہتے ہیں۔ اس لئے نظیری کے دوسرے مصرعہ میں پہلے مصرعہ کے لحاظ سے بیان میں تنزل پیدا ہوگیا ہے جو معنوی نقص سے خالی نہیں۔ برخلاف اس کے کہ غالب نے شکر خند کے اصلی مفہوم سے شعر کو باہر جانے نہیں دیا۔ وہ کہتا ہے کہ باوجود محبوب کے التفات کے کبھی پوری مسرت مجھے حاصل نہیں اور اس وقت میرا عیش تبسم کی حد سے آگے نہیں بڑھا۔ ایک اور شعر

غالب	نظیری
نہ آں بود کہ دنا خواہد از جہاں غالب	بہ حرفِ اہلِ غرض قرب بعد ما بند ست
بدیں کہ پر سد و گوئیم "ہست" خرسند ست	بایں قدر کہ بگوئی "بمیر" خرسند ست

نیاز ۔غالب کا شعر مفہوم کے لحاظ سے بہت بلند ہے۔غالب نے جس خوبی کے ساتھ اپنی وفا کی طرف کنایہ کیا ہے اس کی داد نہیں دی جاسکتی۔آرزو مند کے قافیہ میں خانخاناں نے قیامت کا شعر کہہ دیا تھا۔

شمار شوق ندانستہ ام کہ تا چند است مجز ایں قدر کہ دلم سخت آرزو مند ست

اور اسی لئے نظیری کو یہ قافیہ لینے کی ہمت نہ ہوئی۔غالب نے البتہ اس قافیہ میں ایک شعر لکھا ہے اور بالکل نئے زاویہ سے

زبیم آنکہ مبادا بمیرم از شادی نگوید ار چہ بمرگ من آرزو مند ست

محبوب میری موت تو چاہتا ہے لیکن اس کا اظہار اس لئے نہیں کرتا کہ کہیں مجھے شادی مرگ نہ ہو جائے اور فرطِ مسرت سے میری موت بھی اسے منظور نہیں

ل ۔اس شعر کی جتنی بھی تعریف کی جائے لیکن اس شعر کا مضمون نظیری کے اس شعر کو دیکھ کر پیدا کیا گیا ہے۔

نظیری از تو بجاں کندن است لب بکشائے
بایں قدر کہ بگوئی "بمیر خرسند ست"

مولانا فضل حق خیر آبادی کی رائے

مولانا فضل حق خیر آبادی غالب کے معاصر اور بڑے جید عالم اور متشرع بزرگ تھے۔غالب سے ان کے تعلقات بھی تھے۔غالب ان کے علم دین اور دیندارانہ شخصیت سے متاثر تھے اور ان کا احترام کرتے تھے۔موصوف غالب کی سخن سنجی اور نکتہ دانی کے اس حد تک معتقد تھے کہ ان کے خیال کے موافق غالب

جس شعر کے جو معنی بتائیں وہی صحیح ہوں گے۔ ایک دفعہ مولانا کے ایک شاگرد ناصر علی سرہندی کا ایک شعر لے کر غالب کے پاس گئے اور اس شعر کا مطلب پوچھا۔ غالب نے اس کا مطلب بیان کیا۔ اب وہ اپنے اُستاد مولانا فضل حق کے پاس آئے اور کہا کہ آپ تو غالب کی سخن فہمی کی بڑی تعریف کرتے ہیں لیکن انھوں نے تو اس شعر کا مطلب بالکل غلط بتایا۔ یہ کہہ کر شاگرد نے وہ مطلب بیان کیا جو غالب نے بتایا تھا۔ مولانا نے سُن کر کہا کہ آخر اس مطلب میں خرابی کیا ہے؟ شاگرد نے کہا کہ خرابی ہو یا نہ ہو مگر ناصر علی کا مطلب تو یہ نہیں ہے۔ اس پر مولانا نے فرمایا کہ یہ ناصر علی کی غلطی ہے کہ اس نے وہ مطلب نہیں رکھا جو غالب نے بیان کیا (یادگارِ غالب)

شبلی نعمانی کی رائے

مرزا غالب کی طبیعت میں نہایت شدّت سے اجتہاد اور جدّت کا مادّہ تھا۔ اس لئے اگرچہ قدما کی پیروی کی وجہ سے نہایت احتیاط کرتے ہیں تاہم اپنا خاص انداز بھی نہیں چھوڑتے۔ عجیب بات ہے کہ ایران کے انقلاب کی اگرچہ ہندوستانیوں کو خبر نہ تھی لیکن خود بخود یہاں بھی انقلاب ہوا۔ یعنی شاعری کا مذاق جو ناصر علی وغیرہ کی بدولت سینکڑوں برس سے بگڑا چلا آتا تھا درست ہو چلا۔ مرزا غالب نے شاعری کا انداز بالکل دیا۔ ابتدا میں وہ بھی بیدل کی بے راہ روی کی وجہ سے غلط راستے پر پڑ گئے تھے لیکن عرفی، طالب آملی، نظیری، کلیم کی پیروی نے ان کو سنبھالا۔ چنانچہ دیوانِ

فارسی کے خاتمہ پر اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے (شعر العجم)

مذکورہ بالا اقتباسات سے واضح ہے کہ ہند و پاکستان کے ارباب فکر و نظر اور مشاہیر اہل علم و کمال غالب کی فارسی شاعری کے متعلق کیا خیالات رکھتے ہیں۔ لیکن افسوس مجھے غالب کے متعلق ایران کے اہل علم و قلم اور ناقدین کی رائیں نہ مل سکیں۔ البتہ ایران کے مشہور صاحب علم و قلم علی اکبر دہخدا نے اپنے مرتبہ لغات نامہ میں غالب کا بھی ذکر کیا ہے۔ انھوں نے غالب کے اُردو کلام کی تو بہت تعریف کی ہے (اور ظاہر ہے کہ اُردو زبان بہت کم ہی سمجھ کر تعریف کی ہے) اور غالب کو اُردو کا بہت بڑا شاعر لکھا ہے لیکن فارسی کے سلسلے میں اس سے زیادہ ایک لفظ نہیں لکھا کہ "شاعر و محقق بزرگ بہ زبان فارسی"۔

مولانا حالی، مولانا فضل حق خیرآبادی اور مولانا شبلی نعمانی نے بالکل اندھے معتقد کی طرح غالب کے گُن گائے ہیں۔ علّامہ نیاز فتحپوری نے بھی غالب کو بہت بلند مقام دیا ہے۔ لیکن وہ شبلی کے برخلاف غالب کو بیدل سے بہت فروتر شاعر سمجھتے ہیں۔ نیاز صاحب فرماتے ہیں کہ "اکثر تذکرہ نویسوں نے جن میں مولانا شبلی مرحوم بھی شامل ہیں بیدل کے سمجھنے میں سخت غلطی کی ہے اور اس لئے اس کے کلام پر صحیح تنقید نہ کرسکے اس پر سب سے بڑا الزام یہ رکھا گیا ہے کہ اس کے کلام میں فارسیت نہ تھی اور دورازکار استعارات و تشبیہات نے اس کے کلام کو اغلاق کی حد تک پہنچا دیا تھا۔ پہلا الزام (اگر واقعی بیدل کے لئے کوئی الزام ہوسکتا ہے) یقیناً ایک حد تک صحیح ہے۔ کیونکہ محض لطف زبان نہ اس کا مقصود تھا اور نہ زبان کی پابندی کے ساتھ وہ اپنے خیالات کو

ظاہر کرنا چاہتا تھا اور جب زبان کی تمام معمولی اور متداول ترکیبیں ناکافی
ثابت ہوئی تھیں تو بالکل الہامی اور وجدانی طور پر خود نئی نئی ترکیبیں اس کے
ذہن سے پیدا ہوتی تھیں اور اس طرح گویا وہ اپنی ندرت تخیل کے ساتھ ساتھ
ایک نئی زبان بھی پیدا کر رہا تھا۔ بیدل کو محض شاعر سمجھ کر اس کے کلام
پر تنقید کرنا درست نہیں۔ وہ شاعر سے زیادہ بلند چیز خندیذ تھا۔
بلکہ اس سے بھی ارفع ایک خلاق سخن تھا، ایک پیغام رساں قدرت تھا۔
حسن و عشق کی معمولی شاعری اس کے ذوق سے بہت فروتر چیز تھی اور
اس کا ہر لفظ ایک ایسا نغمۂ لاہوتی تھا جس کی مثال سوائے الہامی کتابوں
کے اور کسی جگہ نہیں مل سکتی۔ پھر ظاہر ہے کہ وہ لوگ جو صرف سعدی، نظامی،
فردوسی، عرفی، نظیری کی سطح سے بیدل کا مطالعہ کریں گے وہ یقیناً کوئی لطف
اس کے کلام میں نہ پائیں گے اور جنھوں نے وہ مخصوص ذہنیت فطرت کی
طرف سے نہیں پائی ہے جو بیدل کے حقائق و معارف کو سمجھ سکے وہ اگر
اس کے کلام کو مغلق، مہمل اور لغو نہ قرار دیں تو تعجب ہے۔ غالب کو اپنی
ذہنیت، فارسیت اور شاعری پر جتنا ناز تھا وہ کسی پر پوشیدہ نہیں۔
مشکل ہی سے وہ کسی کا قائل ہوتا تھا لیکن بیدل کی جدت طرازیوں اور
معنی آفرینیوں سے وہ بھی مرعوب ہو گیا اور اس حد تک کہ آخر کار اس نے
اس کے تتبع کی کوشش شروع کر دی اور پھر خود ہی اس کے ذوق سلیم نے
بتا دیا کہ کامیابی ممکن نہیں۔ غالب کی ناکامی کا سبب صرف یہ ہوا کہ اس نے
زمین وہ نہیں پیدا کی جو بیدل کے تخیل کو بار آور کر سکی۔ بیدل نے صرف

فلسفۂ تکوین کو سامنے رکھا اور اس میں بھی خصوصیت کے ساتھ خالق و مخلوق کا تعلق، قدرت کی بے پایاں وسعت، اس کے مظاہر و آثار، اپنی محدود ناکام جستجو اور آخر میں وحدت وجود جو نتیجہ ہے اس نوع کی سعی و جستجو کا۔ غالب نے غلطی سے بیدل کے رنگ کو منطبق کرنا چاہا مادی شاعری، مادی غزل پر اور ان واقعات حسن و عشق پر جو اس دُنیا میں انسانی گوشت و پوست سے رونما ہوتے ہیں۔ اس لئے جو کچھ اس نے لکھا وہ اس کیف سے خالی رہا جو بیدل کے یہاں پایا جاتا ہے اور چونکہ غالب کا ذوق شعری نہایت بلند تھا اس لئے وہ اس کمی کو آخر کار خود بھی سمجھ گیا۔ بیدل و غالب کے کلام کے اس فرق کو آپ ذیل کی مثال سے سمجھ سکیں گے۔ غالب کا شعر

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

مفہوم یہ ہے کہ میری بساطِ عجز میں سوائے ایک دل کے کیا تھا۔ سو اس کی بھی کیفیت یہ ہے کہ محض ایک قطرۂ خوں ہے جو ہر وقت ٹپک پڑنے کے لئے آمادہ رہتا ہے۔ اس شعر میں قلب کی صنوبری ساخت اور اس کے تعلیق و اژگوں سے اس کا بصورت قطرہ آمادہ چکیدن رہنا ظاہر کیا ہے۔ یہ خیال غالب نے بیدل کے اس شعر سے لیا۔

آبِ گہر نیم و خون یا قوت — داریم بروئے خود چکیدن

لیکن فرق قابلِ غور ہے۔ بیدل کہتا ہے کہ عالم خلق میں بہتر سے بہتر چیز کو لو۔ مثلاً گوہر و یاقوت۔ لیکن اس کا بھی یہ حال ہے کہ اس کا

عجز اس کی حالت سے ظاہر ہے۔۔ داریم بروئے خود چکیدن ۔ یہ پورا مصرع کیفیاتی تشبیہ سے متعلق ہے۔ غالب کے یہاں تشبیہہ نظری و مادی ہے اور دل کی تخصیص کرکے بساط عجز کے صرف ایک محدود و مخصوص منظر کو سامنے لاتا ہے۔ بیدل کوئی تعین نہیں کرتا۔ بلکہ وہ تمام عالم وجود سے بحث کرتا ہے۔ غالب کو دل کی تخصیص کے ساتھ سرنگوں اور یک قطرۂ خون بڑھانا پڑا۔ بیدل کو اپنے مقصود کی وسعت کے لحاظ سے مطلق اس کی ضرورت نہیں ہوئی۔ غالب کو اپنا مفہوم ذہن نشین کرانے کے لئے غیر معمولی تکلف کرنا پڑا۔ لیکن بیدل نے اسے زیادہ سادہ و مختصر الفاظ میں اور زیادہ قوت کے ساتھ ظاہر کردیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ فرق کیوں پیدا ہوا۔ صرف اس لئے کہ بیدل کا نظریہ شاعری سے زیادہ بلند ہے اور اس کے لئے جس مضمون کو بیدل نے اس قدر بلند ہو کر بیان کیا غالب کو اس کے اظہار کے لئے نیچے آنا پڑا (معلومات نمبر نگار ۱۹۵۰ء)

خواجہ عباد اللہ اختر نے ۱۹۵۲ء میں بیدل کا ایک مبسوط تذکرہ بنام "بیدل" لکھا جس کو ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور نے ۱۹۵۳ء میں شائع کیا۔ عباد اللہ اختر صاحب بیدل کی شخصیت کے اس قدر معتقد اور ان کے کلام کی عظمت سے اس حد تک متاثر ہیں کہ علامہ شبلی نعمانی کی اس رائے پر کہ بیدل جیسے شاعروں نے فارسی شاعری کو بگاڑ رکھا تھا اور غالب نے اس کی اصلاح کردی اس قدر برہم ہوئے کہ شبلی کی رائے اور غالب کی شاعری کی دھجیاں کئی صفحوں میں اڑانے کی بڑی زوردار کوشش کی ہے عباد اللہ اختر صاحب

لکھتے ہیں کہ "مولانا شبلی مرزا غالب کی تعریف کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ مرزا غالب کی طبیعت میں نہایت شدت سے اجتہاد اور جدت کا مادہ تھا۔ اس لئے اگرچہ قدما کی پیروی کی وجہ سے نہایت احتیاط کرتے ہیں تاہم اپنا خاص انداز کبھی نہیں چھوڑتے۔ عجیب بات ہے کہ ایران کے انقلاب کی اگرچہ ہندوستانیوں کو خبر نہ تھی لیکن خود بخود یہاں بھی انقلاب ہوا۔ یعنی شاعری کا مذاق جو ناصر علی وغیرہ کی بدولت سیکڑوں برس سے بگڑا چلا آتا تھا درست ہو چلا۔ مرزا غالب نے شاعری کا انداز بالکل بدل دیا۔ ابتدا میں وہ بھی بیدل کی پیروی کی وجہ سے غلط راستے پر پڑ گئے تھے لیکن عرفی، طالب آملی، نظیری، کلیم کی پیروی نے ان کو سنبھالا۔ یہ اشارہ خاتمۂ دیوان فارسی پر ایک تقریظ (مرقومہ غالب) میں پایا جاتا ہے۔" اس میں وہ عرفی، طالب، نظیری اور علی حزیں کے اتباع کا ذکر کرتا ہے مگر بیدل کی طرف کوئی اشارہ نہیں کرتا۔ یہ اجتہاد و جدت جس کی تعریف میں مولانا شبلی رطب اللسان ہیں اشارۃً اس تقریظ میں ایک شعر میں بیان کیا گیا ہے۔ (وہ شعر یہ ہے)

در سلوک از ہر چہ پیش آمد گزشتن داشتم
کعبہ دیدم نقش پائے رہروان نامیدمش

یعنی سلوک میں جو کچھ بھی میرے سامنے آیا۔ میں اس سے گذر گیا۔ کعبے کو دیکھا تو اُسے راستہ چلنے والوں کے نقش قدم سے تعبیر کیا۔ بیدل کہتا ہے۔

کعبہ و بتخانہ نقشِ مرکزِ تحقیق نیست
ہر کجا گم گشتہ رہ سر منزلے آراستند

بیدل نے اس موضوع پر مختلف پیرائے میں اشعار لکھے ہیں۔ یہ تخیل
جو غالب کے شعر میں ہے بیدل ہی سے لیا گیا ہے۔ بیدل کہتا ہے۔

در طلب باید گذشت از ہرچہ می آید بہ پیش
گر ہمہ سر منزلِ مقصود باشد جادہ است

چہ دُنیا و چہ عقبیٰ سد راہِ تُست اے غافل
بیا بگذر کہ از بہرِ گذشتن ہاست ہائل ہا

گر ز دُنیا بگذری تشویش عقبیٰ ہائل ست
تا ز خود نگذشتہ می بایدت صد جا گذشت

نیست در دشتِ طلب با کعبہ مارا احتیاج
سجدہ گاہ ماست ہر جا نقش پا اُفتادہ است

اگر از دہر وا رستیم شوق کعبہ پیش آمد
تگ و پوے نفس یارب کجا ہا می برد مارا

تخیل بیدل کا ہے۔ غالب نے جن الفاظ میں اس کا اظہار کیا ہے
اس سے وہ بات پیدا نہیں ہوئی جو بیدل کے اشعار میں ہے۔ غالب سے
بہتر تو ہمارے علامہ اقبال مرحوم نے کہا ہے۔

زاہد کمال ترک سے ملتی ہے یاں مراد
دنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے

غالب نے صرف اتنی بات بیان کی ہے کہ سلوک میں جو بھی پیش آئے اس سے گذر جانا چاہئے۔ لیکن یہ نہیں بتایا کہ کیوں گذر جانا چاہئے اور یہ کہ منزل بھی کوئی ہے کہ نہیں۔ یہ بات بیدل نے بتائی ہے اب ہمیں دیکھنا ہے کہ مولانا شبلی نعمانی کا نظریہ دربارۂ بیدل و غالب کس حد تک صحیح ہے۔ یہ بات عجیب ہے کہ شبلی کا ممدوح (یعنی غالب) تو بیدل کی تعریف میں رطب اللساں ہے اور شبلی ہیں کہ بیدل کی مذمت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "بیدل جیسے شاعروں نے فارسی شاعری کو بگاڑ رکھا تھا اور غالب نے نہ صرف اس کی اصلاح کی بلکہ شاعری کا انداز بالکل بدل دیا۔ ابتدا میں بیدل کی پیروی کی وجہ سے غالب بھی غلط راستے پر پڑ گئے تھے۔ لیکن مولانا نے یہ تصریح نہیں فرمائی کہ ابتداء سے ان کی مراد کیا ہے اور غالب کو کس وقت احساس ہوا کہ وہ غلط راستے پر چل رہا ہے۔ غالب نے اپنا فارسی اور اُردو کلام خود بڑے اہتمام سے چھپوایا تھا۔ لیکن فارسی کلام جس پر غالب کو بڑا ناز تھا ایران میں اس کا پوچھنے والا کوئی بھی نہیں۔ البتہ اُردو کلام کو خاص وجوہ کی بنا پر خاص شہرت حاصل ہوئی۔ غالب فارسی اور اُردو دونوں میں بیدل کا مدّاح ہے۔ اُردو میں اس کا ایک شعر ہے۔

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا　　اسد اللہ خاں قیامت ہے

یہ امر واقعہ ہے کہ غالب نے بیدل کا انداز پیدا کرنے کی کوشش تو

بہت کی لیکن بیدل کا انداز پیدا نہ کر سکا۔ اس لئے مجبور ہو کر اس نے بیدل کی تقلید چھوڑ دی۔ اجتہاد اور جدت بیدل کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ غالب نے سخت کوشش کی کہ اس کے کلام میں بیدل کی طرز پیدا ہو جائے لیکن خود اس کے قول کے مطابق وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ یہ حقیقت بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ فارسی اور اردو میں غالب کے بہترین اشعار وہی ہیں جن کا تخیل بیدل کے کلام سے لیا گیا ہے۔ نمونہ مشتے از خروارے۔

بیدل:۔ آہم ز نارسائی شد اشک و با عرق شد
پستی است گر خجالت شبنم کند ہوا را

غالب:۔ ضعف سے گریہ مبدل بدم سرد ہوا
باور آیا مجھے پانی کا ہوا ہو جانا

بیدل:۔ مطلبم از می پرستی تر دماغیہا نبود
یک دو ساغر آب دادم گریۂ مستانہ را

غالب:۔ مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

بیدل:۔ شمع محفل بر خموشی بست و مینا بر شکست
ہر کسے زیں انجمن طرزِ دگر نالید و رفت

سحر آہ و گلستاں نکہت و بلبل فغاں دارد
جہانے سوے بیرنگی ز حسرت کارواں دارد

غالب:- بوے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

غالب نے نکہت کی جگہ "بو" فغاں کی جگہ "نالہ" اور آہ کی جگہ "دود" استعمال کیا ہے۔

بیدل:- دامنِ دل گرفتہ ایم خونِ مستاں بہ گردنِ مینا

غالب:- ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق
لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر

بیدل:- خلقے بعدم دود دل و داغ جگر برد
خاک ہمہ صرفِ گل و سنبل شدہ باشد

غالب:- سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

بیدل:- یاد آزادیست گلزارِ اسیرانِ قفس
زندگی گر عشرتے دارد امیدِ مردن است

غالب :- ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

بیدل :- بیدل ایں انجمن و ہم دیگر نتواں یافت
در دہم مفت تماشاست طرب باید کرد

غالب :- نغمہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانئے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

بیدل :- سازِ ہستی غیر آہنگِ عدم چیزے نداشت
ہر نوائے را کہ وا دیدم خموشی می سرود

غالب :- نشو و نمائے اصل ہے غالب فروغ کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہئے

بیدل :- رنج دُنیا فکرِ عقبیٰ، داغ حرماں، دردِ دل
یک نفس ہستی بدوشم عالمے را بار کرد

غالب :- فکرِ معاش، عشقِ بتاں، یادِ رفتگاں
تھوڑی سی زندگی میں بھلا کیا کرے کوئی

بیدل :- من و ساز دکان خود فروشیہا چہ حرفست ایں
جنون ایں فضولی در سر منصور می باشد

غالب :- قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنک ظرفی منصور نہیں

بیدل :- گر تو نکشائیؑ زخواب ناز مژگاں چارہ نیست
در ہمیں چشمے کہ داری نور ایمن دیدہ اند

غالب :- صد جلوہ رو برو ہے جو مژگاں اُٹھائیے
طاقت کہاں کہ دید کا احساں اُٹھائیے

عباد اللہ اختر صاحب مزید فرماتے ہیں کہ مولانا شبلی کے علم و فضل سے کسی کو انکار نہیں۔ لیکن مولانا نے بیدل کی طرف مناسب توجہ نہیں دی۔ غالب بیدل کا سب سے بڑا مداح ہے۔ اب اگر مولانا بیدل کی مذمت بمقابلہ غالب کریں تو اس کے سوائے اور کیا کہا جائے کہ مولانا کلام بیدل کے معنی سے جس حد تک واقف تھے غالب بھی اس حد تک واقف نہ تھے۔ مولانا بیدل کو صرف ایک شاعر سمجھ کر اس کی شاعری پر تنقید فرما رہے ہیں۔ مگر بیدل صرف شاعر نہیں ہے بلکہ حکمائے اسلام میں اس کا پایہ اتنا بلند ہے کہ ہمارے علامہ اقبال کی رائے ہے کہ برگساں فلسفی کے انکار بھی بیدل

کے کلام میں موجود ہیں۔ (بیدل مرتبہ عباد اللہ اختر)

عباد اللہ اختر صاحب کتاب کی تمہید میں لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ لاہور کے کالجوں کے طلبہ نے یوم غالب منایا۔ علامہ اقبال زندہ تھے۔ ایک وفد علامہ کی خدمت میں باریاب ہوا اور شرکت کی دعوت دی۔ علامہ نے فرمایا کہ " مناسب ہوتا کہ تم لوگ یوم بیدل مناتے۔ ذرا سوچو کہ غالب کا کلام غلام آباد ہندوستان میں مقبول کیوں ہے اور بیدل کو کوئی نہیں جانتا۔ برخلاف اس کے بیدل کا کلام آزاد ممالک مثلاً افغانستان میں تلاوت کیا جاتا ہے اور غالب کو کوئی نہیں پوچھتا۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ غالب کا تصوّر افسردگی پیدا کرتا ہے اور بیدل کا تصوف حیات بخش تر و تازگی کے ساتھ جذبات کو ابھارتا ہے۔" (بیدل)

علامہ اقبال کے مجموعۂ کلام "بانگ درا" میں پانچ بندوں کی ایک نظم بعنوان "غالب" ہے۔ اس میں اقبال غالب کی مدح سرائی میں یوں نوا پرداز ہوتے ہیں۔

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا ۔۔۔ ہے پرِ مرغِ تخیّل کی رسائی تا کجا
تھا سراپا روح تو، بزمِ سخن پیکر ترا ۔۔۔ زیبِ محفل بھی رہا، محفل سے پنہاں بھی رہا

دید تیری آنکھ کو اس حُسن کی منظور ہے
بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

محفلِ ہستی تری بربط سے ہے سرمایہ دار ۔۔۔ جس طرح ندی کے نغموں سے سکوتِ کوہسار
تیرے فردوسِ تخیّل سے ہے قدرت کی بہار ۔۔۔ تیری کشتِ فکر سے اُگتے ہیں عالم سبزہ زار

زندگی مضمر ہے تیری شوخیٔ تحریر میں
تابِ گویائی سے جنبش ہے لبِ تصویر میں

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر
محوِ حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر

شاہدِ مضموں تصدق ہے ترے انداز پر
خندہ زن ہے غنچۂ دلّی گلِ شیراز پر

آہ تو اجڑی ہوئی دلّی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ "ویمر" میں تیرا ہمنوا خوابیدہ ہے

لطفِ گویائی میں تیری ہمسری کوئی نہیں
ہو تخیل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہمنشیں

ہائے اب کیا ہو گئی ہندوستاں کی سرزمیں
آہ اے نظارہ آموزِ نگاہِ نکتہ چیں

گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ سودائیِ سوزِ دلِ پروانہ ہے

اے جہاں آبادا! اے گہوارۂ علم و ہنر
ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در

ذرّے ذرّے میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر
یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہر

دفن تجھ میں کوئی فخرِ روزگار ایسا بھی ہے
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے

اقبال کے ان اشعار اور بالخصوص اس مصرعہ کہ

تیری کشتِ فکر سے اُگتے ہیں عالم سبزہ زار

سے عباداللہ صاحب کے بیان کی بظاہر تردید ہوتی ہے۔ لیکن الفاظ "شوخیٔ تحریر" اور "تصویر" غالب کے اس مطلع کی طرف اشارہ کرتے ہیں سے

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

یہ شعر غالب کے اُردو دیوان کا مطلع ہے اس کے علاوہ نظم میں ایک مصرعہ ہے

گیسوئے اُردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے

اس لئے اس نظم میں ممکن ہے کہ غالب کی شاعری کی جو تعریف کی گئی ہے وہ ان کی اُردو شاعری کی تعریف ہو اور غالب کی جس شاعری کے بارے میں کہا گیا ہے کہ افسردگی لاتی ہے وہ فارسی شاعری ہو۔ کیونکہ افغانستان وغیرہ میں جہاں بیدل کے کلام کی تلاوت ہوتی ہے وہاں اُردو اشعار کی تلاوت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ "بانگ درا" میں "مذہب" کے عنوان سے اقبال کا ایک قطعہ ہے۔ بیدل کے ایک شعر پر تضمین کرتے ہوئے بیدل کو مُرشد کامل لکھا ہے۔ قطعہ

تعلیم پیر فلسفۂ مغربی ہے یہ
ناداں ہیں جن کو ہستیٔ غائب کی ہے تلاش

پیکر اگر نظر سے نہ ہو آشنا تو کیا
ہے شیخ بھی مثالِ برہمن صنم تراش

محسوس پر بنا ہے علومِ جدید کی
اس دور میں ہے شیشۂ عقائد کا پاش پاش

مذہب ہے جس کا نام وہ ہے اک جنونِ خام
ہے جس سے آدمی کے تخیل کو ارتعاش

کہتا مگر ہے فلسفۂ زندگی کچھ اور
مجھ پر کیا ہے مُرشدِ کامل نے راز فاش

باہر کمال اندکے آشفتگی خوش است
ہر چند عقل کل شدۂ بے جنوں مباش

اقبال کی "خودی" کے سلسلے میں عشق اور جنون بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ جنون سے مراد جنون عشق۔ اقبال کہتے ہیں۔

جب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی — کھلتے ہیں غلاموں پر اسرار شہنشاہی
خودی ہو علم سے محکم تو غیرت جبریل — خودی ہو عشق سے محکم تو صور اسرافیل
دیار عشق میں اپنا مقام پیدا کر — نیا زمانہ نئی صبح و شام پیدا کر

پیدا ہے فقط حلقۂ ارباب جنوں میں — وہ عقل کہ پا جاتی ہے شعلے کو شرر سے
بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے — یہ ہے نہایت اندیشہ و کمال جنوں
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں — مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

ایسے عشق و جنوں کا پتہ غالب کے یہاں نہیں ملتا، بیدل کے یہاں ملتا ہے۔ اس لئے اقبال بیدل کو مرشد کامل کہتے ہیں لیکن غالب کو کوئی رہبر نہیں سمجھتے۔ غالب کو صرف آبدار موتی سمجھتے ہیں۔

غالب کی دھجیاں اڑانے سے پیشتر دیباچہ کتاب میں غالب سے متعلق اپنے طرز عمل کی صراحت کرتے ہوئے خواجہ اختر صاحب لکھتے ہیں کہ ہم نے مرزا اسد اللہ خاں غالب کا ذکر ضرورتاً اس لئے کیا کہ ایک اہل الرائے نے غالب کے کلام کو سراہتے ہوئے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ بیدل نے فارسی شاعری کو بگاڑ دیا تھا جس کی اصلاح غالب نے کی۔ اس لئے مجبوراً ہمیں اس دعویٰ کا جائزہ لینا پڑا۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم دبیر الملک اسد اللہ خاں غالب کے فارسی کلام کی قدر و منزلت کم کرنا چاہتے ہیں اگر کوئی سخن گسترانہ بات اس

ضمن میں آگئی ہے تو اس کو ان معنوں میں محمول نہ کرنا چاہئے (بیدل)

خوب! ساز کو چھیڑتے کہتے ہو کہ آواز نہ ہو

غالب کی شاعرانہ شخصیت اتنی عظیم الشان اور اہم ہے کہ ان کی صرف مذمت اور تنقیص کرنا خود مذمت اور تنقیص کرنے والے کی مذموم حرکت کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ عباداللہ اختر صاحب کو اگر مجبوراً جائزہ لینا پڑا تھا تو لیتے مگر انھوں نے جس انداز سے جائزہ لیا ہے اس سے تو ان کی نیت کا حال خود بخود کھل جاتا ہے۔ اگر نیت صاف ہوتی تو سخن گسترانہ بات کے لئے معذرت طلب کرتے نہ کہ یہ کہتے کہ "ان معنوں میں محمول نہ کرنا چاہئے" اگر یہ قارئین یا ارباب نظر سے التجا ہے تو بالکل پنجابی طرز کی التجا ہے۔ عباداللہ صاحب نے پوری کتاب میں پنجابی انداز گفتگو میں بحث کی ہے کہیں لکھتے ہیں کہ مولانا شبلی کہتے ہیں اور کہیں لکھتے ہیں کہ وہ (یعنی شبلی) کہتا ہے

غالب کی فارسی شاعری کا تذکرہ کرتے ہوئے تقریباً کبھی تذکرہ نویسوں اور ناقدوں نے لکھا ہے کہ غالب نے شروع میں بیدل کی تقلید کی لیکن غالب کے اس مقطع

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا اسداللہ خاں قیامت ہے

سے بالکل واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ غالب نے بیدل کی تقلید اُردو میں کی تھی، فارسی میں نہیں۔ غالب کے فارسی کلام کا رنگ بھی یہی بتاتا ہے غالب نے فارسی میں جن شاعروں کی تقلید کی دیوان فارسی کی تقریظ میں نمایاں طور پر ان کے نام لکھے ہیں اور ان کی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں۔ فارسی میں

انھوں نے خصوصیت سے عرفی، نظیری، ظہوری، حزیں اور طالب آملی کی تقلید کی ہے اور ان پانچ شاعروں میں ظہوری سے سب سے زیادہ متاثر ہیں۔ بلکہ وہ اپنے کو ظہوری کا زلہ ربا سمجھتے ہیں۔

زلہ بردار ظہوری باش غالبؔ بحث چیست | در سخن درویشے باید نہ دکاں دارئے

غالبؔ از صہبائے اخلاق ظہوری سرخوشیم | پارہ بیش است از گفتار ما کردار ما

غالبؔ از اوراق ما نقش ظہوری دمید | سرمہ حیرت کشیم دیدہ بدیدن دہیم

غالبؔ از جوش دم ما ترقبش گلپوش باش | پردہ ساز ظہوری را گل افشاں کردہ ام

بہ نظم و نثر مولانا ظہوری زندہ ام غالب | رگ جاں کردہ ام شیرازہ اوراق کتابش را

بلہ تازہ گشتہ غالب روش نظیری از تو | سزد ایں چنیں غزل را بہ سفینہ ناز کردن

کیفیت عرفی طلب از طینت غالبؔ | جام دگراں بادہ شیراز ندارد

غالب نے دیوان فارسی کی تقریظ میں یا کسی فارسی شعر میں بیدل کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ غالب بیدل کی معنی آفرینیوں سے متاثر تھے لیکن ان کے مقلد نہ تھے۔ البتہ اردو میں رنگ بیدل کی تقلید کی ہے۔ لہٰذا تقلید بیدل کے سلسلے میں فارسی اور اردو کو گڈمڈ نہیں کرنا چاہیے اور عباداللہ صاحب کے منقولہ اشعار اور تقریظ کی تشریح سے فارسی میں بیدل کی تقلید ثابت نہیں ہوتی۔ صرف استفادہ معنی ثابت ہوتا ہے تقلید

رنگ سخن اور استفادۂ معنی دو بالکل مختلف چیزیں ہیں۔ ان دونوں کو خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔ بعد میں غالب نے اُردو میں بیدل کی تقلید کیوں چھوڑ دی تھی اس کی مفصّل توضیح غالب کی اُردو شاعری کی بحث میں کی گئی ہے۔

غالب کے ایک معاصر مفتی صدرالدین آزردہ تھے۔ منصب کے لحاظ سے صدرالصدور تھے۔ صاحب علم وقلم اور ذی اثر اور ذی ثروت آدمی تھے۔ شاعری کا اچھا مذاق رکھتے تھے۔ صاف اور سلیس شعر پسند کرتے تھے۔ مولانا حالی یادگار غالب میں لکھتے ہیں کہ "مولانا مفتی صدرالدین خاں (آزردہ) جن کا کلام اُردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں موجود تھا مگر افسوس ہے کہ اس میں سے بہت کچھ ضایع ہوگیا۔ لیکن بعض مذہبی رسالے جو ان سے یادگار رہ گئے ہیں شائع ہو چکے ہیں" غالب سے آزردہ کے گہرے تعلقات تھے لیکن اغلاق کی وجہ سے انھیں غالب کے اشعار پسند نہ تھے۔ غالب کی شاعری کے معاملے میں وہ مولانا فضل حق خیرآبادی کے بالکل برعکس تھے۔ ان کے خیال کے مطابق غالب کا شعر ہونے ہی کا مطلب یہ ہے کہ شعر طرزِ بیان کے لحاظ سے ناپسندیدہ ہوگا۔ یادگار غالب میں لکھا ہے کہ غالب کی وفات سے چھ سات برس پہلے کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے مکان میں مفتی آزردہ، مرزا غالب، مولانا حالی اور دیگر اہل ذوق حضرات تشریف فرما تھے۔ زمین پر چند کتاب کے اوراق پڑے ہوئے تھے۔ غالب کی نظر ان پر پڑ گئی۔ انھوں نے وہ اوراق اُٹھا لیے اور حاضرین بالخصوص آزردہ کو مخاطب کرکے کہا کہ دیکھیے ایک ایرانی شاعر کی کتنی زبردست غزل

ہے۔ یہ کہہ کر وہ غزل سنانے لگے۔ شروع کے دو تین شعروں پر آزردہ نے تعریف کی مگر بعد کو قرائن سے تاڑ گئے کہ یہ غالب کی غزل ہے۔ اب شعر سن کر آزردہ کہنے لگے کہ کلام مربوط ہے مگر کسی مبتدی کا کلام معلوم ہوتا ہے۔ اس پر سب لوگ ہنس پڑے۔ اتفاق سے مقطع اُس وقت کے لئے بہت مناسب ثابت ہوا۔ مقطع ہے

تو اے کہ محو سخن گستران پیشینی
مباش منکر غالبؔ کہ در زمانہ تست

غالب کی سخن فہمی کے سلسلے میں مولانا فضل حق خیرآبادی کے بیان کو پیش نظر رکھتے ہوئے غالب کا اپنا بیان پڑھئے۔ یادگار غالب میں لکھا ہے کہ "منشی نبی بخش حقیر تخلص جو ایک زمانے میں کول میں سررشتہ دار تھے اور جن کی سخن فہمی اور سخن سنجی کی بڑے بڑے لوگوں سے تعریف سُنی گئی ہے کہیں وہ دلّی میں آئے ہوئے تھے اور مرزا کے مکان پر ٹھہرے تھے۔ ان کی نسبت منشی ہرگوپال تفتہ کو ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں جس کا ماحصل یہ ہے کہ خدا نے میری بیکسی اور تنہائی پر رحم کیا اور ایک ایسے شخص کو میرے پاس بھیجا جو میرے زخموں کا مرہم اور میرے درد کا درماں اپنے ساتھ لایا اور جس نے میری اندھیری رات کو روشن کر دیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے ایک شمع روشن کی جس کی روشنی میں میں نے اپنے کلام کی خوبی جو تیرہ بختی کے اندھیرے میں خود میری نگاہ سے مخفی تھی دیکھی۔ حیران ہوں کہ اس فرزانہ یگانہ یعنی منشی نبی بخش کو کس درجے کی سخن فہمی اور سخن سنجی عنایت ہوئی ہے۔ حالانکہ میں شعر کہتا ہوں

اور شعر کہنا جانتا ہوں مگر جب تک میں نے اس بزرگوار کو نہیں دیکھا یہ نہیں سمجھا کہ سخن فہمی کیا چیز ہے اور سخن فہم کس کو کہتے ہیں۔ مشہور ہے کہ خدا نے حُسن کے دو حصّے کئے ہیں۔ آدھا یوسف کو دیا اور آدھا تمام بنی نوع انسان کو۔ کچھ تعجب نہیں کہ فہم سخن اور ذوق معنی کے بھی دو حصّے کئے گئے ہوں گے اور آدھا منشی نبی بخش کے اور آدھا تمام دُنیا کے حصّے میں آیا ہو۔

اب سخن فہم حضرات غور فرمائیں کہ غالب نے یہ منشی نبی بخش کی سخن فہمی اور سخن سنجی کی تعریف کی یا اپنی سخن گوئی کی۔

غالب کے معاصرین میں مولوی امام بخش صہبائیؔ اور مولوی محمد علی علوی فارسی شاعری کا اعلیٰ مذاق رکھتے تھے۔ صہبائیؔ دلّی کے رہنے والے اور ایک مدرسہ کے مدرّس[1] تھے۔ فارسی کے زبردست صاحب علم و قلم اور مشہور شاعر تھے۔ صہبائیؔ کے ایک شاگرد اور کلّیات صہبائیؔ کے ناشر و مرتب دین دیال سنگھ میر منشی اجنٹی بھوپال کلّیات کی تقریظ میں لکھتے ہیں کہ "ان کی تصنیفات ایک دریائے ذخّار و بحر ناپید کنار تھیں جو غدر ۱۸۵۷ء میں تلف ہو گئیں۔" صہبائیؔ کی تصنیفات میں ایک شرح سہ نثر ظہوری بھی تھی۔ صہبائیؔ نے خود بھی سہ نثر ظہوری کے طرز پر نثر لکھی تھی جس کا نمونہ کلّیات صہبائیؔ میں آج بھی موجود ہے۔ ان کی شعری تخلیقات میں غزل، قصیدہ اور مثنوی کے علاوہ دیگر اصناف کا کلام بھی ملتا ہے۔ صہبائیؔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے ایام میں انگریزی افواج کے سفّاک ہاتھوں سے شہید ہوئے۔" میں نے نگار کے کسی شمارہ میں نیاز

[1] ۱۸۴۲ء میں دہلی کالج میں پروفیسر مقرر ہوئے۔

فتحپوری صاحب کا بیان دیکھا تھا کہ ان کے والد صرف صہبائی سے فارسی سیکھنے کے لئے اپنے وطن سے دہلی گئے تھے۔ غالب نے اپنی ایک بیت میں اپنے دہلی کے چند ہم عصر شعرائے فارسی کے نام لئے ہیں۔ ان میں صہبائی اور علوی بھی شامل ہیں۔ کلیات صہبائی میں ایک غزل کے مقطع میں صہبائی نے غالب کی بڑی اچھی تعریف کی ہے۔ تاہم غالب صہبائی اور علوی کو کم مانتے تھے اور صہبائی اور علوی غالب کو کم مانتے تھے۔

(یادگار غالب)۔

لطیف اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ غالب نے یہ کہہ کر کہ "بندہ ہندی مولد اور پارسی زبان ہے" بہت بڑا دعویٰ کیا ہے اور اگرچہ انھوں نے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں اپنی نظم و نثر کے متعدد شاہکار پیش کئے ہیں بایں ہمہ اہل زبان نے خواہ وہ عصر رفتہ میں پیدا ہوئے ہوں یا عصر حاضر میں موجود ہوں۔ ان کے "ہندی مولد اور پارسی زبان" ہونے کو درخود اعتنا نہیں سمجھا۔ یہ ناپرسی ہنر غالب ہی پر موقوف نہیں بلکہ اہل زبان کی نظر میں برصغیر کے کسی بھی سخنور اور ادیب کو جائے اعتبار حاصل نہ ہو سکی۔ البتہ عہد حاضر میں تجدید روابط کے بعد دانشوران ایران نے اقبال کے فکر و فن کی ضرور پذیرائی کی ہے۔ لیکن خسرو، فیضی، بیدل، مظہر جانجاناں اور غالب نمایاں طور پر تحسین کے مرحلے میں نہیں آئے (اردو سہ ماہی کراچی غالب نمبر ۱۹۶۹ء)

مذکورہ بالا شاعروں بالخصوص امیر خسرو کے تحسین کے مرحلے میں

نہ آنے کی وجہ یہ نہیں کہ ان کی شاعری ایرانیوں کے معیار شاعری میں پوری نہیں اُترتی بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ غیر ایرانی ہونے کی بنا پر ایرانی تذکرہ نویس ان کو اپنے ادبیات کے تذکروں میں جگہ نہیں دیتے۔ اس وجہ سے وہ ایرانیوں میں روشناس نہیں ہیں۔ پہلے اقبال بھی روشناس نہیں تھے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے اُتر پردیس کے اُردو تذکرہ نویس بنگال اور بہار کے اچھے شعرائے اُردو کے علاوہ اساتذہ تک کو نظر انداز کرتے رہے ہیں۔ دفتر بے مثال" اشعار نساخ، ارمغان اور ارمغانی جیسے ضخیم دواوین کے علاوہ سخن شعر (تذکرہ شعرائے اُردو) زبان ریختہ (مختصر تاریخ اُردو) مرغوب دل (فارسی رُباعیات کا مجموعہ) شاہد عشرت (سراپائے معشوق کی منظوم تصویر کشی) گنج تواریخ (تاریخی قطعات کا مجموعہ) چشمۂ فیض (پند نامہ عطار کا منظوم ترجمہ) نصرۃ المسلمین (چوہتر مذہبی رُباعیات کا مجموعہ) انتخاب نقص (انیس و دبیر کے کلام کے فنی نقائص) وغیرہ تصنیفات کے بنگال کے اُردو مصنّفؔ کا کوئی ذکر اتر پردیسی تذکرہ نویسوں کے تذکروں میں نہیں ملتا۔ اُردو ادب کے ایک مؤرخ صاحب اتر پردیس کے نوجوان شاعروں کا ذکر نہ کرنے کو انصاف کا خون کرنا سمجھتے ہیں لیکن کلکتہ کے اس مشہور استاد سخن کا بھی ذکر نہیں کرتے جو اس وقت حیات سے تھے جس طرح ہمارے ان مؤرخ صاحب نے قیاس فرمالیا کہ بنگال میں کوئی اُردو کا شاعر یا ادیب پیدا نہیں ہوسکتا اسی طرح ایرانیوں نے یہ قیاس کرلیا کہ ہندوستان میں کوئی فارسی شاعر پیدا نہیں ہوسکتا۔

لہ نساخ

بود غالب عندلیبے از گلستانِ عجم
تا ز غفلت طوطیٔ ہندوستاں نامیدش

غالب کی فارسی دانی

ایک غیر اہل زبان فارسی شاعر کی فارسی شاعری کے معاملے میں فارسی دانی کا مسئلہ بڑا اہم اور نازک مسئلہ ہوتا ہے۔ یہ بات مسلّم ہے کہ غیر زبان میں اہل زبان کامل الفن اُستاد کی طرح مہارت حاصل کرنا قریب ناممکن ہے۔ اس لئے جب تک اس ملک میں رہ کر وہاں کے ماہر زبان اساتذہ سے وہ زبان وقت نظر کے ساتھ نہ سیکھی جائے الفاظ و محاورات کا سو فیصدی صحیح استعمال ناممکن ہے۔ غیر اہل زبان کامل الفن اساتذہ سے لاکھ کاوش اور وقت نظر کے ساتھ اس زبان کا علم حاصل کیا جائے لیکن ٹھیک نکل ہی جاتی ہے۔ یہ بات خود غالب کے بیانات سے بھی صحیح ثابت ہوتی ہے۔ مرزا غالب خالص ہندوستانی تھے اور ہندوستانی ماحول کے ساختہ پرداختہ تھے۔ نہ عرفی و خاقانی کی طرح ان کے گھر کی بڑھیوں کی زبان فارسی تھی اور نہ مرزا قتیل کی طرح ان کو ایرانی تاجروں کے ساتھ ملتے جُلتے رہنے کا اتفاق نصیب ہوا تھا۔ ایران کا مُنھ دیکھنا تو دور کی بات، ہندوستان سے باہر ان کا قدم نہ نکلا تھا۔ اس لئے غالب کی فارسی اور طرز تحریر کا سو فیصدی ایرانی فارسی اور طرز تحریر ہونا ناممکن تھا۔ لیکن غالب کو اپنی فارسی دانی اور علم زبان کی مہارت کا اس حد تک احساس تھا کہ وہ ہند و پاکستان کے

تمام شعرا اور اہل قلم میں سوائے ایک امیر خسرو کے کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور سب کو بڑی حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور ہند و پاکستان کے جو شعرا یا اہل قلم یا فرہنگ نویس تھوڑی بہت شہرت اور وقار رکھتے تھے غالب ان سے حد درجہ بغض رکھتے تھے اور ان کی شان میں نہایت ہی بے باکی کے ساتھ بد کلامیاں کرتے تھے۔

چودھری عبدالغفور سرور کے نام ایک خط میں غالب لکھتے ہیں کہ نام علی، بیدل اور غنیمت، تو ان کی فارسی کیا؟ ہر ایک کا کلام بہ نظر انصاف دیکھیے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ منت اور مکیں، اور واقف و قتیل یہ اس قابل نہیں کہ ان کا نام لیجیے۔ ان حضرات میں عالم علوم عربیہ کے شخص ہیں، خیر ہوں گے۔ کلام میں ان کے مزا کہاں، ایرانیوں کی سی ادا کہاں۔ فارسی کی قاعدہ دانی میں اگر کلام ہے، اس میں پیروی قیاس ایک بلائے عام ہے۔ وارستہ سیالکوٹی نے خان آرزو کی تحقیق پر سو جگہ اعتراض کیا ہے اور ہر اعتراض بجا ہے۔ باایں ہمہ وہ بھی جہاں اپنے قیاس پر جاتا ہے مُنھ کی کھاتا ہے۔ مولوی احسان اللہ ممتاز کو صنائع لفظی میں دستگاہ اچھی تھی، اس شیوہ و ورش کو خوب برت گئے۔ فارسی وہ کیا جانیں۔ قاضی صادق خاں اختر عالم ہوں گے۔ شاعری سے ان کو کیا علاقہ؟ (عود ہندی)

غالب کے اس خط میں جن شاعروں کے نام آئے ہیں ان میں غالب کو سب سے زیادہ عداوت قتیل سے تھی۔ مرزا محمد حسن قتیل کا انتقال غالب کی پیدائش سے بیس بائیس سال بعد یعنی ۱۲۳۲ھ (۱۸۱۷ء) میں ہوا

تھا۔ غالب کے وقت میں قتیل کی فارسی دانی، فارسی شاعری و نثر نگاری اور
تحقیق کا بہت شہرہ تھا۔ مرزا قتیل فرید آباد ضلع دہلی کے کھتری تھے۔ لالہ
دیوانی سنگھ نام تھا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں اپنے اُستاد مرزا محمد باقر شہید
اصفہانی کے اثر سے دین اسلام سے مشرف ہوئے اور اثنا عشری مسلک قبول
کیا۔ باقر شہید ہی نے انھیں قتیل تخلص عنایت کیا۔ قتیل اپنی فارسی دانی اور
عالمانہ و محققانہ تبحر علمی کی وجہ سے بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے
تھے۔ کچھ دنوں دہلی میں رہنے کے بعد لکھنؤ آئے۔ لکھنؤ میں عوام تو عوام
خواص نے بھی حتیٰ کہ نواب سعادت علی خاں بہادر نے بھی ان کو ہاتھوں ہاتھ
لیا۔ ان کو میر منشی کا عہدہ دیا گیا۔ اس وقت اکثر علما و تجار ایران سے
لکھنؤ آیا کرتے تھے۔ قتیل کو ان لوگوں سے ملنے اور فارسی سیکھنے کا موقع
ملا کرتا تھا۔ مرزا محمد حسین جو کربلائے معلیٰ کے ایک دیندار عالم دین تھے۔
ان سے اور آقا صادق صفاہانی اور آقا ابوالحسن قزوینی جیسے لوگوں کی صحبت
میں رہنے کا موقع ملا۔ ہفت تماشائے قتیل، نہر الفصاحت، چار شربت
دریائے لطافت (بشرکت انشاء اللہ خاں)، مظہر العجائب، شجرۃ الامانی، دیوان
قتیل اور قانون مجدد، قتیل کی تصنیفات ہیں۔ پورے ہندوستان میں
قتیل کی فارسی دانی کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ اگر چہ قتیل کا انتقال ہو چکا
تھا۔ لیکن پوری شد و مد کے ساتھ قتیل کا چرچا باقی تھا۔ یہ بات غالب
کے لئے سوہان روح کا باعث تھی۔ اس سوہان روح کے زیر اثر غالب
قتیل کو ہمیشہ بُرے ناموں سے یاد کرتے تھے۔ ایک خط میں اپنے مکتوب الیہ

صاحب عالم کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ "عرض کرتا ہوں کہ نظامی اب ایسا ہوا کہ جب تک فرید آباد کا کھتری دیوانی سنگھ ثم متخلص بہ قتیل جس کو حضرت نے مرحوم لکھا ہے اس کی تصدیق نہ کرے تب تک اس کا کلام قابل استناد نہ ہو۔ قتیل اساتذۂ سلف کے کلام سے قطعاً آشنا ہی نہیں، اس کے علم فارسی کا ماخذ ان لوگوں کی تقریر ہے جو نواب سعادت علی خاں کے وقت میں ممالک مغربی کی طرف سے لکھنؤ میں آئے اور ہنگامہ آرا ہوئے۔ بیشتر سادۂ کشمیری یا کابلی و قندھاری و تکرانی۔ احیاناً کوئی عامۂ اہل ایران سے ہو۔ ماناکہ عظمائے ایران میں سے بھی کوئی ہوگا۔ تقریر اور ہے اور تحریر اور۔ اگر تقریر بعینہٖ تحریر میں آیا کرے تو خواجہ بقراط اور شرف الدین علی یزدی اور مُلّا حسین واعظ الکاشفی اور طاہر وحید یہ سب نثر میں کیوں خون جگر کھایا کرتے تھے۔ وہ سب طرح کی نثریں جو لالہ دیوانی سنگھ قتیل متوفی نے بتقلید اہل ایران لکھیں نہ رقم فرمایا کرتے۔" (عود ہندی)

غالب ایک اور خط میں صاحب عالم کو لکھتے ہیں کہ "میرے بیان پر غور کرو اور جو عبدالواسع اور غیاث الدین اور عبدالرزاق ان ناموں کی شوکت نظر میں ہے تو تم جانو۔ ایک شخص بھیک مانگتا ہے باپ نے اس کا نام میر بادشاہ رکھ دیا۔ اصل فارسی کو اس کھتری بچہ قتیل علیہ ما علیہ نے تباہ کیا۔ رہا سہا غیاث الدین رامپوری نے کھویا۔ ان کی قسمت کہاں سے لاؤں جو صاحب عالم کی نظر میں اعتبار پاؤں۔ خالصاً للہ غور کرو کہ وہ خران نامشخص کیا کہتے ہیں اور میں خستہ دردمند کو کیا بکتا ہوں۔ واللہ نہ قتیل فارسی کہتا ہے اور نہ غیاث الدین فارسی جانتا ہے۔

میرا یہ خط پڑھو۔ یہ نہیں کہتا کہ خواہی نخواہی پڑھو۔ قوت ممیزہ سے کام لو۔ ان غولوں پر لعنت کرو۔ سیدھی راہ پر آجاؤ۔ اگر نہیں آتے تو تم جانو تمھاری بزرگی اور مرزا تفتہ کی نسبت پر نظر کر کے لکھا۔ نہیں کہتا کہ خواہی نخواہی میری تحریر کو مانو۔ مگر اس کھتری بچہ اور اس معلم سے مجھ کو کمتر نہ جانو۔ عربی کا حرف اور ہے اور فارسی کا قاعدہ اور ہے۔ سمجھو نہ سمجھو تم کو اختیار ہے۔ عقل کو کام فرماؤ غور کرو، مجھ و عبدالواسع پیغمبر نہ تھا، قتیل برہما نہ تھا، واقف غوث الاعظم نہ تھا میں یزید نہیں ہوں، شمر نہیں ہوں۔ مانتے ہو مانو، نہ مانو تم جانو۔" (عود ہندی)

منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں کہ "وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھ کو نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کر دیں۔ میرے قصیدے دیکھو، تشبیب کے شعر بہت پاؤ گے اور مدح کے شعر کمتر۔ نثر میں بھی حال ہے۔ جو لوگ قتیل کو اچھے لکھنے والوں میں جانیں گے وہ نظم و نثر کی خوبی کو کیا پہچانیں گے" (اردوئے معلی)

مولوی امام بخش صہبائی کی فارسی دانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عبدالغفور سرور کو لکھتے ہیں کہ "وائے اس ہیچ در پوچ پر جس کو (یعنی ساطع برہان کے مؤلف مرزا رحیم بیگ کو) صہبائی کا تلمذ موجب افتخار ہو۔" (عود ہندی)

دربار اکبری کے ملک الشعرا فیضی کا طوطی اس وقت بول رہا تھا جبکہ اکبر کا دربار ایرانی شعراء، ادبا اور اہل قلم سے بھرا ہوا تھا اور عرفی جیسا مغرور و خود بیں شاعر فیضی کا ہم چشم تھا۔ بعض اوقات بڑے نازک موقعے آپڑتے تھے۔ لیکن ان نازک موقعوں پر بھی فیضی فتحیاب ہوتا تھا۔ چنانچہ فیضی کی بدیہہ گوئی

کا مشہور واقعہ ہے کہ اکبر کا ایرانی معاصر شاہ عباس ثانی کے دربار کے شاعر ملّا طاہر وحید نے ایک رُباعی کہی تھی جس میں شاہ عبّاس کا ذکر فاضل اور اکبر کا ذکر مفضول کی حیثیت سے کیا گیا تھا۔ شاہ عباس رباعی سُن کر بہت خوش ہوا اور تحفوں کے ساتھ وہ رُباعی دربار اکبری میں بھیج دی۔ ایرانی سفیر نے بھرے دربار میں رُباعی پڑھی۔

زنگی بہ سپاہ و خیل و لشکر نازد | رومی بہ سنان و تیغ و خنجر نازد
اکبر بہ خزینۂ پُر از زر نازد | عبّاس بہ ذوالفقار حیدر نازد

چونکہ اس رُباعی میں اکبر پر چوٹ تھی اس لئے اہل دربار چونک پڑے۔ اکبر بھی اندر ہی اندر تلملا گیا۔ فیضی بھی دربار میں موجود تھا۔ اکبر نے اُمید بھری نگاہوں سے فیضی کی طرف دیکھا کہ شاید کوئی جواب دے۔ فیضی فوراً کھڑا ہو گیا اور کہا کہ حضرات اس کا جواب بھی سُن لیا جائے۔

فردوس بہ سلسبیل و کوثر نازد | دریا بہ گہر فلک بہ اختر نازد
عباس بہ ذوالفقار حیدر نازد | کونین بہ ذات پاک اکبر نازد

فیضی کی فی البدیہہ جوابی رُباعی سُن کر دربار میں مسرّت کی لہر دوڑ گئی اور اکبر نے خوش ہو کر فیضی کو ہفت ہزاری منصب عنایت کیا۔ نیاز فتحپوری صاحب لکھتے ہیں کہ دوسرا ہندی نژاد شاعر (خسرو اوّل تھے) جس نے ایرانی شاعروں سے اپنا لوہا منوا لیا تھا فیضی تھا۔ لیکن غالب فیضی کی فارسی دانی کے بارہ میں کہتے ہیں کہ" فارسی میں میاں فیض کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے[1]"۔ فیضی کی

---

[1] یادگارِ غالب۔

شاعری کے بارہ میں اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "خیر فیضی بھی نغز گوئی میں مشہور ہے، کلام اس کا پسندیدۂ جمہور ہے۔" غالب نے فیضی کی شاعری کے بارہ میں اپنی کوئی ذاتی رائے نہیں دی۔ مشہور ہے اور پسندیدۂ جمہور ہے کہہ کر ٹال گئے ورنہ ان کے دل کی بات اور ہے جس کو دوسروں کے اقوال سے ظاہر کرتے ہیں فیضی کی فارسی دانی کا مذاق یوں اُڑاتے ہیں[1]۔ لکھتے ہیں کہ شیدائے ہندی نے سیکروی حاجی محمد جان قدسی علیہ الرحمتہ کے ایک شعر پر اعتراض کیا۔ مرزا جلالائے طباطبائی علیہ الرحمتہ نے شیدا کو خط لکھا کہ تو زباں داں ہے یعنی مقلّد اور کاسہ لیس ایران ہے۔ حاجی محمد جان کے کلام کو سند پکڑ۔ تجھے کس نے کہا کہ اس سے لڑ۔ کیا تو نے سُنا نہیں جو عرفی و فیضی میں گفتگو ہوئی ہے اور موتمن الدولہ شیخ ابوالفضل کے روبرو ہوئی ہے۔ لغات فارسی اور تراکیب الفاظ میں کلام تھا۔ مولانا جمال الدین عرفی رحمتہ اللہ علیہ نے کہا کہ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اور نطق آشنا ہوا ہوں اپنے گھر کی بڑھیوں سے لغات فارسی اور ترکیبیں سُنتا آرہا ہوں۔ فیضی بولا کہ جو کچھ تم نے اپنے گھر کی بڑھیوں سے سیکھا ہے وہ ہم نے خاقانی و انوری سے اخذ کیا ہے۔ حضرت عرفی نے فرمایا کہ تقصیر معاف! خاقانی و

---

[1] عود ۲۵ ایک خط بنام احمد علی رامپوری میں غالب لکھتے ہیں کہ عرفی اکبر بادشاہ کے عہد میں تھا اور اس عہد میں قطع نظر اور اہل کمال سے ابوالفضل اور فیضی یہ دونوں شخص کیسے فاضل تھے اور پھر عرفی کا ممدوح حکیم ابوالفتح اس کا پایہ علم میں یہ تھا کہ ابوالفضل اور فیضی کو بھی خیال میں نہ لاتا تھا اگر یہ دونوں شعر عرفی کے غلط ہوتے یہ تینوں اس کی دھجیاں اُڑا ڈالتے (مکاتب غالب از عرشی)

انوری کا ماخذ بھی تو منطق گھر کی بڑھیوں کا ہے۔" (عود ہندی)

مگر جلالہ کا یہ کہنا ایسا ہی ہے جیسے میر انیس کے اس مصرعہ

رنگِ رُخِ کفّارِ عرب ہو گیا فق سے

پر نساخ نے اعتراض کیا تھا کہ "رنگ فق سے ہونا" محاورہ نہیں ہے "رنگ فق ہونا" محاورہ ہے آغا مہدی علی نے جواب دیا کہ "میر انیس جو کہہ دیں وہی محاورہ ہے" عبدالباری آسی محاکمہ کرتے ہوئے طنزاً کہتے ہیں کہ "سبحان اللہ کیا خوب جواب ہے!" غالب کو معلوم ہونا چاہیے کہ جب کوئی زبان داں ماہر زبان کسی اہل زبان کی زبان پر اعتراض کرتا ہے تو اس کی اس غلطی پر کرتا ہے جو خود اہل زبان کے محاورات اور استعمال کے خلاف ہوتی ہے۔ غالب تو ایرانیوں سے اس طرح مرعوب ہیں جیسا ایک طفل مکتب اپنے اُستاد سے مرعوب ہوتا ہے خواہ وہ اُستاد ناقص العلم ہی کیوں نہ ہو۔ یہ غالب کے احساس کمتری کا کمال ہے کہ وہ فارسی زبان کو تنہا آسمانی زبان اور ایرانیوں کو ایسی آسمانی ہستیاں سمجھتے تھے کہ وہ جو کہہ دیں وہی صحیح۔ سبحان اللہ کیا انداز فکر ہے۔

اگرچہ غالب بھی مرزا محمد حسن قتیل، احسان اللہ ممتاز، قاضی صادق خاں اختر، مرزا عبدالقادر بیدل، غیاث الدین رامپوری، ملک الشعرا فیضی، علامی ابوالفضل اور دوسرے فارسی گو ہندوستانی و پاکستانی شعرا و اہل قلم کی طرح سو فیصدی ہندوستانی تھے لیکن وہ اپنی فارسی دانی کے متعلق وہ خیال نہیں رکھتے تھے جو مذکورہ شعرا و اہل قلم کے متعلق رکھتے تھے۔ وہ اپنے کو اہل زبان اساتذہ کے برابر فارسی داں اور شاعر سمجھتے تھے۔ جب وہ

اپنے بارہ میں سوچتے تھے تو جلالہ اور عرفی کے اقوال بالائے طاق رکھ دیتے تھے۔ سُنئے وہ اپنے بارہ میں کیا ارشاد فرماتے ہیں۔

"فارسی کے ساتھ ایک مناسبت ازلی و سرمدی لایا ہوں' مطابق اہل فارس کے منطق کا بھی مزہ ابدی لایا ہوں۔ مناسبت خداداد' تربیت اُستاد' حسن و قبح ترکیب پہچاننے' فارسی کے غوامض جاننے لگا (اردوئے معلیٰ)" "تاکہ لوگ یہ نہ کہیں کہ خود ہندی نژاد ہونا اور دوسرے ہندی نژادوں کی زباندانی اور شاعری کو مسلّم نہ سمجھنا اور اپنی زباندانی کا علم بلند کرنا کیسی بات ہے۔ عرض ہے کہ میرا خاندان ماوراءالنہر کا تھا۔ میرے والد دہلی میں پیدا ہوئے اور میں آگرے میں پیدا ہوا۔ میں اپنے کو اہل زبان ہرگز نہیں کہتا۔ میری زباندانی خُدا کی تین عنایتوں کی وجہ سے ہے۔ اول سلامت طبع جو غلطی قبول نہیں کرتی اور سوائے سچائی کے کسی سے مطمئن نہیں ہوتی۔ دوم طبیعت کا سچائی کے ساتھ فارسی سے لگاؤ۔ سوم ہرمزد کی صحبت کہ جن سے دو سال تک کمال و دانش اکتساب کیا۔ اس کے بعد قدیم کتابوں کا مطالعہ کیا۔ چودہ سال کی عمر میں ایک اُستاد ملا۔ باون سال شعر گوئی میں سر مارا۔ (قاطع برہان)"

"بندہ ہندی مولد و پارسی زبان ہے۔ (عودِ ہندی)"

اساتذہ ایران کی طرح مستند فارسی میں اعلیٰ شاعری کرنے کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ "اگرچہ طبیعت ابتدا سے نادر اور برگزیدہ خیالات کی جویا تھی لیکن آزادہ روی کے سبب زیادہ تر ان لوگوں کی پیروی کرتا رہا جو راہ

صواب سے نابلد تھے۔ ان لوگوں نے جو اس راہ میں پیشرو تھے دیکھا کہ باوجودیکہ ان کے ہمراہ چلنے کی قابلیت رکھتا ہوں اور پھر بھٹکتا پھرتا ہوں ان کو میرے حال پر رحم آیا اور انھوں نے مجھ پر مربیانہ نگاہ ڈالی۔ شیخ علی حزیںؒ نے مسکرا کر میری بے راہ روی مجھ کو بتائی، طالب آملیؒ اور عرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا مادہ جو میرے اندر تھا اس کو فنا کر دیا، ظہوریؒ نے اپنے کلام کی گہرائی سے میرے بازو پر تعویذ اور میری کمر پر زاد راہ باندھا اور نظیریؒ نے اس خاص روش پر مجھ کو چلنا سکھایا۔ اب اس گروہ والا شکوہ کے فیض تربیت سے میرا کلک چال میں کبک ہے تو راگ میں موسیکار، جلوے میں طاؤس تو پرواز میں عنقا۔ (تقریظ دیوان فارسی از قلم غالب)"

چودھری عبدالغفور سرور کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "ہندوستان کے سخنوروں میں امیر خسرو دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے سوا کوئی مسلم الثبوت اُستاد نہیں۔" غالب کی تمام تقاریر و بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ہندو پاکستان کے ارباب کمال میں صرف دو شاعروں کو مستند فارسی داں اور فارسی شاعر مانتے تھے۔ ان میں سے ایک امیر خسرو تھے اور دوسرا وہ خود تھے۔ فیضی کے علاوہ باقی سب کو جہلائے فارسی بلکہ غول بیابانی سمجھتے تھے۔ فیضی جاہل نہ تھے مگر مستند بھی نہ تھے۔

اسلہ ایرانی تذکرہ نگاروں کے تذکروں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب شعر ایران میں مقبول تو کیا مشہور بھی نہیں۔

نقادوں نے غالب کے ان خیالات کا جو وہ دوسروں کے اور اپنے بارہ میں رکھتے تھے ناقدانہ جائزہ لیا ہے۔ اس سلسلے میں غالب کے تضاد کو سامنے لایا گیا ہے۔

قتیل کی فارسی دانی کی تنقیص کی غرض سے غالب کہتے ہیں کہ "قتیل کے علم فارسی کا ماخذ ان لوگوں کی تقریر ہے جو نواب سعادت علی خاں کے وقت میں ممالک مغربی کی طرف سے لکھنؤ میں آئے اور ہنگامہ آرا ہوئے پیشتر سادو کشمیری، کابلی، قندھاری، ہراتی تھے۔ احیاناً کوئی عامہ اہل ایران سے ہو۔ مانا کہ عظمائے ایران میں سے کوئی ہوگا۔ مگر تقریر اور ہے اور تحریر اور ہے۔ اگر تقریر بعینہٖ تحریر میں آئے تو خواجہ بقراط، شرف علی یزدی اور ملّا واعظ الکاشفی اور طاہر وحید یہ سب نثر میں کیوں خون جگر کھاتے۔ وہ سب طرح کی نثریں جو لالہ دیوانی سنگھ قتیل نے بہ تقلید اہل ایران لکھی ہیں خ رقم فرماتے۔" عرفی اور فیضی کی بحث میں غالب، عرفی اور دیگر شعرائے ایران کا ذکر نہایت احترام کے ساتھ اور بالکل ننگ اسلاف بن کر فیضی کا ذکر حقارت کے ساتھ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ لغات فارسی اور تراکیب الفاظ میں کلام تھا۔ مولانا جمال الدین عرفی رحمتہ اللہ علیہ نے کہا کہ میں نے جب سے ہوش سنبھالا اور نطق آشنا ہوا اپنے گھر کی بڑھیوں سے لغات فارسی اور تراکیب الفاظ سنتا چلا آرہا ہوں۔ فیضی بولا کہ جو کچھ تم نے اپنے گھر کی بڑھیوں سے سیکھا وہ میں نے خاقانی اور انوری سے سیکھا۔ عرفی نے فرمایا مگر خاقانی اور انوری کا ماخذ بھی ان کے گھر کی بڑھیوں کی بولی ہے۔

یہاں غالب میں یہ تضاد پایا جاتا ہے کہ قتیل کے سلسلے میں تقریر کو رد کرتے ہیں اور فیضی کے معاملے میں تحریر کو رد کرتے ہیں۔ غالب صاحب بتائیں کہ کیا عرفی، خاقانی اور انوری کے گھر کی بڑھیاں وہی زبان بولتی تھیں جس زبان میں انھوں نے قصیدے اور غزلیں لکھی ہیں۔ پھر تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کلام درحقیقت ان شاعروں کے گھر کی بڑھیوں کا ہے لیکن انھوں نے اپنے اپنے نام سے منسوب کر دیا۔ غالب صاحب تو خالی میدان میں یہ کہہ کر نکل گئے کہ جو عرفی، خاقانی اور انوری روز تولد سے اپنے گھر کی بڑھیوں سے فارسی لغات اور ترکیب الفاظ سنتے چلے آئے ہیں ان کے مقابلے میں فیضی اور ابوالفضل فارسی کیا جانیں۔ لیکن اگر فیضی اور ابوالفضل اس وقت موجود ہوتے تو غالب صاحب سے پوچھتے کہ کیا عرفی، خاقانی اور انوری کے گھر کی بڑھیاں یہ فارسی بولتی تھیں۔

زد نفس سر بمہر صبح ملمع نقاب
خیمۂ روحانیاں گشت معنبر طناب — خاقانی

زیبد زمانہ را کہ بود مہر مدح او
خامہ شہاب، دودہ شب، دفتر آفتاب — انوری

ز ترتیبِ نظامِ آفرینش جو نہ آگہ
حوادث را ز تاثیرِ نجومِ آسماں بینی — عرفی

خاقانی کا کلام سمجھنے کے لئے خود اہل زبان طلبہ کو کلام خاقانی کی شرح کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن خاقانی کے گھر کی بڑھیوں کی زبان سمجھنے کے لئے ان کو شرح کی ضرورت نہیں پڑتی کیونکہ وہ بڑھیاں تو "نون شوم خوردم" بولتی تھیں (نان شام خوردم) فارسی شعر و ادب ایران کی بڑھیوں کی زبان میں نہیں ہے۔ خود عرفی کا کلام ان کے گھر کی بڑھیوں کی زبان میں نہیں ہے۔ اس طرح غالب کے گھر کی بڑھیاں یہ اُردو نہیں بولتی تھیں۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا | کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
کاوِ کاوِ سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ | صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا
آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے | مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا
جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے | سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا
بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرِ پا | موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

اور جب غالب، حزیں، صائب، کلیم، عرفی، ظہوری اور نظیری کا مطالعہ کر کے مستند فارسی داں اور مسلم الثبوت استادِ سخن ہو سکتے ہیں تو دوسرے کیوں نہیں ہو سکتے۔ لیکن غالب اپنے بارہ میں کہتے ہیں کہ بندہ (یعنی غالب) ہندی مولد و پارسی زبان ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں کہ میرے مورث علی ترک تھے اور ان کی زبان ترکی تھی۔ میرے والد دہلی میں پیدا ہوئے۔ غالب کے نانا اور والدہ خاص آگرے کے باشندہ تھے۔ غالب کی مادری زبان اُردو تھی۔ اب غالب صاحب پارسی زبان کیوں کر ہو گئے۔ ان کا فارسی داں ہونا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن ان کا پارسی زبان ہونا سمجھ میں نہیں آتا۔ علاوہ

اس کے اگر ایک ہندوستانی تبریزی زادہ فارسی داں نہیں ہو سکتا تو ایک ہندوستانی ترک زادہ کیونکر فارسی داں ہو سکتا ہے۔ اگر مناسبت طبع، سلامت فکر اور تتبع اہل زبان سے مستند فارسی داں بنا جا سکتا ہے تو غالب کی تخصیص کیوں ہے۔ غالب کے سوا دوسرے کیوں نہیں مستند فارسی داں بن سکتے ہیں۔ کیا روز ازل میں ان تین چیزوں کو قضا و قدر نے غالب کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔

فارسی دانی میں اہل زبان کی طرح کمال حاصل کرنے کے لئے غالب نے تین شرطیں بتائی ہیں مناسبت طبع، سلامت فکر اور تتبع اہل زبان یعنی اہل زبان سے فارسی زبان کے حقائق و معارف سیکھنا۔ غالب ہند و پاکستان کے فارسی گو شاعروں اور باکمالوں کی فارسی دانی کو اس لئے ناقص اور پوچ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے کسی اہل زبان سے فارسی نہیں سیکھی۔ لیکن غالب اپنے کو فارسی دانی میں اس لئے منفرد اور مسلم الثبوت اُستادِ سخن سمجھتے ہیں کہ انھوں نے یگانۂ روزگار ایرانی فاضل مُلّا عبدالصمد (ہرمزد) سے فارسی زبان کے حقائق و معارف سیکھے تھے۔ مگر مُلّا عبدالصمد ایک مجہول شخص ہے۔ بقول غالب مُلّا عبدالصمد ایک نو مسلم ایرانی تھا۔ بغرض سیاحت ہندوستان آیا اور دو برس تک غالب کے ساتھ آگرے میں رہا۔ عربی و فارسی کا متبحر عالم تھا۔ عقل و ذہانت میں اپنے وقت کا بزرجمہر اور جاماسپ تھا۔ غالب لکھتے ہیں کہ میں نے ایام دالبستان نشینی میں شرح مأۃ عامل پڑھی۔ بعد کو لہو و لعب اور آگے بڑھ کر فسق و فجور اور عیش و عشرت میں منہمک ہو گیا۔

فارسی زبان سے لگاؤ اور شعر و شاعری کا ذوق فطری تھا۔ ناگاہ ایک شخص
(یعنی ہرمزد ثم عبدالصمد) ساسان پنجم کی نسل میں سے معہذا منطق و فلسفہ میں
مولوی فضل حق مرحوم کا نظیر اور مومن موحد و صوفی صافی تھا۔ میرے شہر
(یعنی آگرے) میں وارد ہوا اور لطائف فارسی بحت (یعنی فارسی بے آمیزش
عربی) اور غوامض فارسی آمیختہ بہ عربی سے میرے حالی ہوئے۔ سونا کسوٹی
پہ چڑھ گیا۔ ذہن معوج تھا۔ زبان دری سے پیوند اور اُستاد بے مبالغہ،
جاماسپ عہد اور بزرجمہر تھا۔ اس زبان کی دلنشینی خاطر نشان ہوئی
(خط غالب۔ تذکرہ غالب مرتبہ غلام رسول مہر)

غالب نے عبدالصمد کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور فارسی آموزی
کے لئے اس کے آگے زانوے تلمذ تہ کیا۔ عبدالصمد نے غالب کو فارسی زبان و ادب
کے حقائق و معارف سے اس حد تک آشنا کر دیا کہ غالب ایران کے مشاہیر
اہل علم و ادب کے برابر مستند فارسی داں بن گئے۔ غالب نے مُلّا عبدالصمد
کا ذکر اتنی مرتبہ اور اس اس انداز سے کیا ہے کہ اس میں کوئی شبہہ باقی
نہیں رہتا کہ عبدالصمد حقیقی آدمی تھا لیکن جب غالب نے فارسی شعر و نثر میں
ایک اعلیٰ مقام حاصل کر لیا اور اپنے وقت کے عظیم ترین فارسی داں بن گئے
تو ان کو مُلّا عبدالصمد ان کے دل و دماغ کی عظمت میں ایک بہت بڑا
دھبہ نظر آنے لگا۔ اب وہ اس دھبہ کو مٹانا چاہتے تھے۔ اس لئے یار دوستوں
سے کہنے لگے کہ "عبدالصمد ایک فرضی نام ہے، کیونکہ لوگ مجھے بے اُستاد کہتے
تھے، ان کا منھ بند کرنے کے لئے میں نے ایک فرضی اُستاد گڑھ لیا" لیکن

باوجود اس کے مولانا حالی یادگار غالب میں لکھتے ہیں کہ "اگرچہ کبھی کبھی مرزا کی زبان سے بھی سنا گیا ہے کہ مجھ کو مبدأ فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں اور مُلّا عبدالصمد ایک فرضی نام ہے، کیونکہ لوگ مجھے بے استادا کہتے تھے۔ ان کا منھ بند کرنے کے لئے میں نے ایک فرضی اُستاد گڑھ لیا، مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ عبدالصمد فی الواقع ایک پارسی نژاد آدمی تھا اور غالب نے کم و بیش اس سے فارسی سیکھی۔" آگے چل کر نواب مصطفےٰ خاں کا یہ قول بھی نقل کرتے ہیں کہ "عبدالصمد ایران لوٹ جانے کے بعد بھی غالب کو محبت آمیز خط لکھا کرتا تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ لکھا کہ اے عزیزی! چہ کسی کہ باہمہ آزدیہا بخاطر گاہ گاہ میگذری۔" مولانا حالی کے بیان، شیفتہ کے قول اور غالب کے بہت سارے واضح تحریری بیانات سے ثابت ہوتا ہے کہ مُلّا عبدالصمد حقیقی آدمی تھا۔ لیکن قاضی عبدالودود صاحب نے اپنے مضمون "غالب کا فرضی اُستاد" میں طویل بحثوں سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عبدالصمد کا کوئی خارجی وجود نہ تھا۔ غالب کے ایک معاصر سعادت علی اپنی کتاب "محرق قاطع" میں عبدالصمد کا وجود تسلیم نہیں کرتے۔ مگر مالک رام صاحب نے اپنے مضمون "مُلّا عبدالصمد، اُستاد غالب" میں عبدالصمد کا خارجی وجود ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن امر واقعہ ہے کہ غالب نے کھچڑی پکائی ہے۔ میرا قیاس ہے کہ عبدالصمد حقیقی آدمی ضرور ہوگا۔ غالب کے ساتھ کچھ روز رہا بھی ہوگا۔ غالب نے بصورت تبادلۂ خیال اس کے ساتھ فارسی الفاظ و محاورات پر گفتگو بھی کی ہوگی۔ مگر وہ کوئی متبحر عالم نہ ہوگا۔ ایک معمولی عربی و فارسی جاننے والا ہوگا۔ غالب نے اس کے

ایرانی اور فارسی کا اہل زبان ہونے سے گمراہ کن فائدہ اُٹھانے، ہند و پاکستان کے اہل کمال پر رُعب جمانے اور اپنے کو اہل زبان کے برابر مستند فارسی داں منوانے کے لئے عبدالصمد کو ذرّے سے آفتاب بنا دیا۔ مدّعا یہ بتانا تھا کہ جس کا اُستاد ایسا ہوگا اس کا شاگرد کیسا ہوگا۔ لہٰذا عبدالصمد حقیقی آدمی تو ضرور رہو گا لیکن اس کی عالمانہ عظمت، جلیل الشان شخصیت اور خاندانی جاہ و جلال یقیناً فرضی ہے۔ غالب نے فقط مغالطہ میں ڈالنے کے لئے قاطع برہان اور تیغ تیز میں عبدالصمد کے حوالے بھی دئے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "یہ راز مجھ سے تحت ہر مزد ثم مولانا و اولنا حضرت مولوی عبدالصمد علیہ الرحمتہ نے کہا ہے، دوسرا کوئی نہیں جانتا۔" ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ "رہے صمد کے معنی، جب مولانا عبدالصمد قدس سرّہٗ نے کہ وہ علم عربی کا فاضل متبحر تھا" اروند" کے وہ معنی شرح کئے کہ جس کا ترجمہ ہندی زبان میں "ٹھوس" کا لفظ ہوتا ہے اور بتایا کہ عربی میں ان معنیوں میں لفظ "صمد" ہے۔ لیکن ایران کے اہل کمال کی تاریخ میں مُلّا عبدالصمد جیسے صاحب علم و کمال کا نام و نشان نہیں ملتا۔ خود غالب نے اپنے دیوان فارسی کی تقریظ میں عرفی، طالب آملی، علی حزیں، ظہوری اور نظیری کو جوان سے بہت پہلے جنت الفردوس کو رخصت ہو چکے تھے اپنا اُستاد مانا ہے۔ لیکن پوری تقریظ میں عبدالصمد کا نام تو کیا اشارہ تک نہیں کیا۔ برہان قاطع کے مولف کے سلسلے میں تیغ تیز میں موید برہان کے مولف احمد علی سے کہتے ہیں کہ "اچھا مولوی صاحب اگر اس کو (یعنی جامع برہان محمد حسین متخلص بہ برہان کو) تبریزی مولد کہتے ہیں اور (وہ) صاحب تخلص

تھا تو اس کا دیوان دکھائیں۔ شاہجہاں کا عہد تھا۔ محمود غزنوی کے وقت کے شعرا کے کلام جابجا موجود ہوں اور شاہجہاں کے زمانے کے شاعر کے اشعار نہ پائے جائیں۔ دیوان نہ سہی، کسی تذکرے میں اس کے کلام کا پتہ دیں۔ یوں ہو سکتا ہے کہ یہ شخص شعر کہتا ہوگا۔ مگر پوچ اور واہی۔ ان اشعار کی تدوین کیا ہو اور ان کو تذکرے میں کون لکھے"۔ غالب نے برہان کی شاعری کی بحث خواہ مخواہ چھیڑی ہے۔ کیونکہ نہ برہان نے اپنے کو شاعر کہا ہے اور نہ احمد علی نے ان کو شاعر لکھا ہے۔ خیر برہان کے اشعار کسی تذکرے میں نہ سہی، ان کی مرتبہ بسوط فرہنگ تو موجود ہے۔ مگر ان کے ملّا عبد الصمد کا پتہ دینے والا سوائے انھیں کے اور کچھ نہیں۔ آخر اس کے متبحر عالم، جاماسب عہد، بزرجمہر اور منطق و فلسفہ میں مولوی فضل حق خیرآبادی کا نظیر ہونے کا ثبوت کیا ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ لہٰذا جس بنا پر برہان کو بے حقیقت ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے اس بنا پر یہ عبد الصمد بے حقیقت ثابت ہوتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ عبد الصمد ایرانی ضرور تھا مگر بے حقیقت تھا۔ غالب نے اسے عظیم الشان ایرانی بنا دیا تاکہ اس کی اُستادی کی دھونس جما کر اپنے مخالفین کا مُنھ بند کر سکیں۔ لہٰذا لوگوں کا مُنھ بند کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ لوگ انھیں بے اُستادا نہ سمجھیں بلکہ انھیں اہل زبان کے برابر مستند فارسی داں اور اُستاد سخن مان لیں۔

عبد الصمد کی اُستادی کا افسانہ گڑھ کر غالب اپنے زعم میں ہندی

سولد ہونے کے باوجود پارسی زباں بن بیٹھے۔ لیکن انھیں یہ بھی خیال آیا باعتبار فارسی ایرانی بننے کے لئے ایرانیوں جیسا لسانی تعصب اور دماغ داری بھی ضروری ہے۔ یعنی جب عرفی بننا ہے تو کسی فیضی سے لڑنا بھی لوازمات عرفیت میں سے ہے۔ لہٰذا انھوں نے ایرانیوں کی یہ صفت بالخصوص شیخ علی حزیں سے اڑالی جو فارسی گویان ہند کو" زاغان ہند، پوچ گویان ہند اور جاہلان ہند" کہا کرتے تھے۔ حزیں کا تکیہ کلام تھا کہ" فارسی وہ کیا جانیں" لہٰذا" ہیچ و پوچ" اور" فارسی وہ کیا جانیں" یہ دو غالب کے مرغوب فقرے تھے اور اس طرح زبان پر چڑھے ہوئے تھے کہ بغیر ان فقروں کے وہ کسی ہندوستانی فارسی شاعر کا نام زبان سے ادا نہیں کر سکتے تھے۔

غالب اپنے اور امیر خسرو کے سوا کسی ہندوستانی یا پاکستانی فارسی داں کو فارسی داں نہیں مانتے تھے بلکہ دھڑے سے سب کو پوچ گو اور فارسی مداں سمجھتے تھے۔ لیکن یہ ان کی ہٹ دھرمی کا کمال ہے کہ جو فارسی دانان ہند و پاکستان ان کے شاگرد اور معتقد تھے ان کی تعریف میں مبالغہ کرتے تھے۔ مرزا تفتہ سے کہتے ہیں کہ میاں تفتہ! ہزار آفریں! کیا اچھا قصیدہ لکھا ہے۔ واہ واہ! چشم بد دور! تسلسل معنی، سلاست الفاظ۔ ایک مصرعہ میں تم کو محمد اسحاق شوکت بخاری سے توارد ہوا ہے۔ یہ بھی محل فخر و شرف ہے کہ جہاں شوکت پہنچا وہاں تم پہنچے۔ وہ مصرعہ یہ ہے۔ چاک گردید از جیب بداماں رفتم

(اُردوئے معلٰی)

خواجہ غلام غوث بے خبر میر منشی کو لکھتے ہیں کہ "رامپور میں تھا کہ اودھ اخبار میں حضرت کی غزل نظر افروز ہوئی۔ کیا کہنا ہے۔ ابداع اس کو کہتے ہیں۔ جدت طرازی اس کا نام ہے جو ڈھنگ تازہ نوایان ایران کے خیال میں نہ گزرا تھا وہ تم بروئے کار لائے" (عود ہندی)

نواب انوار الدولہ سعد الدین خان بہادر شفق کو لکھتے ہیں کہ غزلوں کو برسوں سے پڑھ رہا ہوں اور وجد کر رہا ہوں۔ خوشامد میرا شیوہ نہیں ہے' جو ان غزلوں کی حقیقت میری نظر میں ہے وہ مجھ سے سن لیجئے اور میرے داد دینے کی داد دیجئے' مولانا (میر امجد علی متخلص بہ) قلق نے متقدمین یعنی امیر خسرو وسعدی و جامی کی روش کو سرحد کمال کو پہنچا دیا اور میرے قبلہ وکعبہ مولانا شفق اور مولانا ہاشمی اور مولانا عسکری متاخرین یعنی صائب وکلیم وقدسی کے انداز کو آسمان پر لے گئے ہیں۔ اگر تکلف اور تملق سے کہتا ہوں تو مجھے ایمان نصیب نہ ہو (عود ہندی)

انھیں کو ایک اور خط میں لکھتے ہیں کہ "ہائے کیا غزل لکھی ہے قبلہ! آپ فارسی کیوں نہیں کہا کرتے" (عود ہندی)

ایک صاحب فرماتے ہیں کہ غالب شاگردوں کی تعریف حوصلہ افزائی کے لئے کرتے تھے اور اعتراض ان کے کلام پر کرتے تھے جن کی تقلید سے گمراہی پھیل سکتی تھی۔ لیکن تعریف وتنقیص کی نوعیت اور لب ولہجہ بتا رہا ہے کہ تعریف زیادہ تر تکلف وتملق سے اور تنقیص ہمیشہ حسد اور کوتاہ نظری سے کی جاتی تھی۔ غالب کے تمام بیانات وتقاریر سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ خود بینی اور

ہٹ دھرمی میں عدیم المثال تھے۔ ان کا کوئی اصول نہ تھا۔ وہ اپنے دعویٰ
کی حمایت میں جو اصول پیش کرتے تھے دوسروں کے معاملے میں قبول نہیں
کرتے تھے۔ بلکہ ان کو یاد بھی نہیں رہتا تھا کہ کس موقع پر کون سا اصول پیش
کر چکے ہیں۔ اب ذرا ان کے سوچنے کے انداز پر عبدالمالک آروی صاحب کا
تبصرہ ملاحظہ فرمائیے۔ لکھتے ہیں کہ

"عقد ثریا میں میں انسان بیدل، آرزو، قتیل، واقف، فاخرا در مظہر
کے حالات و کلام کا مطالعہ کرتا ہے اور وہ ہندوستانیوں کے اکتسابات شعر
(غالباً تخلیقات شعر) وادب پر فخر کرتا ہے لیکن جب عود ہندی میں غالب
کی لن ترانیاں دیکھتا ہے تو اس کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں۔ ایک طرف
کلمات الشعرا، سرو آزاد، عقد ثریا، گل رعنا، سفینۂ خوشگو، مجمع النفائس
رکھیے اور دوسری طرف مرزا غالب کی طنزیات پر غور کیجیے کہ غالب جیسے
فرزندان ہند کی ذہنیت نے شعر و ادب کے ذریعہ ملک و ملت کے مفاد
کو کس حد تک نقصان پہنچایا ہے۔ (آگے چل کر لکھتے ہیں کہ) اب آیئے
کسی قدر تفصیل کے ساتھ مرزا کے تاثرات پر بحث کریں۔ مرزا صاحب
چودھری عبدالغفور سرور کے نام خط میں لکھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ فارسی
کی تکمیل کے واسطے اصل الاصول مناسبت طبیعت کی ہے۔ پھر تتبع
اہل زبان نہ کہ اشعار قتیل و واقف و شعرائے ہندوستان کہ یہ اشعار
سوائے اس کے کہ ان کو موزونیٔ طبع کہیے اور کسی تعریف کی شایان شان
نہیں ہیں۔ نہ ترکیب فارسی نہ نزاکت معانی۔ ہاں الفاظ فرسودہ وعامیانہ

جو اطفال دبستاں جانتے ہیں اور متصدی نثر میں درج کرتے ہیں وہ الفاظ فارسی یہ لوگ نظم میں خرچ کرتے ہیں۔ جب رودکی وعنصری و خاقانی و رشید وطواط اور ان کے امثال ونظائر کا کلام بالاستیعاب دیکھا جائے اور ان کی ترکیبوں سے آشنائی بہم پہنچے اور ذہن اعوجاج کی طرف نہ لے جائے تب آدمی جانتا ہے کہ فارسی یہ ہے (عود ہندی) مرزا صاحب نے ایک سانس میں ہندوستانی فارسی کے سارے ذخیرے کو زباندانی اور نزاکت معنی کے اعتبار سے بے مایہ کہہ دیا۔ اس کے ساتھ فارسی کی تکمیل کے لئے تتبع کلام اہل زباں اور مناسبت طبیعت کو لازمی ٹھہرایا ہے۔ آگے چل کر جب مرزا صاحب نے خود ہی قتیل و واقف اور شعرائے ہند کی موزونی طبع کو تسلیم کر لیا تو مناسبت طبیعت کی بحث ختم ہو جاتی ہے۔ اور اگر مناسبت طبیعت سے ان کی مراد شعریت اور ادبیت کے علاوہ کچھ اور ہے تو اس اہمال سرائی اور ایہام طرازی کی تشریح بھی کرنی چاہئے تھی۔ رہ گیا تتبع کلام اہل زباں تو اس کے متعلق تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ قتیل و واقف نے کس اہتمام اور کاوش کے ساتھ حصول زباں اور تتبع اہل زباں کی طرف توجہ کی۔ قتیل نے مرزا محمد باقر شہید اصفہانی کے ظل عاطفت میں تربیت پائی۔ شہید نے بقول عقد ثریا قتیل کے لئے قتیل تخلص پسند کیا۔ واقف کے متعلق بھگوان داس کی شہادت سنئے۔ سفینۂ ہندی (مخطوطہ پٹنہ لائبریری) میں لکھتے ہیں کہ واقف خود کہتے ہیں کہ "شروع میں میں نے بندرابن (داس) خوشگو اور (شاہ فقیر اللہ) آفریں لاہوری سے اصلاح لی۔ بالآخر ان کی اصلاح مجھے پسند

نہ آئی۔ لہٰذا میں نے دیوانِ سعدی و خسرو پیش نظر رکھا اور مشق سخن کی (اردو ترجمہ)" واقف نے سعدی و خسرو کا کلام پیش نظر رکھا اور مشق کی۔ سعدی تو مسلمات میں سے ہیں رہ گئے خسرو، تو ان کی قابلیت اور عظمت اور ان کی زباندانی اور نکتہ سنجی کا اعتراف مرزا صاحب کو بھی ہے۔ جہاں تک اصول انتقاد کا تعلق ہے مرزا صاحب کے معیار پر قتیل اور واقف پورے اُترتے ہیں۔ پھر بھی وہ ہندوستانی فارسی شعرا کو ہیچ و پوچ بتائے جاتے ہیں۔ اب آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ ہم ان ترہات کو مرزا صاحب کی زباندانی کا نتیجہ سمجھیں یا زبان درازی کا (غالب۔ تصویر کا دوسرا رُخ)"

غالب کے بیان سے صاف طور پر واضح ہے کہ انھوں نے موزونیٔ طبع اور مناسبت طبیعت کے الفاظ کن معنوں میں استعمال کئے ہیں۔ موزونیٔ طبع کا مطلب ہے کہ دماغ اس قابل ہے کہ الفاظ کو اس طرح مربوط کر سکے کہ شعر وزن کے اعتبار سے بے بحر نہ ہو اور مناسبت طبیعت کا مطلب یہ ہے کہ طبیعت کو شاعری سے فطری لگاؤ ہو۔ کیونکہ اگر فطری لگاؤ نہ ہوگا تو طبیعت کے تقاضے کی بجائے کاوش دماغی سے شعر کہا جائے گا اور جو شعر کاوش دماغی کا نتیجہ ہوگا وہ نقطے بیٹھے تلے الفاظ کا ٹھونس ٹھانس قسم کا اجتماع ہوگا۔ غالب کہتے ہیں کہ قتیل اور واقف کے اشعار بے بحر تو نہیں ہیں مگر نپے تلے الفاظ کا ٹھونس ٹھانس ہیں۔ اور الفاظ بھی وہ جو شعری اور علمی معیار سے گرے ہوئے ہیں۔ غالب کے اس خیال کی تردید کے لئے مذکورہ شاعروں کے محاسن کلام سے نقادانہ بحث کرنی ہوگی۔ صرف محولہ بالا تذکروں کے حوالے کافی نہیں۔

کیونکہ یہ سب کے سب تذکرے تحسینی تذکرے ہیں تنقیدی نہیں۔ بہرحال جہاں تک فارسی دانی اور مہارت فارسی کا تعلق ہے غالب ہند و پاکستان کے تمام اہل کمال و شعرا کو جہلائے فارسی اور اپنی ذات والا صفات کو اہل زبان کے برابر مستند و مسلم الثبوت تصور کرتے تھے۔ لیکن مرزا محمد حسن قتیل اور مولانا نورالعین واقف کے معتقدین کے علاوہ اور بھی ارباب علم تھے جو غالب کو قتیل سے کم مستند مانتے تھے اور بعض اوقات خود غالب کے کلام کو قتیل کے اصول اور تحقیقات کی روشنی میں پرکھتے تھے۔ علاوہ اس کے بعض غالب کے معتقدین بھی قتیل اور واقف کی شاعرانہ عظمت کے قائل تھے اور ان کا احترام کرتے تھے۔ یہ بات غالب کے لئے غیظ و غضب اور بغض و نفرت کا باعث ہوئی۔ چنانچہ کلکتہ مدرسہ یا مدرسہ عالیہ کلکتہ یا مدرسہ کمپنی کے مشاعرے میں اسی بنا پر غالب پر اعتراض ہوئے۔ اس مشاعرے کے متعلق غالب کے متعدد تحریری بیانات ملتے ہیں۔ ہم انھیں بیانات کی روشنی میں اس مشاعرے کی مفصل داستان سُناتے ہیں۔

غالب اپنی خاندانی پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں انھیں کے قول کے مطابق ۱۸۳۰ء اور غلام رسول مہر صاحب کی تحقیق کے موافق ۱۸۲۸ء میں کلکتہ آئے۔ لیکن ان کے کلکتہ آنے سے پہلے کچھ لوگ ان کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے تھے۔ کلکتہ آتے ہی ایک شخص نے اہالیان شہر میں شہرت دی کہ اس شخص نے (یعنی غالب نے) جو ابھی ابھی دہلی سے کلکتہ آیا ہے اپنا نام اور تخلص دونوں بدل ڈالا ہے (یعنی محمد اسداللہ خاں سے مرزا اسداللہ خاں اور اسد سے

غالب ہوگیا ہے) اس کا مطلب ہوا کہ اس نو وارد شخص کا اعتبار نہ کیا جائے اور افضل بیگ غالب کے خلاف طرح طرح کے پروپگنڈے کرنے لگا۔ افضل بیگ کلکتے میں اکبر شاہ ثانی کا وکیل تھا۔ خواجہ حاجی کا سالا تھا اور احمد بخش خاں نے حاجی کو غالب کے چچا نصراللہ بیگ کا رشتہ دار بتا کر غالب کی پنشن میں شریک قرار دیا تھا۔ غالب کے مقدمے میں ایک درخواست یہ بھی تھی کہ خواجہ حاجی ان کے چچا کا کوئی رشتہ دار نہیں ہے اور اس کی شرکت غلط ہے (مجموعۂ دہلی اور غالب۔ سہ ماہی اردو کراچی غالب نمبر ۱۹۶۹ء)

افضل بیگ اہل سنت میں یہ پروپگنڈہ کرتا تھا کہ غالب رافضی اور غالی شیعہ ہے اور شیعوں میں کہتا تھا کہ وہ ملحد اور زندیق ہے۔ افضل بیگ کا ایک دوست عبدالکریم تھا جو میر منشی دفتر خانۂ فارسی تھا۔ دونوں ساتھ رہتے تھے۔ افضل بیگ نے ایک بات اور کی۔ شاعروں میں مشہور کر دیا کہ غالب قتیل کو برا بھلا کہتا ہے اور شعرائے کلکتہ کو نظر میں نہیں لگاتا۔ افضل بیگ کا یہ پروپگنڈہ کامیاب ہوا۔ تمام لوگ غالب سے بدظن ہوگئے اور ایک گروہ ان پہ اعتراض کرنے لگا (سہ ماہی اردو کراچی ۱۹۶۹ء غالب نمبر)

اس وقت کلکتہ میں مدرسہ کمپنی یعنی کلکتہ مدرسہ میں ہر انگریزی مہینے کے اول اتوار کو ایک ادبی نشست اور مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ فارسی شعرا کافی تعداد میں شریک ہوتے تھے باذوق ایرانی تاجر بھی شریک ہوتے تھے۔ مولوی عبدالکریم کے ایک رشتہ دار نے خاص طور پر غالب کی تذلیل و تخریب کے مقصد سے ایک مشاعرہ کرایا۔ اردو شعرا کو اردو مصرعہ طرح اور فارسی شعرا کو فارسی مصرعہ

طرح طبع آزمائی کے لیے دیا گیا۔ لیکن غالب کو دونوں ہی طرحیں دی گئیں۔ اتوار ۸ جون کو مشاعرہ ہوا۔ غالب نے اردو اور فارسی میں غزلیں پڑھیں۔ سامعین بہت محظوظ ہوئے۔ چند منصف مزاج لوگوں نے کہا کہ "ہر گرا ایں مایۂ فصاحت، قتیل چہ بلاست؟ بل اگر بزرگ گذشتگان دگر چوں امیر و بیدل و امثال اینہا ناز کنند می رسدش و می زیبد" مشاعرہ تو غالب کی تذلیل کی غرض سے منعقد کیا گیا تھا مگر غالب کے اظہار کمال اور شہرت کا ذریعہ بن گیا۔ مخالفین کے اندر مخالفت کا جذبہ اور بڑھ گیا اور وہ موقع کی تلاش میں رہنے لگے۔ مگر غالب کہتے ہیں کہ ان کو مخالفین کی ہنگامہ آرائی کی کوئی پروا نہ تھی۔ ع

آواز سگاں کم نکند رزق گدا را (ماثر غالب۔ قاضی عبدالودود)

خاص غالب کے لئے ایک دوسرا مشاعرہ مدرسہ مذکور میں پھر منعقد کیا گیا۔ غالب کی شخصیت کی کشش کی وجہ سے پانچ ہزار آدمی شریک مشاعرہ ہوئے۔ اس مشاعرہ میں غالب نے حکیم ہمام کی زمین میں یہ غزل پڑھی۔

تا کیم دود شکایت ز بیاں برخیزد ۔۔۔ بزن آتش کہ شنیدن ز میاں برخیزد

می رمی از من و خلقے بگمانست ز تو ۔۔۔ بے محابا شو و بنشیں کہ گماں برخیزد

گر وہم شرح عتابیکہ بدلہا داری ۔۔۔ دود از کارگہ شیشہ گراں برخیزد

یا قدت سرو چہ شخصیت کہ ناگہ یکبار ۔۔۔ بے خود از جا ز ہجوم خفقاں برخیزد

بچہ گیرند عیار ہوس و عشق دگر ۔۔۔ رسم بیداد مبادا ز جہاں برخیزد

کشتۂ دعوی پیدائی خویشم ہمہ ۔۔۔ وائے گر پردہ ازیں راز نہاں برخیزد

زینہار از تعب دوزخ جاوید مترس | خوش بہاریست کز و بیم خزاں برخیزد
جزوے از عالمم و از ہمہ عالم بیشم | ہمچو موے کہ بتاں را زمیاں برخیزد
گر دہم شرح ستمہائے عزیزاں غالبؔ | رسم بیداد ہمانا زجہاں برخیزد

محفل مشاعرہ ہی میں اس غزل کے آٹھویں شعر پر تین اعتراض ہوئے۔ بڑھ چڑھ کر اعتراض کرنے والوں میں مولوی وجاہت علی لکھنوی ملازم دفتر گورنر جنرل، احمد علی گوپاموی، مولوی کرم حسین بلگرامی، مولوی عبدالقادر رامپوری اور مولوی نعمت علی عظیم آبادی تھے۔ موخرالذکر تین اشخاص کے بارہ میں غالب لکھتے ہیں کہ اگر یہ لوگ جگہ پاتے تو میری کھال اُدھیڑ لیتے۔ (عود ہندی خود) احمد علی گوپاموی کو اکثر لوگ آغا احمد علی احمد بن مرزا شجاعت علی سمجھتے ہیں جو اس وقت نہیں بلکہ ۱۸۶۴ء میں مدرسہ عالیہ کلکتہ میں فارسی کے مدرس مقرر ہوئے تھے اور قاطع برہان کے جواب میں موید برہان لکھی تھی۔ اس مشاعرے کے وقت آغا احمد علی کا وجود نہ تھا کیونکہ وہ دہم شعبان ۱۲۵۵ھ میں پیدا ہوئے تھے اور غالب ۱۲۴۲ھ کے لگ بھگ کلکتہ آئے تھے اور دو سال کلکتہ میں ٹھہرے تھے۔

غالب کے شعر پر اوّل اعتراض یہ تھا کہ "بیش" کی جگہ "بیشتر" ہونا چاہیئے۔ دوسرا اعتراض یہ کہ "موے زمیاں برخیزد" غلط ہے۔ بلکہ پورا شعر بے معنی ہے یعنی "رستن کمر معشوق" خلاف واقعہ ہے اور رستن مو و سبز کو برخاستن سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ تیسرا اعتراض یہ کہ عالم مفرد ہے

لے ذکر غالب

اس لئے حسب اجتہاد قتیل عالم کے ساتھ "ہمہ" کا استعمال نہیں ہونا چاہئے۔
اوّل اعتراض کے سلسلے میں کہنا ہے کہ "از" حروف تفضیل بھی ہے۔
اس لئے بغیر لاحقہ "تر" کے بھی اسم تفضیل کا استعمال فارسی اور دیگر مشرقی
زبانوں میں عام ہے مثلاً انوری کا شعر ہے۔

در جہان و از جہان بیشی ہمچو معنی کہ در بیان باشد

انوری نے بیشی کہا، بیشتری نہیں کہا۔ انوری کا یہ شعر بیش بمعنی بیشتر
اچھی سند ہے لیکن غالب کا مصرعہ انوری کے مصرعہ سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔
البتہ انوری نے دعوی کی دلیل میں "معنی در بیان" کہا ہے اور غالب نے بدلے
"موے زمیان" کہا ہے۔ اس قسم کا معنوی توارد غالب کے یہاں بہت
پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے ان پر سرقہ کا الزام بھی لگایا گیا ہے۔
دوسرے اعتراض کے سلسلے میں کہا ہے کہ بال معشوق کی کمر پر نہیں
اُگتے اور تشبیہ بھی صحیح نہیں۔ اگر میاں کے معنی درمیان کے لئے جائیں
تو غالب کے مصرعہ کا مطلب شاید یہ ہے کہ بال جو معشوق ہی کے درمیان
سے اُگتے ہیں معشوق سے زیادہ ہیں۔ انوری کے شعر کے مقابلے میں
غالب کا شعر ناقص ہے۔ انوری نے اول مصرعہ میں جو دعویٰ کیا ہے دوسرے مصرعہ
میں اس کی ٹھوس اور بامعنی دلیل پیش کی ہے۔ غالب کی دلیل غیر مربوط اور
مبہم ہے۔ معشوق کے بال تعداد میں معشوق سے زیادہ ہوتے ہیں نہ کہ مقدار
یا طوالت یا عظمت میں۔ اگر غالب اپنے کو مقدار یا طوالت یا عظمت کی بجائے
تعداد میں عالم سے زیادہ کہتے تو دلیل مربوط ہوتی۔ غالب تو اپنے کو معنوی لحاظ

سے بیشتر کہہ رہے ہیں۔

تیسرا اعتراض غالب کے تمام تذکروں میں ملتا ہے۔ محفل مشاعرہ میں غالب کے طرفدار بھی موجود تھے جن میں نواب علی اکبر خاں طباطبائی اور مولوی محمد حسن خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ نواب علی اکبر خاں طباطبائی ہوگلی امام باڑہ کے متولی تھے اور مولوی محمد حسن گورنر جنرل کے دفتر فارسی سے منسلک تھے۔ ان دونوں نے اس اعتراض کا جواب دیا اور سند میں یہ اشعار پیش کئے

گر من آلودہ دامنم چہ باک　　　ہمہ عالم گواہ عصمت او (حافظ)

بجہاں خرّم از آنم کہ جہاں خرّم از دست　　　عاشقم بر ہمہ عالم کہ ہمہ عالم از دست
(سعدی)

غالب چودھری عبدالغفور سرور کو لکھتے ہیں کہ "اور جو اعتراض مجھ پر کئے تھے ان میں سے ایک اعتراض یہ تھا کہ ہمہ عالم غلط ہے۔ یعنی ہمہ کا لفظ عالم کے ساتھ ربط نہیں پا سکتا۔ قتیل کا حکم یوں ہے۔ عرض کیا گیا ہے کہ حافظ کہتا ہے۔ ع ہمہ عالم گواہ عصمت او۔ سعدی کہتا ہے۔ ع

عاشقم بر ہمہ عالم کہ ہمہ عالم از دست"

ہمہ کے سلسلے میں چند باتیں غور طلب ہیں۔ اوّل یہ کہ عالم بمعنی اہل عالم یا عالمیان بھی مستعمل ہے یعنی ظرف برائے مظروف۔ اور جب عالم بمعنی اہل عالم یا عالمیان یا لوگ استعمال ہو تو عالم کے ساتھ ہمہ کا استعمال صحیح ہے۔ کیونکہ سب لوگ بھی ہو سکتے ہیں اور کچھ لوگ بھی ہو سکتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اظہار کلیت کے لئے بھی لایا جا سکتا ہے اور جب اظہار کلیت کے لئے لایا جاتا ہے تو ہمہ عالم کے معنی عالم کا

کوئی حصہ مستثنیٰ نہیں بلکہ پورے کا پورا عالم۔ اُردو میں اس موقع پر ہمہ کا ترجمہ "سارا" یا "پورا" یا "تمام" ہوگا، "سب" نہیں ہوگا۔ انگریزی میں اس کا ترجمہ "ہول" (Whole) ہوگا۔ "آل" (All) نہیں ہوگا۔ اردو میں سارا عالم، سارا جہاں، سارا زمانہ، ساری دُنیا، ساری عمر، تمام عمر، تمام عالم، پورا ملک، پوری عمر بولتے ہیں۔ مثلاً

انھیں نفرت ہوئی سارے جہاں سے نئی دُنیا کوئی لائے کہاں سے
داغ

حرم کیا، دیر کیا، یکساں کشش تھی سارے عالم میں
خُدائی جمع ہوتی خود نمائی تم جہاں کرتے وحشت

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے (غالب)

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

زاہد تمام عمر فرشتہ بنا رہا اس نے کیا جو کام، یہ کام آدمی کا تھا
ریاض

حافظ کے شعر میں عالم بمعنی اہلِ عالم استعمال ہوا ہے اور سعدی کے شعر میں اظہارِ کلیت کے لئے لایا گیا ہے۔ غالب کے شعر میں بھی اظہارِ کلیت کے لئے لایا گیا ہے مگر غلط طریقے سے غالب نے عالم کو کُل اور اپنے کو جزو کہا ہے۔ لہٰذا پورا کُل یعنی ہمہ عالم کہنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے صرف کل یعنی صرف عالم کہنا کافی ہے۔ یعنی "جزو پورے کُل سے بڑا ہے" کہنے کی بجائے "جزو کل سے بڑا ہے" کہنا کافی ہے۔ جیسا کہ انوری نے کہا ہے درجہان و از جہاں بیشی۔ علاوہ اس کے

غالب نے ایک ہی مصرعہ میں جس عالم کے لئے صرف عالم استعمال کیا۔ اس عالم کے لئے ہمہ عالم بھی استعمال کیا۔ تو کیا صرف عالم پورا عالم نہیں ہے؟ اس سلسلے میں سعدی کا شعر ملاحظہ کیجئے۔ جہاں۔ جہاں، ہمہ عالم۔ ہمہ عالم۔ غالب کے شعر میں ہمہ کا لفظ زائد ہے۔ لیکن معترض کا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ عالم مفرد ہے اس لئے عالم کے ساتھ ہمہ کا استعمال کسی حال میں صحیح نہیں۔ مرزا قتیل کے خیال کے مطابق ہمہ کے ساتھ اسم ہمیشہ جمع ہونا چاہیے۔ واحد نہیں۔ کیونکہ ہمہ کثرت تعداد کو ظاہر کرتا ہے۔ اس لئے ہمہ کس کے بجائے ہمہ کساں، ہمہ چیز کی بجائے ہمہ چیزہا ہونا چاہئے۔ لیکن فارسی میں ایسا نہیں ہے۔ ہمہ جب اظہار کلیت کے لئے آئے تو اسم اس کے لئے جمع نہیں لاتے۔ اس طرح ہمہ کے ساتھ بے جان چیز کی جمع نہیں آتی۔ البتہ ہمہ کے ساتھ جاندار چیز کی جمع آتی ہے بشرطیکہ وہ تعداد میں ایک سے زیادہ ہو۔ ایسے موقع پر ہمہ کا اُردو ترجمہ "سب" ہوگا لیکن "کس" اس قاعدے سے مستثنا ہے۔ خواجہ حافظ کے چند شعر ہیں۔

عقاب جور کشادست بال بر ہمہ شہر — کمان گوشہ نشینی و تیر آہے نیست

ہمہ چیز دارد دل آرام لیکن — دریغا کہ با ما وفائے ندارد

قد ہمہ دلبران عالم — در خدمت قامتت نگوں باد

نگر چشم سیاہ تو بیاموزد کار — ورنہ مستوری و مستی ہمہ کس نتوانند

غالب نے خود ان اعتراضوں کا جواب نہیں دیا تھا۔ صرف یہ کہا تھا کہ "کون قتیل؟ دہی فریدآباد کا کھتری بچہ! میں اس فرومایہ کو

کیوں سند ماننے لگا؟" غالب کے اس طرزِ تکلم اور طرزِ عمل سے افضل کا یہ پروپگنڈہ کہ غالب قتیل کو بُرا بھلا کہتا ہے حقیقت ثابت ہوئی اور لوگوں کے دلوں میں غالب کی مخالفت کا جذبہ بڑھنے لگا۔

اب غالب تیسری مرتبہ محفل مشاعرہ میں شریک ہو رہے ہیں۔ اس دفعہ ایک اور بات ہوئی۔ بقول غالب اس زمانے میں "اعیان عجم میں سے ایک گراں مایہ شخص والیٔ ہرات شاہزادہ کامراں کا سفیر کفایت خاں کلکتہ آیا ہوا تھا۔ منتظمین مشاعرہ نے انھیں بھی مشاعرہ میں شرکت کی دعوت دی۔ سفیر موصوف نے دعوت قبول کر لی اور مشاعرے میں شریک بھی ہوا۔ غالب سے ناآشنا ہونے کے باوجود کفایت خاں غالب کا مشتاق تھا۔ جو ایرانی غالب کا کلام پہلے کے دو مشاعروں میں سُن چکے تھے انھوں نے کفایت خاں سے غالب اور غالب کے کلام کا تذکرہ تحسین آمیز لفظوں میں کیا تھا۔ کفایت خاں بڑے تپاک سے غالب سے ملا۔ اب شعر خوانی کا دَور شروع ہوا۔ سفیر موصوف شعرا کا کلام سُنتا تھا اور ان کی پوچ گوئی پر مسکراتا تھا۔ لیکن جب غالب کی نوبت آئی تو بڑے اشتیاق سے سُننے کے لیے آمادہ ہوا اور غالب کے اشعار سُن کر کہا کہ "آپ سب پر غالب اور اسم بامسمی ہیں" اہل انجمن کو مخاطب کر کے کہا کہ "اس شخص کی قدر کرو، شعر و شاعری سے قطع نظر، زبان پارسی کا عالم ہے"۔ غالب ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں کہ کفایت خاں نے کہا کہ "ہندوستان میں اس کلام کی قدر کون کر سکتا ہے۔ آپ کا کلام تو اس قابل ہے کہ فصحائے ایران اسے سُنیں اور لطف اُٹھائیں۔ پھر اہل انجمن سے مخاطب ہو کر کہا کہ "دوستو!

اس شخص کا آپ لوگوں کے درمیان ہونا غنیمت ہے۔(مجموعہ دہلی اور غالب۔ غالب نمبر سہ ماہی اُردو کراچی ۱۹۶۹ء)

غالب کہتے ہیں کہ اس گفتگو کے درمیان جب میرا اشہب زبان سرپٹ دوڑنے لگا تو ایک فتنہ برپا ہوا اور جب میں اگلے اعتراضات کا جواب دینے لگا تو سفیر موصوف نے میری ہمزبانی کی اور میری تعریف کی اور معترضین پر ہنسنا شروع کیا۔ سفیر موصوف نے اس موقعہ پر چند اشعار بطور اسناد پڑھے تھے ان میں سے حافظ، سعدی، ظہوری اور ایک اُستاد کا شعر مجھے یاد ہے۔(مجموعہ دہلی اور غالب)

گر من آلودہ دامنم چہ باک
ہمہ عالم گواہ عصمت اُو
حافظ

بجہاں خرم ازانم کہ جہاں خرم از وست
عاشقم بر ہمہ عالم کہ ہمہ عالم از وست

کم ازانم کہ در معذرتم باید زد
پیش ازانم کہ دہی خجلتِ تقصیر را
ظہوری

از رُخ خط مشک سود برخاست
آتش بنشست و دود برخاست
اُستاد

غالب نے اپنے اور دوسرے شعرائے ہند کے بارہ میں کفایت خاں کے تاثرات کو جس مبالغہ آرائی کے ساتھ بیان کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کفایت خانی تاثرات غالب صاحب کی ذہنی تخلیقات ہیں اور خود کفایت خاں عبدالصمد نمبر۲ ہے۔ اس فقرے سے کہ

"یہ شخص پارسی زبان کا عالم ہے" تخلیق کا راز فاش ہو جاتا ہے۔

حافظ اور سعدی کے وہی اشعار ہیں جو پہلی نشست میں بطور سند پیش کئے گئے تھے۔ یہ توارد سند بھی تخلیق کے راز کو فاش کرتا ہے۔

غالب اپنے ایک خط میں مولوی عبدالرزاق شاکر کو لکھتے ہیں کہ اللہ اللہ جو کلکتہ میں شور نشور اُٹھا تھا۔ میرا شعر

جزوے از عالم و از ہمہ عالم بیشم
ہمچو موئے کہ بتاں راز میاں برخیزد

خستہ جراحتہائے اعتراض ہوا ہے۔ قضا را اس زمانے میں شاہزادہ کامران درانی کا سفیر گورنمنٹ میں آیا۔ کفایت خاں اس کا نام تھا۔ اس تک یہ قصہ پہنچا۔ اس نے اساتذہ کے اشعار پانچ سات ایسے پڑھے جس میں ہمہ عالم، ہمہ روز، ہمہ جا مرقوم تھا اور وہ اشعار قاطع برہان میں درج ہیں۔ (عود ہندی)

لیکن قاطع برہان میں پانچ سات کی بجائے صرف تین شعر ہیں۔ دو تو وہی حافظ و سعدی کے منقولہ اشعار اور ایک نظیری کا یہ شعر

چوں سگاں ازاں بکویت ہمہ شب قلادہ خایم
کہ ہوائے صید دارم نہ خیال پاسبانی

غالب کے پچھلے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے تیسری نشست میں پچھلے اعتراضوں کا جواب دیا تھا اور کفایت خاں نے ان کی ہمزبانی کرتے ہوئے سند کے طور چند اشعار پیش کئے تھے۔ لیکن اس خط میں کہتے ہیں کہ "اس تک یہ قصہ پہنچا" معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ پر افسانہ گڑھا جا رہا ہے۔ غالب نے ہمہ عالم والے اعتراض کو کئی جگہ بیان کیا ہے اور ہر جگہ وہی دو سند کے اشعار پیش کر کے جتایا ہے کہ ہمہ عالم صحیح ہے۔ لیکن دوسرے دو اعتراضوں کا کوئی ذکر یا جواب نہیں ملتا۔ تو کیا ان سے اور ان کے حمایتیوں سے ان دو اعتراضوں کا جواب نہ بن پڑا۔

تیسرے مشاعرہ میں غالب نے یہ غزل پڑھی تھی۔

میرود خندہ بساماں بہاراں زدہ
چوں گلِ ریختہ و مے بگلستاں زدہ

شور سودائے تو نازد کہ بگل می بخشد
چاکے از پردۂ دل سر بگریباں زدہ

آہ از بزم وصالِ تو کہ ہر سو دارد
نشترِ ریزۂ مینا برگِ جاں زدہ

شور اشکے بفشار بن مژگاں دارم
طعنہ بر بے سروسامانیٔ طوفاں زدہ

اندریں تیرہ شب از پردہ بروں تاختہ است
مے روشن بطرب گاہ حریفاں زدہ

زخمتم باد کہ مرہم نہ زخم جگرست
خندہ بر بے اثریہائے نمکداں زدہ

خوش بسری دو داز ضربت آہم ہر سو
چرخ سرگشتہ تر از گوئے بچوگاں زدہ

خوشنوا بلبل پروانہ نژادم دادند
شعلہ در خوش بگلبانگ پریشاں زدہ

چمن از حسرتیاں بے اثرِ جلوۂ تست
گل شبنم زدہ باشد لبِ خنداں زدہ

خاک در چشم ہوس ریز چہ جوئی از دہر
بارگاہے بفرازِ سرِ کیواں زدہ

بنگر موج غبارے و زغالب بگذر ایںک آندم نہ ہوا داری خوباں زدہ
بزم مشاعرہ برہم ہونے کے بعد چند شاعر اور غیر شاعر ہنگامہ آرا
ہوئے اور اس شعر

شور اشکے بفشار بن مژگاں دارم
طعنہ بر بے سروسامانیٔ طوفاں زدہ

پر اعتراض کیا گیا۔ اعتراض تھا کہ "زدہ" میں اضافت کیسی ہے؟۔ غالب نے
مثنوی "باد مخالف" میں اس کا جواب بالتفصیل دیا ہے۔ کہتے ہیں

وائے باآنکہ شعر من صافست "زدہ" را می زند چہ انصافست
اعتراض آتشم بجاں زدہ است شعلہ در مغز استخواں زدہ است
"زدہ" را کسرہ از اضافت نیست یائے وحدت بود اضافت نیست
واضع طرز ایں زمیں نہ منم در خور سرزنش ہمیں نہ منم
دیگراں نیز گفتہ اند چنیں گوہر راز سفتہ اند چنیں
شورش آمادہ رفتہ اند ہمہ ہم بریں جادہ رفتہ اند ہمہ
در نورد گذارش "زدہا" کردہ اند از نشاط عربدہ ہا
اکثر از عالم شتاب زدہ مے زدہ، غم زدہ، شراب زدہ
مے زدہ، غم زدہ کہ ترکیب است بقیاس فقیر تقلیب است
چو برآید ز انگبیں مومش زدہٴ غم دمد ز مفہومش
لیک در بعض جا نہ در ہمہ اش لفظ "ماری ہوئی" ست ترجمہ اش
ویں خود از شان فاعلست کہ ہست حق بود حق نہ باطلست کہ ہست

بیدل عظیم آبادی سے استناد کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ہمچناں آں محیط بے ساحل قلزم فیض میرزا بیدل
از محبت حکایتے دارد کہ بدنیا بدایتے دارد
"عاشقے، بیدلے، جنوں زدۂ قدح آرزو بجنوں زدۂ"
اولش خود مضاف مقلوبست دو یمیں تا کدام اسلوبست
کردہ ام عرض ہمچناں "زدۂ" طعنہ بر بحر بیکراں زدۂ
گر ایں شعر زاں نمط نبود گر بود شعر من غلط نبود
گرچہ بیدل نہ اہل ایراں نیست لیک ہمچو قتیل ناداں نیست
دعوئ بندہ بے سروبن نیست شعر بیدل بجز تفنن نیست
پارۂ از کلام اہل زباں می فرستم بخدمت یاراں

مطلب یہ کہ "زدۂ" میں اضافت نہیں ہے بلکہ یائے وحدت ہے اور یہ زمین میری اپنی نہیں ہے مجھ سے پہلے دوسرے شاعروں نے بھی اس زمین میں طبع آزمائی کی ہے اور "مے زدہ، غم زدہ، شراب زدہ" وغیرہ قسم کے الفاظ بھی استعمال کئے ہیں۔ ان الفاظ میں تقلیب واقع ہوئی ہے یعنی اصل میں زدۂ مے، زدۂ غم، زدۂ شراب ہیں۔ سب جگہ تو نہیں، بعض جگہ اس کا ہندی ترجمہ "ماری ہوئی" ہوتا ہے۔ بیدل عظیم آبادی کے یہاں بھی "جنوں زدۂ، بجنوں زدۂ" الفاظ ملتے ہیں۔ اگرچہ میرا شعر اس قبیل کا نہیں ہے تاہم میرا شعر غلط نہیں ہے۔ مانا کہ بیدل ایرانی نہیں لیکن قتیل کی طرح ناداں بھی نہیں۔ بیدل قلزم فیض اور محیط بے ساحل

ہے۔ بیدل کا کلام تفنن طبع کے لئے نہیں ہوتا۔ تاہم اہل زبان کے کلام سے سند بھیجوں گا۔

غالب نے اعتراض کا جواب بالتشریح وبسند دیا ہے۔لیکن بیدل سے استناد کرنے کے بعد یہ کہنا کہ اگرچہ یہ شعر اس قبیل کا نہیں تاہم میرا شعر غلط نہیں اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ خود غالب کو اپنے جواب سے اطمینان نہ تھا۔علاوہ اس کے جب وہ سوائے امیر خسرو کے ہند و پاکستان کے ارباب علم میں سے کسی کو معتبر نہیں سمجھتے تھے تو بیدل کے کلام سے سند پیش کرنے کے کیا معنی؟ یہ فقط اس لئے کہ یہ وہ ان کے حسب خواہ ہے۔اور آج جس بیدل کے کلام سے سند پیش کرتے ہیں خود بینی کا ایک دن وہ بھی آتا ہے جب کہتے ہیں کہ "ناصر علی، بیدل اور غنیمت کی فارسی کیا؟ ہر ایک کا کلام بنظر انصاف دیکھئے، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا؟

غالب اپنی پنشن کی چارہ جوئی کے لئے کلکتہ آئے تھے۔لہٰذا کلکتہ میں وہ مہمان کی حیثیت سے تھے۔لیکن مہمان کے کلام پر اعتراض نے مہمان اور میزبانوں کے درمیان ایک جھگڑے کا سلسلہ پیدا کر دیا۔اب یہ سوال کہ جھگڑے کی ابتدا کس نے کی۔غالب مثنوی "باد مخالف" میں فرماتے ہیں۔

مہربانا خدائے را انصاف	تا نخست از کہ بود رسم خلاف
نمک اندر سبوے مے کہ فگند	بچمن رستخیز دے کہ فگند
زلف گفتار را کہ برہم کرد	بزم اشعار را کہ برہم کرد
ہمہ عالم غلط کہ گفت نخست	پارہ زیں نمط کہ گفت نخست

بیش را بیشتر کہ گفت بمن | بد زمن پیشتر کہ گفت بمن
موے را بر کمر کہ گفت غلط | شعر را سر بسر کہ گفت غلط

یعنی اے مہربانو! خُدا کے لئے انصاف کرو کہ شیوۂ اخلاق و مروّت کی خلاف ورزی پہلے کس نے کی، شراب کی صراحی میں نمک کس نے ڈالا اور کس نے چمن میں خزاں کا ہنگامہ برپا کیا۔ کس نے زلفِ سخن اور بزمِ سخن کو برہم کیا۔ پہلے کس نے کہا کہ "ہمہ عالم" غلط ہے، بیش نہیں بیشتر ہونا چاہیئے اور کس نے کہا کہ کمر پر بال کہنا غلط ہے بلکہ پورے کا پورا شعر غلط ہے۔

یہ ضرور ہے کہ جھگڑے کی ابتدا غالب کے شعر پر اعتراض سے ہوئی جس کے لئے افضل بیگ پہلے ہی سے ماحول کو سازگار بنا رہا تھا۔ لیکن جس چیز نے لوگوں کو اس قدر مشتعل اور فضا کو مکدر کر دیا وہ تھا غالب کا اندازِ تکلم۔ دوسری نشست میں غالب نے قتیل کا نام سُن کر ناک بھوں چڑھائی اور جیسی کہ ان کی عادت تھی بڑی حقارت سے کہا کہ "کون قتیل، وہی فرید آباد کا کھتری بچہ! میں اس فرومایہ کو کیوں سند ماننے لگا؟" اگر جواب دینے کا یہی طریقہ ہے تو غالب کے اس سوال کے جواب میں موصوف سے پوچھا جا سکتا ہے کہ وہ خود کون سے شیراز یا اصفہان کے ایرانی بچے تھے کہ ان کے مُنھ سے جو نکل جائے اس کو آمنّا و صدّقنا کہہ کر مان لیا جائے۔ فارسی کا کیا پوچھنا، اُردو تو ان کی مادری زبان تھی، اس پر بھی کہتے ہیں۔

وہ بھی دن ہوں کہ اس ستمگر سے | ناز کھینچوں بجائے حسرتِ ناز

اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر | مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا
تماشا کر اے محوِ آئینہ داری | تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں
غم آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو | چراغ روشن اپنا قلزم صرصر کا مرجاں ہے
جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے | جاں کالبدِ صورتِ دیوار میں آوے
نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ | اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ
تم سب تو یہ کہتے ہو بُت غالیہ ہو آئے | یک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ او آئے

ستمگر سے ناز کھینچنا بجائے ستمگر کے ناز اُٹھانا، تماشا کرنا بجائے دیکھنا، تماشا بجائے دیکھ، پرورش دینا بجائے پرورش کرنا، نفس کھینچنا بجائے سانس لینا، انتظار کھینچنا بجائے انتظار کرنا، گفتار میں آنا بجائے گفتگو کرنا، حسرت کھینچنا بجائے حسرت کرنا، نہ اہل زبان بولتے لکھتے ہیں اور نہ زباندان جس طرح "وے" بجائے "وہ (جمع)" بقول غالب گنوارو بولی ہے[1] اسی طرح "او" بجائے "وہ" جہلاے عوام کی بولی ہے۔

الفاظ و محاورات اُردو کے غلط استعمال کی مثالیں

غالب کا شعر زخم سلوانے سے مجھ پہ چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذّت زخم سوزن میں نہیں

نیاز فتحپوری۔ میں یہ ماننے کو تیار نہیں کہ اس نے (یعنی غالب نے) استعمال الفاظ میں کوئی غلطی نہیں کی۔ یقیناً وہ لغت پر عبور رکھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایک لفظ کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ لیکن محل استعمال میں کہیں کہیں

---

[1] اردوے معلی

غلطیاں کی ہیں۔ گو وہ ایسی نہیں کہ ہر شخص کی نگاہ ان پر پڑ سکے (مثلاً مذکورہ شعر کو لیجئے)۔ شعر کا مطلب واضح ہے۔ لیکن لفظ "لذت" کا استعمال میری رائے میں صحیح نہیں کیا گیا۔ غیر نے طعنہ دیا تھا کہ غالب زخم سلوا رہا ہے۔ یعنی چارہ جوئی سے اپنی تکلیف کم کرنا چاہتا ہے۔ اس کا جواب غالب کو یہ دینا چاہئے تھا کہ غیر کا یہ طعن درست نہیں۔ کیونکہ زخم سوزن میں بھی تکلیف کم نہیں ہوتی۔ لیکن اس نے یہ کہا کہ زخم سوزن میں بھی لذت ہے۔ غیر کا طعن تو یہی تھا کہ غالب لذت و راحت کا خواہشمند ہے اور اس کی تصدیق غالب نے بھی کر دی۔ اگر کوئی شخص آپ سے یہ کہے کہ "کیوں صاحب! مصیبت میں مجھ سے جدا ہو گئے" اور آپ یہ جواب دیں کہ "کیا آپ سے جدا ہونا راحت نہیں ہے؟" تو وہ کیا سمجھے گا۔

غالب کا شعر خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پہ سہرا

نظم طباطبائی۔ محاورہ کی رو سے اوّل مصرعہ میں تیرے سر کامیابی کا سہرا، تیرے سر فتح کا سہرا، تیرے سر بڑائی کا سہرا ہونا چاہیے (شرح دیوان غالب)

صرف سہرا سے مراد وہ پھولوں کا سہرا ہے جو دولھا کے سر پر باندھا جاتا ہے۔ علاوہ اس کے "ہو" کی "ہ" ساقط ہو جاتی ہے اور "و" مخفف ہو جاتا ہے یعنی "خوش" غالب نے اس "سہرا" کے مقطع میں شیخ ابراہیم ذوق اور بادشاہ بہادر شاہ ظفر دونوں کو چیلنج کیا تھا کہ اگر استاد

بنانے کے لئے بادشاہ کا ذوق کو انتخاب کرنا صحیح تھا تو بادشاہ کا اُستاد یعنی ذوق اس سہرے سے بڑھ کر ایک سہرا لکھ دے۔ مقطع ہے۔

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

ذوق نے اسی وقت اس چیلنج کے جواب میں ایک سہرا لکھ کر پڑھ دیا مگر ذوق نے غالب کی محاورہ کی غلطی گرفت کر لی اور سب سے پہلے اسی کی اصلاح کی۔

اے جواں بخت! مبارک ترے سر پہ سہرا
آج ہے یمن وسعادت کا ترے سر سہرا

غالب کا یہ شعر بے مثل تھا

سات دریا کے پروئے گئے ہوں گے موتی
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

ذوق کا یہ شعر بے مثل ہوا

ایک کو ایک پہ تزئیں ہے دم آرائش
سر پہ دستار ہے دستار کے اوپر سہرا

غالب کا مصرعہ سے شبنم بگل و لالہ نہ خالی ز ادا ہے وحشت کلکتوی۔ اس سے بڑھ کر اور کیا فارسی کی تقلید (بلکہ بھونڈی نقالی۔ لطیف) ہوگی کہ "ہے" کی جگہ "ہست" پڑھئے تو ایک اچھا خاصا فارسی کا مصرعہ ہے۔ خیر اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔ اعتراض ہے تو لفظ "نہ"

پر کہ بجائے "نہیں" کے استعمال کیا گیا۔

غالب کا شعر

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا دل جگر تشنۂ فریاد آیا

نظم طبا طبائی۔ دوسرے مصرعہ میں "آیا" "ہوا" کے معنی میں ہے جو فارسی کا محاورہ ہے۔

اُردو میں اس طرح نہیں بولتے

اب غور طلب بات یہ ہے کہ غالب جب اپنی مادری زبان میں لغزشیں کر گئے تو کیا فارسی زبان میں جو اُن کی اپنی زبان نہیں ایسی لغزشیں نہ ہوئی ہوں گی۔ اس قسم کی لغزشیں بلکہ ان سے بڑھ کر لغزشیں ان کے فارسی کلام میں ضرور ہوں گی۔ مگر غیر اہل زبان کی نظر ان پر پڑنے سے قاصر ہے۔ اگر عرفی، حزیں یا کوئی اور ایرانی نقاد ہوتا تو وہ ہمیں بتاتا کہ غالب کی فارسی کیا ہے۔ ہمارے یہاں خان آرزو جیسا ایرانیوں سے مرعوب نہ ہونے والا بھی کوئی نقاد موجود نہیں۔ لطیف اللہ صاحب اپنے مضمون مطبوعہ سہ ماہی اُردو کراچی غالب نمبر ۱۹۶۹ء میں لکھتے ہیں کہ جب نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ حج بیت اللہ کو جا رہے تھے ایک شیرازی صاحب ان کے ہمسفر تھے۔ شیفتہ نے شیرازی صاحب کو مطالعہ کے لئے اپنے اُستاد محترم مرزا غالب کا دیوان فارسی دیا۔ شیرازی صاحب نے فرمایا کہ "دریں خرافات اوقات ضائع نکنیم، ما نمیدانیم درکدام زبان ایں دیوان گفتہ شدہ است" (محمد حسین حیات و تصنیفات از ڈاکٹر اسلم فرخی کے حوالے سے)

قتیل کے سلسلے میں "کھتری بچہ"، لالہ قتیل، لالہ دیوانی سنگھ" گویا غالب کا تکیہ کلام بن چکا تھا اور کسی کی بھی فارسی کی غلطی کی گفتگو ہوتی قتیل کو گھسیٹ لینا غالب کا شیوہ بن گیا تھا۔ اگر کسی کی فارسی کی غلطی پر تبصرہ کرتے تو یہ کہہ کر کہ "توبہ! یہ لالہ قتیل کی فارسی ہے" یہ تو اس کھتری بچہ کی فارسی ہے" فارسی دانی کے لحاظ سے غالب قتیل کو ہیچ و پوچ سمجھتے تھے ۔ کیونکہ وہ فرید آباد کا کھتری بچہ تھے ۔ گویا فارسی زبان کا مستند فارسی داں ہونے کے لئے آگرے کے ہندوستانی باپ کا ترک بچہ ہونا ضروری ہے اور شاید اس شرط کی کمی کی وجہ سے فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے، مگر نہیں نکلتی ہے تو غالب کی۔ اگر قتیل کو نومسلم ہونے پر طعنہ دیا جاسکتا ہے تو غالب کو بتانا ہوگا کہ خود ان کا سلسلۂ نسب آل مجھ سے جا کر ملتا ہے یا نہیں ۔ اگر نہیں ملتا ہے تو وہ کا فرالنسل تھے ۔ غالب کو معلوم ہونا چاہیئے کہ سوائے محمد و آل محمد کے طلوع اسلام سے لے کر آج تک دُنیا میں جتنے مسلمان ہوئے ہیں سب کے سب نومسلم یا نومسلم کی اولاد در اولاد ہیں۔

تیسری بزم مشاعرہ میں غالب نے ایسی بات کہہ دی کہ کلکتہ کے تمام فارسی دانوں کی ہتک عزت ہوئی اور افضل بیگ کا یہ کہنا صحیح نکلا کہ غالب شعرائے کلکتہ کو نظر میں نہیں لگاتا ۔ لہٰذا غالب کے حقارت آمیز فقروں پر لوگ چراغ پا ہوئے اور غالب کی خبر لینی ضروری سمجھی گئی ۔ چنانچہ ان کے کلام پر ایسی بوچھار ہونے لگی کہ وہ گھبرا اُٹھے ۔ گھبرا اُٹھنے کا مطلب یہ نہیں کہ غالب کا کلام غلطیوں سے بھرپور تھا اور اعتراض ناقابل تردید ہوتے تھے ۔ بلکہ غالب ذرا ایسے

گھبرا جاتے تھے۔

مخالفین میں ایک بزرگ نے نواب علی اکبر خاں سے شکایت کی کہ آپ کا یہ نیاز مند اسداللہ خاں جلسوں میں شوخی کرتا ہے، مغلوب الغضب ہے اور زبان دراز۔ تیسری بزم مشاعرہ میں کہا کہ "کوئی مخاطب صحیح اور فارسی دانی میں مسلّم نہیں کہ فیصلہ کر سکے۔" اس سے سب کی توہین ہوئی۔ نواب صاحب موصوف نے غالب کو سمجھایا کہ "آپ یہاں سخن پروری اور شعر گوئی کے لئے نہیں آئے ہیں" "راہ دشوار ہے، راہزن بہت۔" غالب نے پوچھا کہ کیا کروں کہ تلافی ہو۔ علی اکبر نے مشورہ دیا کہ معذرت نامہ لکھئے اور مجھے بھیجئے کہ میں مخالفین کو دکھاؤں گا۔ غالب نے علی اکبر کا مشورہ قبول کیا اور ایک مثنوی بعنوان "آشتی نامہ" جو دیوان میں "باد مخالف" کے عنوان سے شامل ہے لکھی (مجموعہ دہلی اور غالب۔ سہ ماہی اُردو کراچی غالب نمبر ۱۹۶۹ء)

اس مثنوی میں غالب نے شعرا و فارسی دانان کلکتہ کو بڑے شاندار الفاظ میں مخاطب کیا ہے۔

اے تماشائیان بزم سخن — وے مسیحا دمان نادرہ فن
اے گراں مایگان عالم حرف — خوش نشینان ایں بساط شگرف
اے سخن پروران کلکتہ — وے زباں آوران کلکتہ
ہر یکے صدر بزم بارگہے — شمع خلوت سرائے کارگہے
ہر یکے پیش تاز قافلۂ — ہر یکے کد خدائے مرحلۂ
اے سخن را طراز جاں دادہ — صفحہ را ساز گلستاں دادہ

عطر بر مغز گیتی افشاناں   پہلوانان پہلوی داناں
اے گرامی فنانِ ریختہ گو   نغز دریاکشان عربدہ جو
اے رئیسانِ ایں سوادِ عظیم   وے فراہم شدہ ز ہفت اقلیم
کار احباب ساختن رسم است   میہماں را نواختن رسم است

اپنا دکھڑا یوں سناتے ہیں۔

کیستم دل شکستۂ، غمزدۂ   بیدلے، خستۂ، ستمزدۂ
برق بے طاقتی بجاں زدۂ   آتشِ غم بخانمان زدۂ
از گدازِ نفس بتاب و تبے   در بیابانِ یاس تشنہ لبے
خس طوفانیٔ محیط بلا   سر بسر گرد کاروان بلا
دردمندے، جگر گداختۂ   ز غمِ دہر زہرہ باختۂ
درِ آگاہیٔ فنا زدۂ   ہمہ بر خویش پشت پا زدۂ
چہ بلاہا کشیدہ ام آخر   کہ بدیں جا رسیدہ ام آخر
بہ سیہ روزِ غربتم بینید   تیرہ شبہائے وحشتم بینید
اندہ دوریٔ وطن نگرید   غمِ ہجرانِ انجمن نگرید
نہ ہمیں نالۂ و فغاں بہ بم   من و جاں آفریں کہ جاں بہ لبم
موبہ چو موئے کردہ است مرا   غصہ بدخوئے کردہ است مرا
با من ایں خشم و کیں دریغ دریغ   من چناں تاں چنیں دریغ دریغ

قتیل اور واقف کے ماننے والوں کو خوش کرنے کے لئے قتیل کی مدح سرائی بھی کی اور قتیل کے کمالات کا اعتراف بھی کیا۔ لیکن چونکہ نیت صاف نہ تھی اس لئے

تعریف کا آغاز اس طرح کیا۔

گرچہ بیدل ز اہل ایراں نیست — لیک ہمچو قتیل ناداں نیست
کہ ز اہل زباں نبود قتیل — ہرگز از اصفہاں نبود قتیل
لاجرم اعتماد را نسزد — گفتہ اش استناد را نسزد

اس کے بعد یوں مدح سرا ہوتے ہیں۔

می شوم خویش را بہ صفحہ دلیل — می سرایم نوائے مدح قتیل
گرچہ ایرانیش نخواہم گفت — سعدی ثانیش نخواہم گفت
لیک از من ہزار بار بہ است — از من و ہمچو من ہزار بہ است
نظمش آب حیات را ماند — در روانی فرات را ماند
نثر او نقش بال طاؤس است — انتخاب صراح و قاموس است
بادشاہے کہ در قلمرو حرف — کردہ ایجاد نکتہ ہائے شگرف
خامہ ہندوے فارسی دانش — ہندیاں سر بخط فرمانش

یعنی میں قتیل کی مدح میں نوازن ہو رہا ہوں۔ اگرچہ میں اسے ایرانی اور سعدی ثانی نہ کہوں گا تاہم وہ مجھ سے اور مجھ جیسوں سے ہزار بار بہتر ہے۔ اس کی نظم آب حیات اور روانی میں دریائے فرات کو مات کرتی ہے۔ اس کی نثر مور کے پنکھ کا نقش و نگار اور صراح و قاموس کا انتخاب ہے۔ قتیل وہ بادشاہ ہے کہ جس نے ملک علم و ادب میں دلنشیں نکتے ایجاد کئے۔ اس کا قلم ہندی ہے لیکن فارسی نگار۔ اور ہندوستانیوں پر اس کی حکومت ہے۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ غالب نے صلح جوئی کے خیال سے قتیل کی جو تعریف کی تو ایسی کہ تعریف سراسر ہجو بن گئی۔ جس کی تعریف کرتے ہیں پہلے اس کو علی الاعلان نادان بھی کہہ لیتے ہیں۔ کیا صلح جویانہ گفتگو کا یہی انداز ہوتا ہے۔ بہرحال لوگ غالب کا دکھڑا سن کر ان کی صلح جوئی کی کوشش سے متاثر ہوئے اور خدا خدا کرکے یہ ناخوشگوار جھگڑا ختم ہوگیا۔ لیکن غالب اپنے یار دوستوں سے زبانی بھی اور خطوط میں بھی قتیل کا تذکرہ حقارت آمیز لفظوں میں کرتے تھے۔ حالانکہ قتیل اس وقت اس دنیا میں نہ تھے۔ مرحوم لوگوں کو برے نام سے یاد کرنا اچھے لوگوں کا شیوہ نہیں۔ غالب کو یہ بھی گوارا نہ تھا کہ مرحوم قتیل کو مرحوم (یعنی رحمت کیا گیا) کہا جائے۔ ان کے خیال کے مطابق قتیل کو متوفی (یعنی وفات پایا ہوا) کہنا چاہیے۔ چودھری عبدالغفور سرور کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "فرید آباد کا کھتری بچہ دیوانی سنگھ تم متخلص بہ قتیل جس کو حضرت نے (یعنی حضرت صاحب عالم نے) مرحوم لکھا ہے۔" آگے چل کر اسی خط میں لکھتے ہیں کہ "لالہ دیوانی سنگھ قتیل متوفی نے بتقلید اہل ایران لکھی ہیں۔"

غالب کے منقولہ الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ غالب کو قتیل کے لئے مرحوم کا لفظ اس حد تک ناگوار تھا کہ وہ اپنے مافی الضمیر کو چھپا نہ سکے اور کھل کر اشارہ کر دیا کہ اسے متوفی کہنا چاہیے۔ لیکن یہ کیوں؟ کیا قتیل غالب سے کم اثنا عشری تھے۔ جہاں تک اوامر و نواہی کی تعمیل کا تعلق ہے غالب کے مقابلے میں قتیل ہی خدا کی رحمتوں کے مستحق تھے۔ غالب تو اوامر سے منحرف اور نواہی کے

پابند تھے۔ ان کی طرح پیکرٹ تو کم ہی ہوئے ہیں۔ غالب اہل زبان فارسی شاعروں کے نام کے ساتھ اکثر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے تھے اور از راہ ظرافت ہی سہی اپنے نام کے ساتھ بھی لکھتے تھے۔ برخلاف اس کے غیر ایرانی شاعروں اور مصنّفوں کا ذکر بڑی حقارت سے کرتے تھے۔ ان کے اس طرزِ عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی رحمت اہل زبان فارسی شاعروں کے لئے مخصوص ہے اور غالب بھی کفایت خاں اور ہرمزد عبدالصمد کے جعلی سرٹیفکٹ لے کر خُدا کی رحمتوں کے مستحق ٹھہر گئے۔

مجھے قتیل کا فارسی کلام نہ مل سکا اور نہ میں نے حاصل کرنے کے لئے کاوش کی۔ لیکن سات شعروں کی ایک غزل ملی ہے جسے یہاں پیش کر رہا ہوں تاکہ قارئین معلوم کر سکیں کہ قتیل کی فارسی اور شاعری کے متعلق غالب کا جو خیال ہے وہ کسی حد تک صحیح ہے۔ قتیل کی غزل ہے۔

سرِ مزار پئے سیرِ لالہ زار آمد — طپیدنِ دلِ پُر خون ما بکار آمد
نشہ چو کس دمِ مرگم کفیلِ گورِ من — دلِ ستم زدہ نالاں زکوئے یار آمد
ز آہ سرد چو گل شد شگفتہ خاطرِ من — مرا گماں کہ نسیمے ازاں دیار آمد
صدائے ماتمی آمد بگوشِ او سحرے — دو دیدہ تا سرِ کوئے خود آں نگار آمد
دمے کہ رفتی و جاں شد رواں بدنبالت — چگویم ایں کہ چہا برتنِ نزار آمد
بود بگردنِ ایں طفلِ خونِ من کہ چنیں — زعمر گریہ کناں بر سرِ مزار آمد
فتاد لرزہ بر اندامِ عاصیاں در حشر — بہ مجمعے کہ قتیلِ سیاہ کار آمد

کلکتے کے مشاعرے کا ہنگامہ غالب کے لئے بڑا تکلیف دہ ثابت ہوا تھا۔

لیکن خوشی کی بات ہے کہ غالب کلکتے سے وطن واپس گئے تو جہاں کچھ بُرے تاثرات لیتے گئے وہاں کچھ اچھے تاثرات بھی لیتے گئے۔ کہتے ہیں

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں! اِک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حف نظر طاقت رُبا وہ ان کا اشارا کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ واہ
وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

مزید خوشی کی بات یہ کہ جس کلکتے میں غالب کے کلام پر اعتراض ہوئے تھے اسی کلکتے میں ۱۸ نومبر ۱۸۸۱ء میں غالب کا ایک ایسا مقلد پیدا ہوا جس نے ۱۹۵۶ء تک اُردو میں غالب کے انداز بیان اور رنگ سخن کو زندہ رکھا۔

زمانے میں اگر رنگِ سخن بدلا تو کیا وحشت
مجھے ہے اتباعِ غالبِ معجز بیاں کرنا

خان بہادر علّامہ رضا علی وحشت بیسویں صدی کے ربع اول کے ان اہل قلم میں ہیں جنھوں نے اول اول غالب کے شاعرانہ کمالات پر مضامین لکھے۔ وحشت صاحب نے جنوری ۱۹۲۰ء کے ماہنامہ نقاد آگرہ میں ایک مضمون "غالب کا انداز بیاں" کے عنوان سے لکھا۔ اس مضمون میں بڑے دلنشیں انداز میں غالب کے شاعرانہ کمالات کو اُجاگر کیا ہے۔ وحشت صاحب غالب کی خسلواٹ شخصیت، قوت مشاہدہ، ندرت تخیل، بالغ نظری اور مضمون آفریں طبیعت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"غالب نے وہ زمانہ پایا تھا جبکہ بزم دہلی کا آخری دور چل رہا تھا۔
لیکن جس طرح دَور آخر میں گرمیٔ محفل کبھی کبھی پہلے سے بھی زیادہ
بڑھ جاتی ہے اسی طرح دہلی کی بزم آخر بھی سرتاسر رونق کی جان تھی۔
علوی، صہبائی، آزردہ، مومن، ذوق، احسان، شیفتہ، نیر وہ لوگ
گزرے ہیں جن کی مثال بزم پیش میں بھی نظر نہ آئی ہو گی۔ ان معاصرین
پر غالب کا غلبہ اس کی ندرت تخیل کی وجہ سے تھا۔ یہ سب خوش فکر و
خوشگو تھے لیکن کسی کے کلام کو وہ خصوصیت حاصل نہ تھی جو اس برگزیدہ
شخص کے حصے میں آئی تھی۔ یک بیک سب کی نظریں اس نئی روشنی پر پڑنے
لگیں اور خیرہ ہو ہو جانے لگیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ قضا و قدر نے جب دیکھا
کہ ریختہ گو خوا لکیر کے فقیر ہو رہے ہیں اور پامال اور فرسودہ خیالات
بے شرمی کے ساتھ بار بار دُہرائے جاتے ہیں تو یہ ضروری سمجھا کہ ایک ایسا
شخص مخلوق ہو جو یہ داغ بدنامی اُردو شاعری کی جبیں سے مٹا دے۔۔۔
اس کے (یعنی غالب کے) دیوان میں ایسے اشعار ملتے ہیں جن سے صاف طور
پر اس کی قوت مشاہدہ ظاہر ہوتی ہے۔ ہر چیز کو وہ فلسفیانہ نگاہ سے
دیکھتا ہے۔ اس کو حقیقت کی تلاش رہتی ہے لفظی شاعری اور معنوی
رعایتوں سے اس کو پرہیز ہے۔ زندگی کے اہم مسائل پر اس کی نظر رہتی
ہے۔ پیش پا اُفتادہ مضامین یعنی چمن شاعری کے سبزۂ پامال پر وہ قناعت
نہیں کرتا بلکہ گلستان خیال کے اچھوتے پھولوں کو توڑ لاتا ہے۔ سچ
کہا ہے ؎

قطرہ میں دریا دکھائی نہ دے اور جزو میں گل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا"

میرے خیال میں یہ مضمون لکھ کر وحشت صاحب نے اس گناہ کا کفارہ ادا کر دیا جس کا ذکر سطور بالا میں ہوا۔

کلکتے کے مشاعرے کے اعتراضوں کا ذکر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ غالب کے کلام فارسی پر جو اعتراض ہوئے وہ صرف کلکتے میں اور وہ بھی ایک خاص وقت اور جذبے کے تحت ہوئے۔ اگرچہ ہند و پاکستان میں ایسے دیدہ ور نقاد موجود نہ تھے جو فارسی زبان و بیان کی فارسیت سے کماحقہ آشنا ہوں تاہم کچھ شُد بُد رکھنے والے موجود تھے۔ اس لئے غالب کے کلام فارسی پر اعتراض ہوتے رہے ہیں لیکن ان کی تفصیل نہیں ملتی۔ یہاں دو اعتراض مثالاً درج کئے جاتے ہیں۔

غالب کا شعر   بوادیٔ کہ دراں خضر را عصا خُفتست
بسینہ می سپرم راہ گرچہ پا خُفتست

یہ شعر جس غزل کا ہے غالب نے ایک شعری نشست میں وہ غزل پڑھی تھی۔ اس نشست میں مولوی امام بخش صہبائی کی تحریک پر مفتی صدر الدین آرزو نے "عصا خُفتست" پر اعتراض کیا کہ (لاٹھی بھی کہیں سوتی ہے) غالب نے جواب دیا کہ "میں ہندی ہوں تو میرا عصا پکڑ لیا مگر سعدی کا عصا کوئی نہیں پکڑتا[1]"، سعدی کہتے ہیں۔ دے بحملۂ اول عصائے پیر بخفت   (آبحیات)

---

[1] آبحیات

مگر اس جواب کو لوگوں نے تسلیم نہیں کیا کیونکہ سعدی کے یہاں اس قدر قرائن موجود ہیں کہ "عصا خفتست" سے جو معنی انھوں نے بطور استعارہ کے مُراد رکھے ہیں ان کے سوا دوسرے معنوں کی طرف خیال نہیں جاتا (یادگار غالب)

شیخ سعدیؒ کے استعارہ کو سمجھنے کے لئے ان کا پورا قطعہ پڑھ کر دیکھئے۔

شنیدہ ام کہ دریں روزہا کہن پیرے
خیال بست بہ پیرانہ سر کہ گیرد جُفت

بخواست دُخترکے خوبروے گوہر نام
چو روح گوہرش از چشم مرد ماں بہ نہفت

چنانکہ رسم عروسی بود تماشا بود
ولے بحملۂ اوّل عصائے پیر بخفت

کماں کشید و نزد بر ہدف کہ نتواں دوخت
مگر بسوزن فولاد جامۂ ہنگفت

بدوستاں گلہ آغاز کرد و حجت ساخت
کہ خانمان من ایں شوخ دیدہ پاک برفت

میان شوہر و زن جنگ و فتنہ خاست چناں
کہ سر بہ شحنہ و قاضی کشید و سعدی گفت

پس از ملامت و شنعت گناہ دختر نیست
ترا کہ دست بلرزد گہر چہ دانی سفت

عصا کے لغوی معنی لاٹھی کے ہیں۔ اگر غالب نے عصا لغوی معنی میں استعمال کیا ہے تو اعتراض صحیح ہے کیونکہ لاٹھی سوتی نہیں۔ لہٰذا انھوں نے سعدی کا جو مصرعہ سند کے طور پر پیش کیا وہ اس لئے کہ وہ سب کو نادان سمجھتے تھے۔ اور اگر غالب نے عصا استعارہ کے طور پر ان معنوں میں استعمال کیا جن معنوں میں سعدی نے استعمال کیا تو غالب کا استعمال صحیح ہے۔ لیکن ماننا پڑے گا شعر فحش ہزل کا شعر ہے کیونکہ یہاں عصا سے مُراد جو عصا ہے وہ سو بھی جاتا ہے اور جاگ بھی پڑتا ہے۔

غالب کا شعر
از جسم بجاں نقاب تاکے
ایں گنج دریں خراب تاکے

غالب کہتے ہیں کہ انھوں نے امیر خسرو کی غزل پر سات شعروں کی ایک غزل کہہ کر ایک گویئے کو دی تھی۔ یہ شعر اس غزل کا مطلع ہے۔ وہ گویا مجلسوں میں یہ اشعار گایا کرتا تھا۔ یہ اشعار اکبرآباد اور لکھنؤ تک مشہور ہوئے۔ لکھنؤ کے ایک شخص اور اکبرآباد کے ایک شخص نے اس شعر پر اعتراض کیا کہ "گنج در خراب" کی بجائے "گنج در خرابہ" ہونا چاہیے۔ کیونکہ خرابہ کے معنی ویران اور بیابان کے ہیں نہ کہ خراب کے معنی۔

غالب نے جواب دیا کہ خرابہ مزید علیہ ہے۔ یعنی "ہ" زاید ہے۔ اصل لغت خراب عربی الاصل بمعنی ویران و ویرانہ ہے جس کی ہندی اوجڑ ہے۔ معترض مصر رہے۔ لیکن صائب کے دیوان سے یہ مطلع نکلا

به فکر دل نه فتادی به هیچ باب دریغ
به گنج راه نبردی درین خراب دریغ

غالب کے قول کے مطابق غالب نے صائب کا یہ شعر لکھ کر معترضین کو بھیج دیا اور لکھا کہ غالب کو دردسر نہ دیجیے، جو پوچھنا ہو صائب سے پوچھ لیجیے۔

غالب کے بیان کے موافق خراسان کے ایک عالم عارف علی شاہ تھے۔ انھوں نے اس شعر پر تین اعتراض کیے۔ اول یہ کہ نقاب کے ساتھ عارض و رخ کا ذکر ضروری ہے۔ دوسرا یہ کہ گنج تو ویرانے ہی میں ہوتا ہے، پھر اس پر تاسف کیا جو کہتے ہیں "تا کے"۔ تیسرا یہ کہ ویرانہ کو خرابہ کہتے ہیں نہ کہ خراب۔ ان اعتراضوں کے بعد انھوں نے دخل کیا تھا

از جسم بجاں حجاب تا کے   رنگِ بر رخِ آفتاب تا کے

غالب غلام غوث. بیخبر کو ایک خط میں لکھتے کہ خراب اور خرابہ کا جواب تو پہلے کے خطوں میں لکھ چکے ہیں۔ یہ بقیہ اعتراض کے جواب میں اور دخل کے بیجا ہونے کے اظہار میں ہے۔

لکھتے ہیں کہ نقاب اس شعر میں بمعنی حائل ہے۔ حول کو وجہ و رُخ کی خصوصیت نہیں۔ دو چیزوں کے بیچ میں جو شے آجائے بلکہ اس سے بڑھ کر یہ بات کہ جو چیز ایک چیز کے مانع نظارہ ہو وہ نقاب ہے اس شے نامرئی کی۔ رُخ کا رُخ بہ مناسب نقاب مقدر ہے اور تقدیر جائز اور بلیغ ہے۔ حجاب کا یہاں اور پری یعنی بے محل اور ناملائم ہونا یا بشرط عقل سلیم و طبع لطیف ظاہر ہے۔ "گِل خاک بآب آمیختہ کو کہتے ہیں۔ وہ رُخ آفتاب تک کہاں پہنچے۔ ہاں! گرد و غبار میں آفتاب چھپ جاتا ہے۔ اس کا استعمال از روے مجاز جائز ہے۔" گنج در ویرانہ تا کے" یہ بہت لطیف بات ہے۔ یعنی افسوس کیا جاتا ہے اس گنج کے بیکار ہونے کا۔ گنج سے غرض یہی تو نہیں کہ جنگل میں مدفون رہے۔ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ مدفن سے نکلے اور صرف ہو اور لوگ اس کے وجود سے تمتع پائیں۔ یہاں ایک اور دقیقہ ہے کہ اس شعر میں گنج مشبہ بہ اور روح انسانی مشبہ ہے اور یہ سب جانتے ہیں کہ روح کا تعلق جسم سے جاوِدانی نہیں۔ پس کیا قباحت ہے اگر ایک غمزدہ، ستم زدہ قطع تعلق روح کا منتظر اور مشتاق ہو۔ مثلاً ایک میعادی محبوس حسرتمندانہ کہے کہ الٰہی وہ دن کب آئے گا کہ میں قید سے نجات پاؤں، کب تک سڑک کاٹوں، کب تک رنج اُٹھاؤں۔ فاخر مکیں ایک شاعر تھا شجاع الدولہ و آصف الدولہ کے عہد میں۔ اس نے سعدیؒ

نظامی و حزیں کے اشعار کو اصلاحیں دی ہیں۔ جب ایک ہندوستانی بے علم و تنگ مایہ اساتذۂ عجم کے کلام کو اصلاح دے تو اگر ایک عالم خراسانی نے ایک ہندی کے مطلع میں تصرف کیا تو کیا قباحت لازم آئی۔ خدا کا شکر کہ مجھ کو ستر برس کی عمر میں پچاس برس کی مشق کے بعد اُستاد میسّر آیا (عود ہندی)

غالب کی تمام تشریحات اور بیانات کے بپیش نظر چند باتوں پر غور کرنا ضروری ہے۔ خراب بمعنی خرابہ پر ایک ایرانی عالم کا اعتراض ہے۔ قتیل یا واقف یا خان آرزو یا فاخر مکیں کا نہیں۔ پھر کیوں نہ مان لیا جائے خود صائب سے غلطی ہوئی ہے اور غالب نے غلطی کی تقلید کی ہے۔ خراسانی عالم کی تردید کرتے وقت غالب کے ذہن میں گویا یہ بات تھی کہ ایک ایرانی عالم غلطی کر سکتا ہے لیکن ایک ایرانی شاعر غلطی نہیں کر سکتا۔ اس حسن تخیل کی خاص وجہ یہ تھی کہ ایرانی عالم نے ان پر اعتراض کیا تھا اور ایرانی شاعر کے کلام سے اس اعتراض کی تردید ہوتی ہے۔ لہٰذا ان دونوں ایرانیوں میں جس کی بات اپنے موافق دیکھی اس کی اُستادی تسلیم کر لی۔ غالب عرفی کے بارہ میں کہتے ہیں کہ عرفی کی زبان سے جو نکل جائے وہی سند (مکاتیب غالب۔ عرشی) اور صائب سے سند پیش کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ جیسا موقع دیکھتے تھے ویسی بات کہتے تھے۔ اس لئے نادانستہ طور پر اپنی تنقیص آپ کر جاتے تھے۔ غالب شیخ علی حزیں کو جیسا کہ تقریظ دیوان فارسی سے ظاہر ہے اپنا اُستاد مانتے تھے۔ لیکن حزیں کا یہ شعر

ز ترکتازی آں نازنیں سوار ہنوز ز سبزہ می دہد انگشت زینہار ہنوز

نقل کرکے لکھتے ہیں کہ اس مطلع میں ایک "ہنوز" زائد اور بیہودہ ہے۔ تتبع کے واسطے سند نہیں ہو سکتا۔ یہ غلط ہے، یہ سقم ہے، یہ عیب ہے۔ اس کی کون پیروی کرے گا۔ حزیں تو آدمی تھا۔ یہ مطلع اگر جبریل کا ہو تو اس کو سند نہ جانو اور اس کی پیروی نہ کرو۔ ایک خط میں منشی ہر گوپال تفتہ کو لکھتے ہیں کہ یہ نہ سمجھا کرو کہ اگلے لوگ جو لکھ گئے وہ حق ہے۔ کیا اس وقت آدمی احمق نہیں ہوتے تھے۔ (یادگار غالب) غالب کے ان اقوال سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ ایرانی شاعروں اور عالموں سے غلطیاں ہوئی ہیں لیکن اگر کوئی دو کوڑی کا ایرانی غالب کے علاوہ کسی بڑے سے بڑے ہندوستانی فارسی شاعر پر اعتراض کرتا تو غالب مارے خوشی کے پھولے نہ سماتے اور اس ہندوستانی شاعر کا مذاق اڑانے کی غرض سے بات کا بتنگڑ بنایا کرتے۔ خان آرزو کی شاعری اور فارسی دانی کا بُری طرح مذاق اڑانے کے شوق میں بڑی رنگ آمیزی کے ساتھ ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں۔ پہلے سُن لیجئے کہ خان آرزو کون تھے۔

سراج الدین علی خاں آرزو معروف بہ خان آرزو ۱۱۰۱ھ ۱۶۸۹ء میں اکبر آباد میں پیدا ہوئے ۱۷۱۹ء میں شاہ جہاں آباد آئے اور شہنشاہ کی جانب سے ایک معزز عہدے پر فائز ہوئے۔ آرزو اپنے دور کے ممتاز ترین شاعروں اور مصنفوں میں تسلیم کئے گئے ہیں۔ انھوں نے ایک رسالہ تنبیہ الغافلین لکھا تھا جس میں شیخ علی حزیں کے چار سو اشعار پر اعتراض کئے تھے۔ وہ غالب کی طرح ایرانیوں سے مرعوب نہ تھے۔ دیوان آرزو، تنبیہ الغافلین،

سراج اللغۃ، چراغ ہدایت، عطیہ کبریٰ، خیابان، شرح سکندر نامہ، شرح قصائد عرفی، غرائب اللغات، جواب اعتراض منیر، موہبت عظمیٰ، شرح مختصر المعانی، شرح گلگشتی، میر نجات، مجمع النفائس خاں آرزو کی تصنیفات ہیں۔ تذکرہ نگاروں میں ان کی عظمت مسلم ہے۔

اب وہ غالب کا بیان کردہ واقعہ سنئے۔ غالب صاحب فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ برسات کے موسم میں سراج الدین علی خاں آرزو کے دل پر یہ مصرعہ

میکشاں مژدہ کہ ابر آمد و بسیار آمد

الہام ہوا۔ خان آرزو کے خیال کے مطابق یہ مصرعہ نہ تھا بلکہ نشتر تھا۔ نشتر نہیں بلکہ سنان آبدار تھا۔ ان کو یقین تھا کہ اگر اس مصرعے کو فغانی یا نظیری کا زمزمہ کہہ دیا جائے تو کسی کو شبہہ نہ ہوگا۔ انھوں نے دوسرا مصرعہ لگا کر شعر یوں بنایا

تند و پُر خور و سیہ مست ز کہسار آمد
میکشاں مژدہ کہ ابر آمد و بسیار آمد

خان آرزو اپنے اس شعر سے اس قدر مست ہوئے کہ دوسروں کو سنانے کے لئے بے چین ہو گئے اور جب تک سنا نہ لیا انھیں چین نہ آیا۔ چنانچہ اسی گھپ اندھیری اور باد و باراں کی رات میں مرزا مظہر جانجاناں کے گھر گئے اور تازہ شعر سنایا۔ جانجاناں نے بڑی تعریف کی۔ خان آرزو اپنی تعریف سن ہی کر گھر لوٹے۔ انھیں دنوں میں ایک ایرانی سوداگر شیراز سے آیا ہوا تھا۔ اس نے خان آرزو سے ملاقات کی۔ آرزو نے اپنا

مذکورہ شعر شیرازی سوداگر کو سنانا چاہا۔ کہا کہ "آغا! مطلعے گفتہ ام، میتواں شنید"۔ شیرازی نے کہا کہ "بنوازید و بخوانید" سادہ دل خاں نے اول مصرعہ پڑھا

تند و پُر شور و سیہ مست زکہسار آمد

ایرانی سوداگر نے جب یہ مصرعہ سنا تو بڑے زور سے قہقہہ لگایا اور کہا کہ "بس بس! معلوم ہوگیا کہ قبلہ نے دوسرے مصرعہ میں کیا ارشاد فرمایا ہوگا" پوچھا کیا۔ بولا "یہی کہ بھالو آیا" یہ کہہ کر وہ ہنسا اور کہا یوں ہونا چاہیئے ؎

میکشاں مژدہ کہ ابر آمد و بسیار آمد
قطرہ افشاں بسوئے شہر زکہسار آمد

اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد غالب صاحب فرماتے ہیں کہ " وہ میرزائے شیرازی شاعر نہ تھا اور صناعت شعر سے اسے کوئی واسطہ نہ تھا چونکہ تندی و مستی و پُرشوری یہ باتیں ابر اور بھالو میں مشترک ہیں اس لئے اس نے پسند نہیں کیا اور اس نے آرزو کے مصرعہ سے نغز تر اور خوشتر مصرعہ فی البدیہہ کہا (قاطع برہان)

غالب کا بیان سُن لیا۔ اب ذرا سوچئے کہ خان آرزو نے برسات کے موسم میں کالے کالے گرجتے ہوئے بادلوں کو دوڑتے ہوئے دیکھ کر یہ شعر کہا تھا۔ لہٰذا انھوں نے بادلوں کا جو سماں دیکھا وہی نظم کیا۔ یہ منظر نگاری کے ساتھ ساتھ سچی واقعہ نگاری بھی ہوئی۔ شیرازی کے مصرعہ میں منظر خلاف واقعہ

بیان ہوا۔ شیرازی نے دوسرا مصرعہ سُننے بغیر کہدیا کہ بھالو آنے کا سماں بندھے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مشاہدہ اچھا نہ تھا۔ کیونکہ اس قسم کا بادل مست ہاتھی کے مشابہ ہوتا ہے نہ کہ بھالو کا۔ شیرازی کو صحیح تشبیہ بھی دینی نہیں آتی۔ ہماری ہندوستانی زبان کی شاعری میں ایسے کالے کالے دوڑتے ہوئے بادلوں کو مست ہاتھی سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ اقبال

ہائے کیا فرطِ طرب سے جھومتا جاتا ہے ابر
فیل بے زنجیر کے مانند اُڑا جاتا ہے ابر

اب اگر بادلوں کی جو کیفیت دیکھی وہ کیفیت نظم نہ کرنی چاہئے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ شعر جہاں بھی کہو لیکن ایران کی کیفیت کے مطابق کہو۔

غالب صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ وہ شیرازی شاعر بھی نہ تھا اور صناعت شعر سے اس کو کوئی واسطہ بھی نہ تھا۔ اگر یہی بات ہے تو اس نے شعر کیسے موزوں کیا اور وہ بھی نغز تر اور خوشتر فی البدیہہ۔ کیا ایران کے ہر شخص کی طبیعت پیدائشی طور پر موزوں ہوتی ہے اور ہر شخص پیدائشی اُستادِ سخن ہوتا ہے۔ ایسی بات تو نہیں ہے۔ یقیناً یہ مصرعہ غالب کا بنایا ہوا ہے۔ غالب نے اس واقعہ کو بیان کرنے میں وہ حاشیہ آرائیاں کی ہیں جن سے خان آرزو کی زیادہ سے زیادہ تذلیل ہو۔ مفروضہ مصرعہ میں شہر کی تخصیص کر کے شعر کی عمومیت اور وسعت ختم کر دی گئی۔ اب یہ شعر صرف شہر میں پڑھا جائے گا۔ شہر کے علاوہ اگر دوسری جگہ بادلوں کا یہ منظر ہوگا تو اس جگہ اس کا حسب الحال پڑھنا موقع کے لحاظ سے غلط ہوگا۔ جس شعر میں جتنی عمومیت ہوگی وہ شعر اُتنا ہی اچھا تسلیم

کیا جائے گا۔

اب یہ سوال کہ چونکہ تندی و مستی و پرشوری یہ باتیں ابر اور بھالو میں مشترک ہیں اس لئے ایسا شعر نہیں کہنا چاہئے کہ ابر بھالو بن جائے۔ اس سلسلے میں گذارش ہے کہ اگر کوئی شخص بال کی کھال نکالنے کی قسم کھا بیٹھا ہو تو ہر شعر میں کوئی نہ کوئی تیخ نکال کر ہی رہے گا۔ غالب کا یہ شعر کتنا اچھا ہے۔

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

مرحوم وہاب حیدر صاحب نے اس شعر کو کارٹون میں یوں ڈھالا ہے کہ غالب اپنی بغل میں ایک مگرمچھ لئے ہوئے ہیں جس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے ٹپک رہے ہیں۔ کارٹونی کتاب "شعر پر شوشہ" جس میں صرف غالب کے شعروں کے کارٹون ہیں ملاحظہ کیجئے۔ لہٰذا ہمارے وہ شیرازی صاحب بھی اچھے کارٹونسٹ بننے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

اب پھر غالب کے اصولوں پر غور فرمائیے۔ ایک موقع پر کہتے ہیں عظمائے ایران ہی کی تقریر سہی، لیکن تقریر اور چیز ہے اور تحریر اور چیز۔ یعنی عظمائے ایران کی تقریروں سے فارسی نہیں سیکھی جا سکتی۔ دوسرے موقع پر کہتے ہیں کہ ایک ایرانی سوداگر جو نہ شاعر ہے اور نہ صناعت شعر سے اس کو کوئی واسطہ ہے خان آرزو کی دھجیاں اڑا دیتا ہے۔ کہیں ایرانیوں کی ایرانیت سے انکار کیا جاتا ہے، کہیں عظمائے ایران کی تقریروں کو بے معرف

اس کارٹون میں مرحوم وہاب حیدر نے غالب کے اس شعر کی شرح کی ہے

حیراں ہوں، دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں
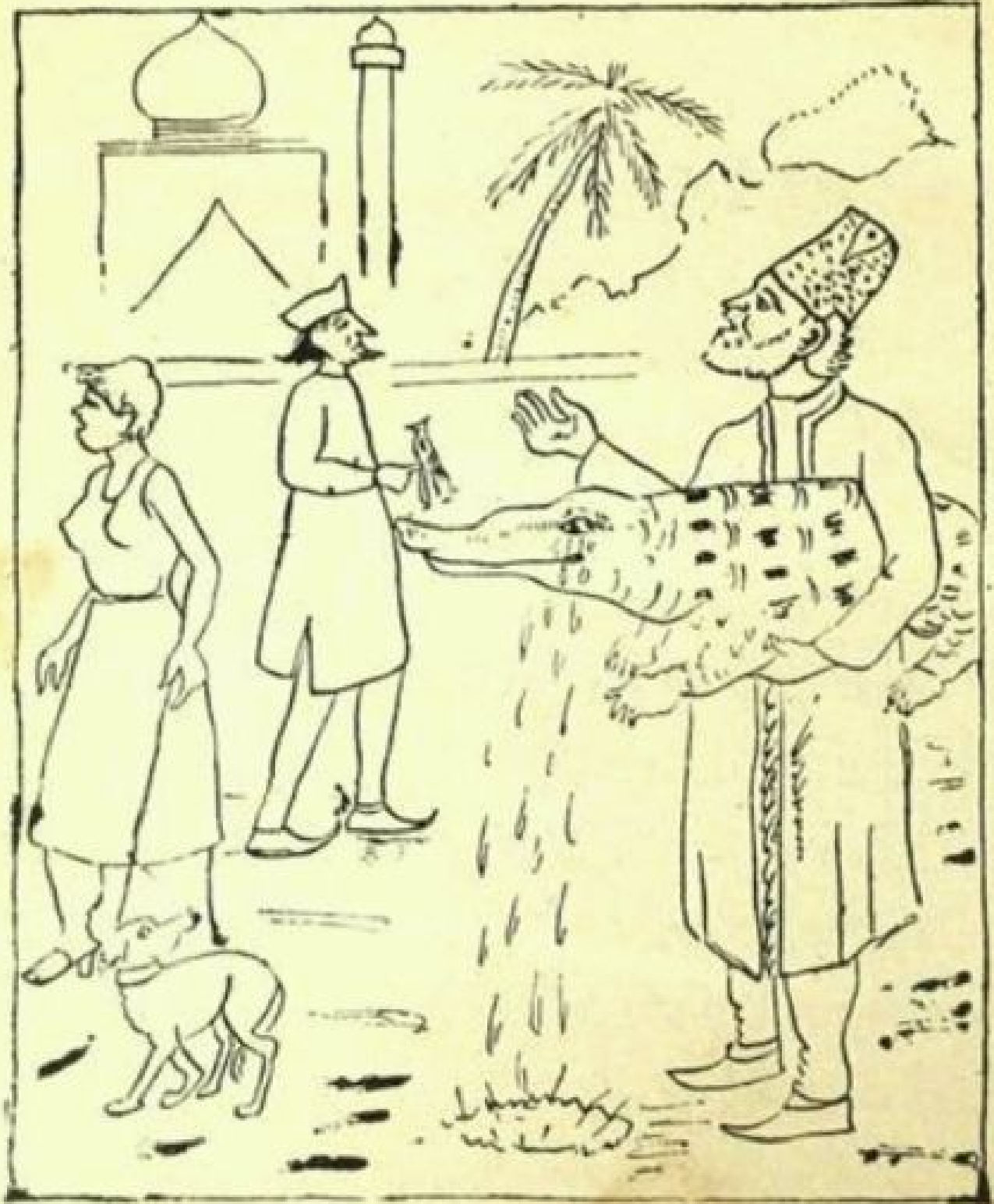
بتایا جاتا ہے اور کہیں ایک غیر شاعر سوداگر جو صناعت شعر سے واقف نہیں اس کی ایرانیت، فارسی دانی، سخن فہمی اور سخن سنجی کی اہمیت جتائی جاتی ہے۔ لیکن چونکہ خراسانی عالم کے اعتراض خود ان کے شعر پر تھے اس لئے اعتراض قابل قبول نہیں ہوئے بلکہ جواب میں آسمان زمین ایک کر دیا لیکن شیرازی سوداگر کی ساری باتوں کو مان لیا اور خان آرزو نے کیا کہا وہ نہیں بتایا۔ شیرازی سوداگر نے جو کچھ بتایا وہ بھی تو ایک موقع کی تقریر تھی۔ غالب کی تمام باتیں "چت بھی اپنی پٹ بھی اپنی" کے اصول پر ہوتی ہیں۔

کلکتہ کے ایرانی تاجروں اور سفیر ہرات کفایت خاں نے غالب کی غزلیں سُن کر جو کچھ کہا اور جس انداز میں کہا، لکھنؤ کے ایرانی عالموں اور تاجروں کی ایرانیت سے جن وجوہ کی بنا پر انکار کیا گیا اور شیرازی سوداگر اور خان آرزو کا واقعہ جس ڈھنگ سے بیان کیا گیا ان سب بیانات کا ساز و سامان ایک بولتی زبان کی طرح بتا رہا ہے کہ یہ ساری باتیں یا ان باتوں کا پچانوے فیصدی حصہ غالب کا نتیجۂ فکر ہے۔ سخن سازی کرتے وقت اس قدر تصنع اور مبالغہ سے کام نہیں لینا چاہئے کہ حقیقت بے نقاب ہو جائے۔

خراسانی عالم عارف علی شاہ کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ نقاب کے ساتھ عارض یا رُخ کا ہونا ضروری ہے۔ اس کے جواب میں غالب نے خراسانی عالم کو نقاب کے معنے بتائے ہیں۔ غالب ایک خط میں صاحب عالم سے کہتے ہیں کہ "نظامی اب ایسا ہوا کہ جب تک فرید آباد کا کھتری بچہ قتیل اس کی تصدیق

نہ کرے تب تک اس کا کلام قابلِ استناد نہیں۔ اس موقعے پر کہا جاسکتا ہے کہ علمائے خراسان اب ایسے ہوئے کہ اکبرآباد کا ترک بچہ غالب جب تک ان کو نقاب کے معنے نہ بتائیں وہ نقاب کے معنی نہیں جان سکتے۔ بہرحال غالب نے جو معنی بتائے ہیں وہ نقاب کے نئے معنی ہیں بلکہ نقاب ہی نیا ہے۔ غالب کے بتائے ہوئے معنوں کے مطابق دیوارِ خانہ کو دیوارِ خانہ نہ کہیں گے بلکہ نقابِ اہلِ خانہ کہیں گے۔ غالب خود کہتے ہیں کہ گرد و غبار میں آفتاب چھپ جاتا ہے۔ لہٰذا آفتاب گرد و غبار میں چھپ جائے تو اس وقت گرد و غبار کو نقابِ آفتاب کہنا چاہیے۔

خوش قسمتی تھی کہ جس وقت غالب نے صائب کا شعر سند کے طور پر پیش کیا اس وقت یگانہ چنگیزی موجود نہ تھے وہ ہوتے تو کہتے کہ غالب کا شعر پورا نہیں تو آدھا مال مسروقہ ہے۔ کیونکہ صائب اور غالب دونوں کے شعروں میں وہی "گنج" وہی "دریں خراب" اور وہی گنج در خراب ہونے پر افسوس ہے۔

غالب کو اپنی فارسی زبان اور کلام پر پورا اعتماد اس لئے تھا کہ انھوں نے فارسی میں جو کچھ کہا اساتذۂ ایران کے کلام سے استفادہ کرکے کہا لیکن استفادہ ایک کم نظر مقلد کی طرح نہیں کیا بلکہ ایک ذہین و فنکار مجتہد اور نقادِ گراں مایہ کی طرح کیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر اوقات ایرانی اُستادوں کے نقائص نہ صرف دور کردیتے ہیں بلکہ ہر لحاظ سے شعر کو بلند کردیتے ہیں۔ مثلاً

عرفی کا شعر ہم سمندر باش و ہم ماہی کہ در جیحونِ عشق

موجِ دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش است

غالب کا شعر　　بے تکلف در بلا بودن بہ از بیم بلاست
قعرِ دریا سلسبیل و روئے دریا آتش است

نیاز فتحپوری کا محاکمہ۔ عرفی کے شعر کا مطلب یہ ہے کہ عشق کے جیحون (ایک نہر یا دریا کا نام ہے) میں پڑ کر ضرورت ہے کہ انسان سمندر (ایک کیڑا ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ آگ میں پیدا ہوتا ہے اور آگ ہی میں رہتا ہے) بھی بنا رہے اور مچھلی بھی۔ کیونکہ اس دریا کی موج (یعنی بالائی سطح) سلسبیل (بہشت کے ایک چشمے کا نام) ہے اور اس کی گہرائی آگ ہے۔ مدعا یہ کہ اگر کوئی شخص عشق کی ابتدا اور انتہا دونوں سے جان سلامت لے جانا چاہتا ہے تو اس کو سمندر اور ماہی دونوں ہونا چاہئے تاکہ جب سطح پر ہو تو تیرتا رہے اور جب تہ میں پہنچ جائے تو وہاں کی گرمی سے متاثر نہ ہو۔

بظاہر یہ شعر معنی آفرینی کی اچھی مثال نظر آتا ہے۔ لیکن ایک نقاد کو اس میں کئی نقائص نظر آئیں گے۔ سب سے پہلا نقص تو انتخاب الفاظ کا ہے۔ پہلے مصرعہ میں شاعر نے جیحون کا لفظ استعمال کیا ہے جو ایک رودبار کا نام ہے اور مجازاً دریا کے مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں اسی کو وہ ایک سلسبیل کہتا ہے اور دوسری جگہ دریا۔ حالانکہ یہ تینوں چیزیں علٰحدہ علٰحدہ حیثیت رکھتی ہیں۔ دوسرا معنوی نقص یہ ہے کہ مصرعہ ثانی میں سلسبیل کا لفظ جیحون کے مقابلے میں تنزّل کا درجہ رکھتا ہے۔ اگر سلسبیل سے مراد محض چشمۂ جاری ہو تو بھی وہ ایسی چیز نہیں جس میں سوا مچھلی کے اور کوئی شناوری نہ کر سکے

مصرعہ ثانی کے دوسرے ٹکڑے میں جو منظر پیش کیا گیا ہے وہ یقیناً سمندر کے لیے موزوں ہے۔ لیکن پہلے ٹکڑے میں سلسبیل کا لفظ منظر کی کوئی ایسی خصوصیت ظاہر نہیں کرتا جو صرف ماہی کے لیے موزوں ہو۔ سلسبیل کے مفہوم کی روایتی شگفتگی و مسرت اس کی مقتضی نہ تھی کہ اسے کسی مصیبت کے اظہار کے لیے استعمال کیا جاتا۔ علاوہ ان نقائص کے خود مفہوم میں بھی کوئی جدت نہیں۔ ظاہر ہے کہ مچھلی ہمیشہ پانی میں تیرتی ہے اور سمندر آگ میں رہتا ہے۔ غالب نے انھیں نقائص کو سامنے رکھ کر عرفی کے شعر میں تصرف کیا۔ غالب کہتا ہے کہ مصیبت میں پڑ جانا اس مصیبت کے خوف سے بہتر ہے اور اس کا ثبوت اس نے دوسرے مصرعہ میں یہ دیا کہ جب تک انسان دریا کی سطح پر ڈوبنے سے بچنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا ہے پریشان رہتا ہے۔ لیکن جب وہ ڈوب کر دریا کی تہہ میں پہنچتا ہے تو ساری مصیبت دور ہو جاتی ہے۔ گویا سطح آب اس کے لیے آگ تھی اور قعر دریا سلسبیل بن گیا۔ غالب نے سلسبیل کا استعمال بہت صحیح کیا اور معنی آفرینی اپنی جگہ ہے (غالب نمبر نگار)

عرفی اور غالب کے شعروں کا جائزہ جس طرح لیا گیا ہے وہ کسی قدر محل نظر ہے۔ عرفی نے تشبیہی طور پر عشق کو ایک ایسا دریا تصور کیا ہے جس کی سطح خوشگواری اور راحت بخشی میں سلسبیل اور اس کی گہرائی آتش ہے۔ لہٰذا دریائے عشق میں رہنے کے لیے شناور (یعنی عاشق) کو اپنے اندر مچھلی اور سمندر دونوں کے خواص پیدا کرنا چاہئیں تاکہ وہ سطح پر رہے یا گہرائی میں

رہے دونوں جگہ چین سے رہے۔ اس اعتبار سے ہم سمندر باش وہم ماہی کہہ کر شعر میں ایک کیفیت پیدا کر دی ہے۔ غالب نے بالکل معمولی طور پر سیدھا سیدھا کہہ دیا کہ مصیبت سے ڈرتے رہنے سے بہتر ہے کہ مصیبت میں پڑ جایا جائے اور مصیبت سے چھٹکارہ یا ابدی راحت کا ذریعہ ڈوب کر مر جانے کو بتایا ہے۔ عرفی کے یہاں موت کی دعوت نہیں بلکہ اپنے اندر حوادثات سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے اور اپنے کو ماحول کے مطابق بنانے کا پیغام ہے۔ لہٰذا عرفی کے یہاں رجائیت اور زندگی کی سرگرمی پائی جاتی ہے اور غالب کے یہاں قنوطیت اور فرار

عرفی کے شعر میں مجھے ایک ہی لفظ کھٹک رہا تھا اور وہ لفظ ہے "موج" جو سطح کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ لیکن یہی شعر دوسری جگہ دیکھا تو "موج" کی بجائے لفظ "روے" تھا۔

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

غالب

قاطع برہان کا ہنگامہ

کلکتے کے مشاعرے کا ہنگامہ ایک ایسا ہنگامہ تھا جو کلکتے تک محدود رہا اور غالب کے ایک مثنوی لکھ دینے سے فرو ہوگیا۔ لیکن قاطع برہان کا ہنگامہ ایک علمی جنگ تھی جو دہلی سے کلکتے تک چھڑ گئی تھی اور اس کا خاتمہ غالب کے موت کے ساتھ ہوا۔

قاطع برہان غالب کی ایک کتاب کا نام ہے۔ قاطع کے معنے کاٹنے والا اور برہان سے مراد برہان قاطع۔ لہٰذا قاطع برہان کے معنی وہ کتاب جو برہان قاطع کو کاٹنے والی ہے۔

برہان قاطع فارسی زبان میں فارسی الفاظ کی ایک مبسوط فرہنگ ہے۔ مادہ تاریخ طبع اس قطعہ سے

چوں برہاں از رہ توفیق یزداں　　　مرایں مجموعہ را گر دید جامع
پے تاریخ اتمامش قضا گفت　　　کتابِ نافعِ برہان قاطع

سنہ ۱۰۶۲ھ نکلتا ہے

جیسا کہ برہان قاطع کے سرورق اور دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فرہنگ کے مؤلف محمد حسین متخلص بہ برہان ابن خلف التبریزی تھے۔ دکن کے قطب شاہی بادشاہ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں دکن میں "فروکش" تھے۔ برہان کی جائے تولد معلوم نہیں لیکن وہ تبریزی کہلاتے تھے "فروکش" کا لفظ بتاتا

ہے کہ وہ دکن کے رہنے والے نہ تھے۔ بلکہ دکن میں سکونت پذیر تھے۔ اگرچہ ابن الخلف التبریزی کچھ بے ڈھنگا سا فقرہ ہے لیکن اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے والد یا دادا تبریزی تھے۔ غالب کو برہان کے تبریزی اور فارسی زبان ہونے کے علاوہ فارسی داں ماننے سے بھی انکار تھا۔ غالب برہان کے فارسی داں نہ ہونے کا ثبوت یہ پیش کرتے ہیں کہ اگر کسی کے آبا و اجداد میں سے کوئی تبریز سے آیا ہو تو یہ اس کے فارسی داں ہونے کا ثبوت نہیں ہو سکتا۔ جو ہندوستان میں پیدا ہوا وہ اپنے آبا و اجداد کے وطن کی زبان کیونکر جان سکتا ہے۔ غالب خود اپنی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ مجھ ہی کو لیجئے۔ میرے آبا و اجداد سلجوقی ترک تھے جو افراسیاب و فریدوں کے خاندان سے تھے۔ ان کی زبان توری یعنی ترکی تھی۔ جب سلجوقی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا تو ترک ماوراالنہر میں منتشر ہو گئے۔ ان منتشر ترکوں میں ایک سلطان ترسم خاں تھے۔ جن کی نسل سے میں ہوں۔ یہ سمرقند میں مقیم تھے۔ شاہ عالم کے وقت میں میرا خاندان ہندوستان میں آکر اقامت گزیں ہوا۔ جن لوگوں نے خان موصوف کو دیکھا وہ کہتے تھے کہ خان ترکی بولتے تھے اور ہندی نہیں جانتے تھے۔ لیکن ان کی چند پشتوں میں میں ہوں۔ ترکی بولنا تو دور کی بات، ترکی کے حروف تہجی سے بھی آشنا نہیں ہوں۔ مولوی دکنی (یعنی برہان) جو ہندوستان میں پیدا ہوا فارسی کیونکر جان سکتا ہے۔ فارسی جاننے کے لئے تو مناسبت طبع، سلامت فکر اور تتبع اہل زبان ہونا چاہئے (قاطع برہان)

آقا احمد علی برہان کے تبریزی ہونے پر مصر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ سب

جانتے ہیں کہ محمد حسین تبریزی تھے۔ لیکن غالب سب کے برخلاف بے دلیل
انھیں دکنی کہتے ہیں۔ یہ ایسا ہوا جیسے غالب ہند نژاد کو بنگالی کہا جائے۔
اگرچہ میرے پاس برہان کے تبریزی ہونے کی کوئی مضبوط دلیل نہیں ہے
تاہم دلیل یہ ہے کہ ملا فیروز بن ملا کاؤس اور صاحب غیاث اللغات انھیں
تبریزی اور اہل زبان لکھتے ہیں اور اسی طرح وہ مشہور بھی ہیں۔ وہ اپنے کو
ابن خلف التبریزی لکھتے ہیں۔ لیکن غالب ان سب باتوں کا اعتبار نہیں کرتے۔
میں ایک دلیل پیش کرتا ہوں۔ ارباب عقل اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایک ایرانی اگر
سو سال ہندوستان میں بسر کرے تو وہ ایک چار سال کے بچے کے ساتھ اردو
زبان ٹھیک بول نہیں پاتا اور اپنی زبان کے الفاظ و تلفظ بول جاتا ہے۔
بالخصوص مخلوط حرف یعنی بھ، پھ، تھ، جھ، چھ وغیرہ ادا نہیں کر سکتا۔
اس وجہ سے وہ پانو کو پاؤ، چھوکری کو چوکری، تھوڑا کو تورا بولتا ہے۔
لہٰذا برہان کا ایسا تلفظ لکھنا ان کے ایرانی ہونے کی دلیل ہے۔ بس جس طرح
ظہوری کو دکن میں رہنے کی وجہ سے دکنی نہیں کہا جا سکتا اسی طرح برہان کو بھی
وہاں اقامت گزیں ہونے پر دکنی نہیں کہا جا سکتا۔ فرض کیا کہ وہ باہر کے رہنے
والے نہ تھے۔ مگر کیا ضرور ہے کہ وہ دکن ہی کے رہنے والے تھے۔

بہرحال برہان قاطع سنہ ۱۰۶۲ھ میں مرتب ہوئی تھی۔ سنہ ۱۸۰۰ء تک اس کے
چار پانچ اڈیشن نکل چکے تھے۔ اب یہ نایاب ہو رہی تھی۔ کپتان ٹامس روبک
نے سنہ ۱۸۱۸ء / ۱۲۳۳ھ میں بڑے اہتمام کے ساتھ برہان قاطع شائع کی۔ انھوں نے
خود انگریزی میں تمہید لکھی۔

انگریز گورنر جنرل فرانسس مارکوئس آف ہسٹنگز (یعنی لارڈ ہسٹنگز) کے عہد حکومت میں کپتان ٹامس روبک فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں شعبۂ ہندوستانی میں مدرس ثانی اور عربی، فارسی، ہندی اور برج بھاشا کے ممتحن تھے۔ روبک صاحب اپنی فارسی کی صلاحیت کو مستحکم کرنے کے لئے فارسی لغات کی چھان بین میں لگے رہتے تھے۔ فارسی زبان کی جو فرہنگیں انگریزی زبان میں تھیں وہ تو ان کے مطالعے میں رہتی ہی تھیں لیکن وہ فرہنگیں بھی دیکھا کرتے تھے جو فارسی زبان میں تھیں۔ چنانچہ انھوں نے فرہنگ جہانگیری، فرہنگ رشیدی اور برہان قاطع وغیرہ کا بھی بغور مطالعہ کیا تھا۔ فارسی زبان میں جتنی فرہنگیں دیکھیں ان میں ان کو برہان قاطع سب سے زیادہ مبسوط، بہترین طور پر مرتب اور عام طور پر سب سے زیادہ مفید نظر آئی۔ لیکن دیگر مشرقی مخطوطات کی طرح برہان قاطع بھی کتابت کی غلطیوں سے بھرپور تھی۔ اس لئے روبک صاحب نے چند نسخے مہیا کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تاکہ غلطیوں کی تصحیح کی جا سکے اور ان کے استعمال کے لئے ایک صحیح نسخہ تیار ہو سکے۔ اس خیال کے زیر اثر انھوں نے چند نسخے مہیا کر لئے۔ اب انھوں نے دو صاحبان علم و فضل مولوی حیدر علی بلگرامی اور مولوی نظام الدین دہلوی کو مقرر کر کے تصحیح کا کام سپرد کیا۔ مگر شروع ہی میں انھیں معلوم ہوا کہ کتابت کی اس قدر غلطیاں اور مختلف مخطوطات اور نسخوں میں اس قدر اختلافات ہیں کہ تصحیح کا کام اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہندوستان کے دوسرے مقامات سے اور بھی نسخے اور بہتر نسخے

دستیاب نہ ہولیں۔ چنانچہ کلکتے میں جتنے نسخے ملے روبک صاحب نے خرید لئے۔

برہان قاطع کے متعلق ایک روبک صاحب ہی کا خیال اچھا نہ تھا بلکہ فارسی کے دیگر یورپین مستشرقین کا خیال بھی اچھا تھا۔ میجر جنرل سرجان میلکم نے اپنی گراں مایہ کتاب ہسٹری آف پرشیا (تاریخ فارس) میں سرولیم اوزلی نے اپنی کتاب اورینٹل جغرافی (مشرقی جغرافیہ) میں اور سانسیر ایل لانگلس نے اپنی کتاب عربین ٹیلس آف سندباد دسیلر (سندباد ملاح کے عربی افسانے) کے مقدمے کے حاشیے میں برہان قاطع کو ایک مستند تالیف تسلیم کیا ہے۔

روبک صاحب کو برہان قاطع طالبعلموں اور جویائے علم کیلئے اس قدر مفید نظر آئی کہ انھوں نے اس کے چھپوانے کا اہتمام شروع کر دیا۔ چنانچہ مولوی کرم حسین بلگرامی میر منشی شعبۂ عربی و فارسی، تاریچون متر میر منشی شعبۂ ہندوستانی فورٹ ولیم کالج، مولوی حیدر علی بلگرامی، منشی امام علی خیرآبادی، مولوی کاظم علی نصیرآبادی، مولوی محمد اکبر عظیم آبادی، حاجی محمد شفیع، مولوی نظام الدین دہلوی، مولوی غلام قادر آروی، مولوی صادق علی الٰہ آبادی کی کوشش و تعاون اور انتھک محنتوں سے برہان قاطع کا ایک نیا نسخہ ۱۸۱۸ء/۱۲۳۴ھ میں کلکتہ سے شائع ہوا۔ بیس پچیس فرہنگوں سے اس کی تصحیح کی گئی اور لارڈ ہسٹنگز کے نام سے انتساب کیا گیا۔

غالب کے وقت میں روبک کے نسخے کے علاوہ اور بھی کئی نسخے پائے جاتے تھے۔ برہان قاطع ارباب علم میں بہت مقبول تھی۔ اس لئے غالب جن پر ہند و پاکستان کے تمام فارسی شاعروں، ادیبوں اور مصنفوں کی مٹی پلید کر کے اپنی

فارسی دانی اور یکتائی کی دھاک بٹھانے کا ایک جنون سا سوار تھا۔ برہان قاطع کی مقبولیت کو کیونکر برداشت کر سکتے تھے۔ لہٰذا اس کی بھی مٹی پلید کرنا ضروری سمجھا۔

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد کا زمانہ اس مقصد کے لئے مفید ثابت ہوا۔
غدر کے بعد کا زمانہ بڑا پُرآشوب زمانہ تھا۔ انگریز جوشِ انتقام سے سیماب پا ہو رہے تھے۔ چُن چُن کر انتقام لے رہے تھے۔ اچھے اچھے لوگ معتوب ہوئے۔ خود غالب کو مخدوش نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ غالب اس زمانے کی تصویر یوں کھینچتے ہیں۔

بسکہ فعال مایرید ہے آج　　　ہر سلح شور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے　　　زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے　　　گھر نمونہ بنا ہے زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک　　　تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک　　　آدمی واں نہ جا سکے یاں کا

اس دہشت انگیزی اور ہلاکت خیزی کے زمانے میں غالب گھر سے باہر نہیں نکلتے تھے اور اپنا وقت کتب بینی اور تالیف و تصنیف میں گزارتے تھے۔
اسی زمانے میں انھوں نے قدیم نثر فارسی 'ناآمیختہ' عربی میں "دستنبو" لکھی جس میں گیارہویں مئی ۱۸۵۷ء سے اکتیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک پندرہ مہینے کا حال لکھا ہے۔ اس میں چشم دید کوائف و حالات ہیں۔
دستنبو لکھ چکنے کے بعد ۱۸۶۰ء سے برہان قاطع کا معاندانہ اور معترضانہ

مطالعہ شروع کیا۔ چودھری عبدالغفور سرور کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "واماندگی کے دنوں میں چھاپے کی برہان قاطع میرے پاس تھی۔ اس کو میں دیکھا کرتا تھا۔ ہزارہا لغت غلط، ہزارہا بیان لغو، عبارت پوچ، اشارات پادر ہوا۔ میں نے دو سو لغت کے اغلاط لکھ کر ایک مجموعہ بنایا ہے اور قاطع برہان اس کا نام رکھا ہے۔ مسودہ کاتب سے صاف کروالیا ہے۔" (عود ہندی)

سرور کو ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں کہ "جن لوگوں کے محقق ہونے پر اتفاق ہے جمہور کو ان کا حال کیا گذارش کروں۔ ایک ان میں برہان ہے۔ اب ان دنوں میں برہان قاطع دیکھ رہا ہوں اور اس کی فہم کی غلطیاں نکال رہا ہوں۔ اگر زیست باقی ہے تو ان نکات کو جمع کرکے اس کا نام قاطع برہان رکھوں گا۔" (عود ہندی)

غالب کے قول کے موافق قاطع برہان ۱۸۶۲ء میں چھپی۔ قطعہ تاریخ از غالب۔

یافت چوں گوشمال زیں تحریر	آنکہ برہان قاطعش نام است
شد مسمی بہ قاطع برہان	ورس الفاظ سال اتمام است

اس کتاب کا دوسرا اڈیشن درفش کاویانی کے نام سے شائع ہوا۔ قاطع برہان کی وجہ تالیف خود غالب کی زبان سے سنئے۔ پہلے کہتے ہیں کہ "میں خدائے دانش و داد پسند کی پناہ چاہتا ہوں اور دانش خدا کی جانب سے ہے تاکہ لوگ میری گرفت نہ کریں اور خردہ گیری پر نہ اتر آئیں کہ یہ شخص دو سو سال کے

مُردے کی دُشمنی پر کیوں آمادہ ہو رہا ہے۔ میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ مجھے نہ تو محمد حسین دکنی (یعنی جامع برہان قاطع) سے کوئی بحث ہے اور نہ برہان قاطع کی شہرت پر حسد۔" اس کے بعد کہتے ہیں کہ چونکہ برہان قاطع میں غلط باتیں ہیں اور یہ لوگوں کو گمراہ کرتی ہے اور چونکہ میں اُستادی کے مرتبے پر فائز ہوں اس لئے میرے دل میں اپنے پیروؤں کا خیال آیا۔ لہٰذا ان کی رہنمائی کی تاکہ وہ راہ سے بے راہ نہ ہو جائیں (دیباچہ قاطع برہان)

اب سوال ہے کہ اگر جامع برہان سے دُشمنی بھی نہیں اور برہان قاطع کی شہرت پر حسد بھی نہیں بلکہ لوگوں کو گمراہی سے بچانا مقصود تھا تو ہزارہا غلط لغات میں سے صرف دو سو لغات کی نشاندہی پر قناعت کیوں کی؟ باقی غلط الفاظ کی گمراہی سے کون بچائے گا۔ قاطع برہان کے مطالعہ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں صرف ایک سو ساٹھ غلطیوں سے بحث کی گئی ہے جن میں صرف ایک سو تیس غلطیاں قاطع برہان کی ہیں۔ اگر فی الواقعہ دُشمنی و حسد کی بات نہ تھی بلکہ رہنمائی مطلوب تھی تو ایک "اصح اللغات" مرتب کر دیتے۔ یا کم سے کم برہان قاطع کی جن ہزارہا اغلاط کو پا لیا تھا انھیں جامع برہان کا مذاق اُڑائے اور ان کو گالیاں دئے بغیر مہذبانہ الفاظ میں "افادات غالب" کے نام سے شائع کرتے۔ پہلے ہی سے یہ صفائی پیش کرنا کہ مجھے کوئی دُشمنی اور حسد نہیں دلی دُشمنی و حسد کا پتہ دیتا ہے۔ کتاب کا نام بھی دُشمنی و حسد کو واضح کرتا ہے کیا "تصحیح برہان" یا "اصلاح برہان" نام نہیں ہو سکتا تھا۔ اور یہ کہنا کہ ہزارہا لغت غلط، لیکن صرف ایک سو تیس اغلاط شائع

کرنا غلط بیانی کی واضح دلیل ہے۔ ہزار ہا اغلاط سے صرف ایک سو تیس اغلاط شائع کرنے کا مطلب تو یہ ہے کہ ایک سو تیس سے زیادہ اغلاط نہ نکال سکے اور فقط اپنی دھاک جمانے کے لیے ہزار اغلاط لکھ مارا۔ سوچا تھا کہ کون تحقیق کر کے دیکھتا ہے کہ اتنی غلطیاں ہیں کہ نہیں۔ مؤید برہان اور قاضی عبدالودود صاحب کے بیانات کے مطابق غالب کے اکثر اعتراضات غلط ہیں۔ بہرحال قاطع برہان کی تالیف کا مقصد اپنی گرم بازاری اور یکتائی کی دھاک بٹھانا تھا۔

غالب نے ہند و پاکستان میں لکھی ہوئی فرہنگوں کو یک قلم ساقط الاعتبار اور پوچ قرار دیا اور ان کے جامعین کی شان میں بہت ہی گھناونے الفاظ استعمال کئے۔ جامع برہان کو دکنی اور دکنی بوہڑہ کہہ کر بار بار طعنہ دیتے ہیں۔

مولوی غیاث الدین رامپوری فارسی کے شاعر تھے اور عزت تخلص کرتے تھے۔ غیاث اللغات انھیں کی تصنیف ہے۔ غیاث اللغات بھی بہت مشہور و مقبول ہو رہی تھی۔ غالب کے قول کے مطابق ان کے شاگرد رشید منشی ہرگوپال تفتہ غیاث اللغات کے بڑے معتقد تھے۔ (اردوے معلی)

غالب کو غیاث الدین سے حد درجہ نفرت تھی۔ وہ غیاث الدین کو محمد حسین برہان سے اور غیاث اللغات کو برہان قاطع سے بد تر سمجھتے تھے۔ مولوی غیاث الدین کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ (غیاث الدین) ایک معلم فرومایہ، رامپور کا رہنے والا، فارسی سے ناآشنائے محض اور صرف و نحو میں ناتمام انشاء خلیفہ و منشیات مادھو رام کا پڑھانے والا۔ چنانچہ دیباچہ میں اپنا ماخذ بھی اس نے خلیفہ شاہ محمد و مادھو رام و غنیمت و قتیل کے کلام کو لکھا۔ یہ لوگ راہ سخن کے

غول ہیں۔ آدمی کے گمراہ کرنے والے۔ فارسی کیا جانیں۔ ہاں طبع موزوں رکھتے تھے۔ شعر کہتے تھے (اردوئے معلیٰ)

قاضی عبدالجلیل کو لکھتے ہیں کہ غیاث الدین رامپوری ایک مُلّائے مکتبی تھا۔ نا قتیل نا قل۔ جس کا ماخذ اور مستند علیہ قتیل کا کلام ہوگا۔ اس کا فن لغت میں کیا فرجام ہوگا (عود ہندی)

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں کہ اس سے زیادہ نہ مجھ کو علم نہ یارائے کلام۔ قتیل لکھنوی اور غیاث الدین رامپوری کی قسمت کہاں سے لاؤں کہ تم جیسا میرا معتقد ہو اور میرے قول کو معتمد سمجھو (عود ہندی)

ایک اور خط میں لکھتے ہیں کہ رامپور گیا تو معلوم ہوا کہ غیاث الدین ایک ملائے مکتبی ہے، صاحب مقدور لڑکوں کو پڑھاتا ہے۔ گمنام شخص ہے۔ نہ کوئی رئیس اسے جانتا ہے۔"

غیاث اللغات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "میں غیاث اللغات کو حیض کا لتہ سمجھتا ہوں (مضمون قاضی عبدالودود صاحب۔ نقد غالب' جہان غالب)

تیغ تیز میں لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ رامپور جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں کے صاحبزادگان عالی تبار اور رؤسائے نامدار سے ملاقاتیں اور صحبتیں رہیں تو اس شخص کا (یعنی غیاث الدین کا) حال معلوم ہوا کہ ایک مُلّائے مکتب دار، نہ رئیس کا روشناس نہ اکابر شہر کا آشنا۔ ایک گُمنام مکتبدار تھا۔ چند صاحب مقدور لڑکے مکتب میں پڑھتے تھے۔ انھوں نے صرف زر میں اس کو مدد دی۔ مثل نیدہ کے جس نے نجار کی تقلید کی تھی ایک فرہنگ چھپوائی۔

غالب نے یہاں دیانتداری اور راستگوئی سے کام نہیں لیا۔ غالب کا یہ کہنا کہ غیاث الدین ایک گمنام شخص ہے، اسے کوئی نہیں جانتا اور نہ رئیس سے اس کا کوئی تعلق ہے۔ اخفائے حقیقت ہے۔ مولانا امتیاز علی عرشی "مکاتیب غالب" میں والیٔ رامپور نواب یوسف علی خاں بہادر کے حالات میں لکھتے ہیں کہ آپ نے (یعنی نواب صاحب موصوف نے) عربی و فارسی کی باقاعدہ اور ایک حد تک مکمل تعلیم پائی تھی۔ فارسی میں خلیفہ غیاث الدین عزت مصنف غیاث اللغات اور مرزا غالب سے اور علوم عربیہ و حکمیہ میں مفتی صدرالدین آزردہ اور مولانا فضل حق خیرآبادی سے تلمذ تھا۔ نواب صاحب کے صاحبزادے کلب علی خاں کے حالات میں عرشی صاحب لکھتے ہیں کہ نواب کلب علی نے غیاث الدین سے فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی۔

مقدم الذکر نواب غالب سے اُردو اور فارسی کلام پر اصلاح لیتے رہے تھے۔ لیکن موخرالذکر نواب نے جو غالب کے شاگرد نہ تھے۔ اپنے والد کا عنایت کردہ غالب کا وظیفہ جاری رکھا۔ غالب کو اچھی طرح معلوم تھا کہ دونوں نوابین نے غیاث الدین سے فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی۔

اپنی فارسی دانی اور یکتائی کی دھاک بٹھانے کے لئے ذرا ذرا سی بات پر فرہنگ نویسوں سے اظہار نفرت کرنا اور ان کو گالیاں دینا غالب کی ایک مستقل عادت بن چکی تھی۔ غالب کی اس نازیبا حرکت سے ایک دفعہ والیٔ رامپور نواب کلب علی خاں ان سے ناراض ہو گئے تھے۔

مولوی محمد عثمان مدارالمہام ریاست رامپور نے قصائد بدر چاچ کی ایک

شرح لکھی تھی جس کا دیباچہ فارسی میں نواب کلب علی نے لکھا تھا اور بغرض اصلاح غالب کے پاس بھیجا تھا۔ اس دیباچہ میں میں نواب صاحب "ارتنگ" بمعنی "ارژنگ" اور "آشیاں چیدن" بمعنی "آشیاں بستن" استعمال کیا تھا۔ غالب ارتنگ کو ارژنگ اور آشیاں چیدن کو آشیاں بستن بنا دیا۔ نواب صاحب نے اس ترمیم کو تسلیم نہ کیا اور فرہنگ جہانگیری مولفہ انجو اور فرہنگ رشیدی مولفہ عبدالرشید تتوی اور دوسری لغت کی کتابوں سے اپنی عبارت کے جواز میں نظریں پیش کیں۔ انھوں نے غالب کو لکھا کہ "اکثر مالک رقابان علم لغت ارتنگ و اژ رنگ را بالمعنی واحد پنداشتہ اند و عامہ مفسران کلام شیرازی مشار "الیہ "آشیاں چیدن" را مرادف "آشیاں بستن" نگاشتہ۔ چنانچہ نظر بر کے ملفوف عنبریں نامہ ہذا است، بمطالعہ خواہد رسید۔ مع ہذا اگر طبع آں اوستاد زماں بہ ترقیم الفاظ فی الجملہ نفورے داشتہ باشد ہمچناں حوالہ قلم نمایند کہ مبعوث عنہ را از تقریظ اصلاح شدہ چوں نفسانیت خود محو سازم زیرا کہ مرا ازاں مشفق واسطہ تلمذ بودہ است نہ از عرفی و دیگراں (حیات غالب از اکرام)

نواب صاحب نے خط بڑی متانت اور خوش اخلاقی سے لکھا تھا۔ لیکن غالب کو ہندوستانی لغت نویسوں کے نام سے چڑھ تھی۔ ان کے جواب میں قاطع برہان کی تھوڑی بہت تلخی آگئی۔ غالب لکھتے ہیں کہ "بعد تسلیم معروض ہے کہ اس عنایت نامے میں ایک فقرہ نظر پڑا کہ جس سے میں کانپ اٹھا (مرا ازاں مشفق تلمذ بودہ است) یہ ذلیل کو عزت دینی اور دوکان بے رونق کی خریداری کرتی ہے۔ میں تو حضرت کو اپنا اُستاد اور اپنا پیر و مُرشد اور اپنا

آقا جانتا ہوں۔ بدوِ فطرت سے میری طبیعت کو زبان فارسی سے ایک لگاؤ تھا۔ چاہتا تھا کہ فرہنگوں سے بڑھ کر کوئی ماخذ مجھ کو ملے۔ بارے مُراد بر آئی اور اکابر پارس میں سے ایک بزرگ (یعنی ہرمزد عبد الصمد) یہاں وارد ہوا اور اکبر آباد میں فقیر کے مکان پر دو برس رہا اور میں نے اس سے حقائق و معارف زبان پارسی کے معلوم کئے۔ اب مجھے اس امر خاص میں نفس مطمئنہ حاصل ہے۔ مگر دعوئ اجتہاد نہیں۔ بحث کا طریقہ یاد نہیں۔ یہاں انجو جامع فرہنگ جہانگیری و شیخ رشید راقم فرہنگ رشیدی علمائے عجم میں سے نہیں۔ ہند ان کا مولد، ماخذ ان کا اشعار قدما، ہادی ان کا قیاس، ٹیک چند اور وارستہ سیالکوٹی ان کے پیرو۔ فقیر اشعار قدما کا معتقد، ان لوگوں کے کلام کا عاشق مگر جو لغات ان کے کلام میں ہیں ان کے معنی تو اہل ہند نے اپنے قیاس سے نکالے ہیں۔ میں ان کے قیاس پر کیونکر تکیہ کروں۔ اب پیر و مُرشد نے لکھا کہ ارتنگ اور اژرنگ متحد المعنی اور آشیاں ساختن و بستن و چیدن گھونسلا بنانے کے معنی پر ہے تو میں نے بے تکلف مان لیا۔ لیکن نہ ان صاحبوں کے قیاس کے بموجب، بلکہ اپنے خداوند نعمت کے حکم کے بموجب
(حیات غالب از اکرام)

اس خط میں غالب نے بالکل وہی طریقہ اختیار کیا جو اپنے "سہرا" کے مقطع میں بہادر شاہ کے معاملے میں اختیار کیا تھا۔ ان کا مقطع ہے۔

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

یعنی بادشاہ بہادر شاہ ظفر سخن فہم نہیں۔ اگر وہ سخن فہم ہوتے تو ذوق کی بجائے مجھے اُستاد اور ملک الشعرا بناتے۔ لہٰذا چیلنج دیتا ہوں کہ ذوق سے اس سے بہتر سہرا لکھوا دیں اور ذوق بھی ذرا لکھ دے۔ غالب نے سمجھا تھا کہ بادشاہ سخن فہم نہیں ہیں۔ وہ اس چوٹ کو نہ سمجھ پائیں گے۔ مگر جب دل کا چور پکڑا گیا اور بادشاہ کی فرمائش پر ذوق نے فی البدیہہ ایک سہرا لکھ دیا تو غالب خوف زدہ ہوئے اور قطعہ معذرت لکھا جس میں کہا کہ

اُستاد شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال — یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر — سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات — منظور اس سے قطع محبت نہیں مجھے

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ — سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے

غالب نے نواب کلب علی خاں کو جو خط لکھا۔ اس میں صرف یہی نہیں کہ ان تمام لغت نویسوں کو ساقط الاعتبار، کج فہم اور ذلیل قرار دیا جو نواب صاحب کی نظر میں قابل قدر تھے بلکہ در پردہ خود نواب صاحب پر بھی چوٹ کی۔ ایک تو یہ کہنا کہ ٹیک چند اور وارستہ سیالکوٹی جامع فرہنگ جہانگیری اور جامع فرہنگ رشیدی کے پیرو ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ نواب صاحب بھی ٹیک چند اور وارستہ کی طرح ناقص الفہم انجو اور رشید کے پیرو ہیں۔ دوسرے یہ کہ غالب نے مان لیا لیکن ان ناقص الفہم لوگوں کے قیاس کے بموجب نہیں بلکہ نواب صاحب کے حکم کے بموجب یعنی انھوں نے نواب صاحب کا حکم مانا ان کے دلائل کو نہ مانا۔ کیونکہ ان کے سوا فارسی الفاظ کے معنی اور استعمال کوئی نہیں جانتا۔ علاوہ

اس کے غالب کا یہ بھی مطلب تھا کہ میں نے ٹیک چند، وارستہ اور نواب صاحب کی طرح غلط سلط فرہنگوں اور ہندیوں سے فارسی الفاظ کے معنی و استعمال نہیں سیکھا۔ بلکہ ایران کے ایک بزرگ سے فارسی زبان کے حقائق و معارف سیکھے۔ اسی لئے ہیں جو کہدوں ایک مبتدی کی طرح چُپ چاپ مان لینا چاہئے۔

غالب کے اس خط کو پڑھ کر نواب صاحب نے بہت بُرا مانا اور فارسی زبان میں غالب کو ایک خط لکھا جس کا خلاصہ یہ ہے۔

"آپ کا عجیب و غریب خط جس میں قدیم ہندی نژادوں پر غلط معنی بتانے کا الزام اور دوسری قسم کے اعتراض وارد کئے گئے ہیں اور یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ راقم الحروف (یعنی نواب صاحب) کو بحث کا طریقہ معلوم نہیں موصول ہوا اور بڑی حیرانی کا باعث ہوا۔ کیونکہ ابھی تک سوائے علمی امور کی تحقیق و تفتیش کے کوئی ایسی بات ظہور پذیر نہیں ہوئی کہ جسے بحث و اجتہاد کہا جا سکے۔ لیکن اب اس یگانۂ روزگار کی موشگافیوں پر حیران ہوں کہ میری تحریر کو بحث و اجتہاد پر محمول کیا گیا ہے اور اس طرح کے کنائے مثلاً راقم کو اُستاد کہنا یا لفظ بحث جو دونوں خلاف واقعہ اور تکدر رنجی کا باعث ہیں لکھے گئے ہیں۔ پس اگر آپ کو یہی منظور ہے تو اس امر کا اشارہ کر دیں بلکہ فریقین کے درمیان ترسیل مراسلات بند ہو جائے۔ ورنہ قلم کو غیر ضروری خارج از مقصد باتوں کی تفصیل سے باز رکھیں جس کا نتیجہ دردِ سر کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا ہے۔ راقم نے ان محققین کا پایہ جن کی تصنیفات مقبول عام ہیں اپنے سے

زیادہ سمجھ کر ان کے کلام کے حوالے دیے تھے۔ لیکن اگر آپ کے نزدیک
قابل قبول نہ تھے تو چاہیے تھا کہ مہربانی فرماکر ایسا ہی لکھ بھیجتے۔ میری سمجھ
سے باہر کی بات کو اس قدر طول کیوں دیا گیا۔ اس سے زیادہ لکھنا لقمان
کو نصیحت کرنا ہے۔"

نواب صاحب کا جواب پڑھ کر غالب ڈرے، کہ سو روپے کا ماہانہ وظیفہ جو
بیکسی کے عالم میں زندگی کا بہت بڑا سہارا تھا کہیں بند نہ ہو جائے۔ چنانچہ انھوں نے
نواب صاحب کو ایک معذرت آمیز خط لکھا اور معافی کے طالب ہوئے۔ لکھا کہ :۔

"توقیع وقیع آیا۔ پڑھتے ہی کانپ اٹھا اور عالم نظر میں تیرہ و تار ہو گیا
اگر حضور کے ارشادات کو بحث سے تعبیر کیا ہو تو مجھے جناب الٰہی اور
حضرت رسالت پناہی کی قسم۔ اگرچہ فاسق و فاجر ہوں مگر وحدانیت
خدا اور نبوت ختم الانبیا کا بدل معتقد اور بزبان معترف ہوں۔ خدا و
رسول کی قسم جھوٹی نہ کھاؤں گا۔ انکار بحث سے مراد یہ تھی کہ شعرائے ہند
کے کلام میں جو غلطیاں نظر آتی ہیں یا ہندی فرہنگ لکھنے والوں کے بیان
میں جو نادرستی اور باہم جو ان کے عقول میں اختلاف ہیں اس میں کلام
نہیں کرتا۔ اپنی تحقیق کو مانے ہوئے ہوں۔ اوروں سے مجھے بحث نہیں
با ایں ہمہ ضعف حافظہ یاد ہے کہ آخر میں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ ان دو باتوں
کو میں نے مانا لیکن یہ فرہنگ لکھنے والوں کی رائے کے بموجب نہیں بلکہ اپنے
خداوند نعمت کے حکم کے مطابق۔ یہ کلمہ موجب عتاب نہیں ہو سکتا اور اس کو
گناہ سمجھا جائے، آخر گناہ گار ہوں، کافر نہیں ہوں۔ گناہ معاف کیجئے اور

نوید عفو سے مجھ کو تقویت دیجئے۔ (ماخوذ از حیات غالب مؤلفہ اکرام)"

نواب کلب علی خاں نے خلیفہ غیاث الدین مصنف غیاث اللغات سے فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ نواب صاحب اپنے اُستاد کو بہت مانتے تھے۔ مگر غالب ان کا تذکرہ بڑی بد زبانی سے کیا کرتے تھے۔ نواب صاحب کے لئے یہ ناگواری کا باعث تھا۔ جہاں تک زباندانی کے معاملے میں بد زبانی کا تعلق ہے لکھنؤ کے مشہور شاعر مرزا ضامن علی جلال غالب کے جانشین تھے۔ ماہنامہ نگار کے کسی شمارہ میں ایک مقالہ میری نظر سے گذرا تھا جس میں لکھا تھا کہ ایک دفعہ ایک نشست میں نواب کلب علی، جلال اور دیگر اہل علم جمع تھے۔ ایک لفظ پر بحث چلی۔ جلال نے اکثر لوگوں کے برخلاف رائے ظاہر کی۔ ایک صاحب نے کہا کہ امیر مینائی صاحب بھی تو یہی کہتے ہیں۔ اس پر جلال بگڑ گئے اور کہا کہ " امیر تو امیٹھی کا رہنے والا ہے، وہ اُردو کیا جانے، میں لکھنؤ کا ہوں، اُردو میری زبان ہے۔ اس پر کسی نے کہا کہ داغ دہلوی بھی تو یہی کہتے ہیں۔ جلال بگڑ کر بولے کہ " داغ تو سطحی علم کا آدمی ہے، وہ کیا جانے " ایک صاحب بولے کہ غیاث اللغات میں بھی تو یہی لکھا ہے۔ اس پر جلال نے کہا کہ " غیاث اُلّو کا پٹھا کیا جانے "۔ نواب صاحب کو یہ بات بُری لگی۔ انھوں نے اشارہ کیا اور لوگوں نے جلال کو زبردستی وہاں سے اُٹھا دیا۔

تیغ تیز میں غالب لکھتے ہیں کہ اگر میں جامع غیاث اللغات کو آدمی جانتا ہوں تو میں خود آدمی نہیں۔ ایک بار " علم شے بہ از جہل شے " کی رعایت کرکے اس کتاب کو دیکھ لیا۔ جب دیکھا کہ جا بجا قتیل کے کلام کا حوالہ دیتا ہے اور ماخذ اس کا فن لغت میں (قتیل کی کتابیں یعنی) چار شربت اور نہر الفصاحت

ہے تو کتاب پر اور مولف پر لعنت بھیجی۔ جو میاں انجو کو نہ مانے گا وہ میاں غیاث الدین کو کیا جانے گا۔

اسی تیغ تیز میں انجو اور محمد حسین برہان کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ حضرت خاقانی و نظامی سچے یا انجو فرہنگ جہانگیری والا اور دکنی برہان قاطع والا سچا۔ وہ دو ایرانی بلند پایہ اور یہ دو ہندی فرومایہ۔

انجو جس کو غالب نے فرومایہ کہا ان کی گراں مائیگی شمشیر تیز تر کے مولف کی زبانی سنئے۔ لکھتے ہیں کہ عضد الدولہ جمال الدین انجو شیرازی صاحب فرہنگ جہانگیری اکبر کے دربار میں شش صدی منصب پر فائز تھے۔ جہانگیر کے وقت میں چہار ہزاری اور پنج ہزاری منصب پر فائز ہوئے۔ لہذا غالب کا یہ استخفاف و اتہام ہے کہ انجو فرہنگ جہانگیری والا ہندی فرومایہ ہے۔
(شمشیر تیز تر)

ایران میں جو فرہنگیں لکھی جاتی ہیں ان میں فرہنگ جہانگیری اور برہان قاطع کے حوالے سے معنی دیئے گئے ہیں۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے لغات نامہ دہخدا میں ان دو فرہنگوں کے حوالے سے لکھے ہوئے معنی دیکھے ہیں۔

انجو کی پوزیشن کے مقابلے میں غالب کا التماس بحضور بہادر شاہ ظفر سنئے جو ایک مفلوک الحال بادشاہ تھے۔

شاد ہوں اپنے جی میں کہ ہوں	بادشہ کا غلام کار گزار
خانہ زاد اور مرید اور مداح	تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار
بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر	نسبتیں ہو گئیں مشخص چار

نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں — مدعائے ضروری الاظہار

پیر و مرشد اگرچہ مجھ کو نہیں — ذوقِ آرائشِ سر و دستار

کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر — تا نہ دے بادِ زمہریر آزار

کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش — جسم رکھتا ہوں، ہے اگرچہ نزار

کچھ خریدا نہیں ہے ابکے سال — کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار

رات کو آگ اور دن کو دھوپ — بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار

آگ تاپے کہاں تلک انساں — دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار

دھوپ کی تابش آگ کی گرمی — وقنا ربنا عذاب النار

مری تنخواہ جو مقرر ہے — اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار

رسم ہے مُردہ کی چھ ماہی ایک — خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار

مجھ کو دیکھو تو ہوں بقیدِ حیات — اور چھ ماہی ہو سال میں دوبار

بس کہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض — اور رہتی ہے سود کی تکرار

آج مجھ سا نہیں زمانے میں — شاعرِ نغز گوے خوش گفتار

ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد — قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا — آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار

میری تنخواہ کیجئے ماہ بہ ماہ — تا نہ ہو مجھ کو زندگی دُشوار

یہ حال ان کا تھا جو نواب، نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ وغیرہ خطابات سے سرفراز تھے۔ لیکن یہ خطابات نام بڑے اور درشن چھوٹے کا مصداق تھے۔ اس صورت حال کی موجودگی میں غالب انجو وغیرہ کو کس منہ سے فرمایا کہتے

تھے۔ اب یہ کہ وہ فارسی کے زبردست عالم اور شاعر تھے۔ انھیں ان کو کون سا اعزاز ہاتھ آیا تھا۔ قاطع برہان لکھی تو درگت بنی۔

ہندوستان کے فارسی اہل قلم کے متعلق غالب اپنے خیالات دادخاں سیاح کی زبانی ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ فارسی دانانِ ہند محقق نہیں، مقلد ہیں۔ اکثر تو قتیل بے سرو مایہ کے پجاری ہیں۔ اس کی تالیفات کو آنکھ کی پتلی بنائے ہوئے ہیں۔ جو بلند پرواز ہیں وہ برہان قاطع کو عرش المعرفت جانتے ہیں اور اس کے اقوال کو مانتے ہیں۔ پس جب کوئی محقق حق و باطل کا ممیز ہو اور دکنی کے اغلاط ظاہر کرے تو وہ حضرات طیور آشیاں گم کردہ کیوں نہ بن جائیں۔ جب ان کا ماخذ تباہ ہو گیا تو وہ اب سند کس کو ٹھہرائیں (لطائف غیبی)

نواب کلب علی خاں بھی غالب کے اس قول کی زد میں آجاتے ہیں کہ غالب کے منافقین و منکرین ہزار در ہزار پیدا ہو جائیں گے، ہر چند اہل حق انھیں سمجھائیں گے لیکن وہ انکار سے باز نہ آئیں گے (لطائف غیبی)

لیکن غالب نے جس مقصد سے قاطع برہان لکھی تھی وہ مقصد پاش پاش ہو کر رہ گیا۔ غالب ہند و پاکستان کا بلا فصل فارسی کا ہیرو بننا چاہتے تھے۔ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ فارسی اور اردو شاعری میں ان کو ایک عظیم الشان مقام حاصل ہو چکا ہے۔ اور اب ان کی عمر بھی ایک واجب الاحترام بزرگ کی عمر ہو چکی تھی۔ لہٰذا لوگ ان سے مرعوب ہو کر ان کی تحقیقات سے متاثر ہوں گے اور انھیں فارسی کا واحد ہیرو مان لیں گے۔ مگر قاطع برہان کی اشاعت سے ان کی مٹی پلید ہو گئی۔ بقول انھیں کے "قاطع برہان کا لکھنا کیا تھا گویا باسی کڑاہی میں

وبال آگیا۔ وہ سہام ملامت کا ہدف بنے کہ یہ تنک مایہ اکابر سلف کا معارض ہوا۔"
(خط بنام مفتی عباس - اُردوے معلّٰی)

غالب انوار الدولہ سعد الدین شفق کو لکھتے ہیں کہ معتقدان برہان قاطع برچھیاں اور تلواریں پکڑ کے اُٹھ کھڑے ہوئے (اردوے معلّٰی)

قاطع برہان کی تردید و تنقیص میں چار کتابیں منظر عام پر آئی ہیں۔ تفاصیل ملاحظہ ہوں۔

۱۔ محرق قاطع - محرق کے لغوی معنی جلانے والا اور قاطع سے مراد غالب کی قاطع برہان - محرق قاطع سے مراد قاطع برہان کو جلانے والی کتاب - یہ چھیانوے صفحے کا رسالہ فارسی زبان میں ہے۔ ۱۸۶۲ء میں چھپی - اس کے مولف سید سعادت علی تھے جو پہلے ریزیڈنٹ راجپوتانہ کے دفتر میں میر منشی تھے - پنشن لینے کے بعد دہلی میں مقیم تھے - ان کی ایک کتاب حدائق العجائب تھی (ذکر غالب مصنّفہ مالک رام)

غالب تیغ تیز میں لکھتے ہیں کہ ایک مرد بے مغز، معوج الذہن، نہ فارسی داں نہ عربی خواں نے میری نگارش (یعنی قاطع برہان) کی تردید میں ایک کتاب بنائی اور چھپوائی اور محرق اس کا نام رکھا۔ منشی حبیب اللہ خاں ذکا کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "اہاہا! محرق قاطع کا تمھارے پاس پہنچنا - میں اس کی خرافات کا جواب کیا لکھتا۔ مگر ہاں سخن فہم دوستوں کو غصہ آگیا۔ ایک صاحب نے فارسی عبارت میں اس کے عیوب ظاہر کئے ہیں۔ دو طالبعلمان نے اردو میں دو رسالے جُدا جُدا لکھے۔ دانا ہو، منصف ہو، محرق کو دیکھ کر جانو گے کہ مؤلف اس کا احمق ہے اور جب وہ احمق "دافع ہذیان" و "سؤالات عبدالکریم" اور "لطائف غیبی" کو پڑھ کر متنبہ نہ ہوا اور محرق

کو دھو نہ ڈالا تو معلوم ہوا کہ بے حیا بھی ہے۔ (اُردوے معلٰی)

سعادت علی کی ہجو میں غالب نے ایک قطعہ بھی لکھا تھا

اے منشیٔ خیرہ سر سخن ساز نہ ہو   عصفور رہے تو مقابل باز نہ ہو
آواز تری نکلی اور آواز کے ساتھ   لاٹھی وہ لگی جس میں کہ آواز نہ ہو

جناب قاضی عبدالودود صاحب مآثر غالب میں لکھتے ہیں کہ سعادت علی اتنے غیر معروف آدمی نہ تھے جتنے کہ لطائف غیبی کے دیباچے سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ میر منشی دفتر فارسی محکمہ عالیہ صاحب انتظام امور کلی.... متعلقہ..... راجستان رہ چکے تھے۔ غالب سے ذاتی تعلقات بھی ہوں گے۔ ورنہ سعادت علی کی بنائی ہوئی مسجد اور کنوئیں کا قطعہ تاریخ نظم نہ کرتے (سبد چین مرتبہ مالک رام)

سعادت علی محرق قاطع کی وجہ تصنیف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میں نے ایک کتاب "حدائق العجائب" لکھی تھی اور اس کی تصنیف میں برہان قاطع سے مدد لی تھی۔ قاطع برہان میں جن لغات پر اعتراض ہیں ان میں سے چوبیس حدائق العجائب میں بھی تھے۔ فرہنگ رشیدی و فرہنگ جہانگیری وغیرہ کی طرف رجوع کیا تو اعتراض غلط نظر آئے۔ اندفاع اعتراضہاے غالب کے لئے یہ کتاب تحریر کی۔ قاضی عبدالودود لکھتے ہیں کہ سعادت علی نے بہت سی باتیں ٹھیک لکھی ہیں۔ لیکن ان کی طرز تحریر اتنی بجر ہے کہ آسانی سے ان کی تضحیک کی جاسکتی ہے۔ انھوں نے غالب سے برہان کا انتقام بھی لینا چاہا ہے۔ سب سے زیادہ قابل اعتراض دو باتیں ہیں۔ ایک تو غالب کو کنایتہً عبدالصمد کا معشوق قرار دینا، دوسری یہ تحریک کرنا کہ حکیم محمود علی خاں سے اپنے اختلال حواس کا علاج کرائیں۔ سعادت

نے یہ بھی لکھا ہے کہ غالب کا کلام قدر کا مستحق نہیں۔ غالب ان کے لہجے سے بہت شاکی ہیں۔ (مآثر غالب)

غالب داد خاں سیاح کی زبانی کہتے ہیں کہ (سعادت علی کے انداز بیان سے) صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہجڑا تالیاں بجا بجا کر گالیاں دیتا ہے یا ایک سڑی کو کسی نے چھیڑ دیا، وہ فحش بک رہا ہے۔

محرق قاطع کے جواب میں تین رسالے شائع کئے گئے۔ (۱) دافع ہذیان (۲) سوالات عبدالکریم (۳) لطائف غیبی۔

دافع ہذیان۔ محرق قاطع کی تردید و تنقیص میں سب سے پہلے "دافع ہذیان" لکھی گئی۔ اٹھائیس صفحے کا رسالہ فارسی زبان میں ہے۔ ۱۸۶۵ء میں شائع ہوا۔ اس کے لکھنے والے سید محمد نجف علی خاں تھے۔ نجف جھجر کے مشہور قاضی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد کا نام سید محمد عظیم الدین تھا۔ عربی و فارسی کے فاضل تھے۔ شعر بھی کہتے تھے۔ خستہ اور ہمی دو تخلص تھے دماغ میں کچھ سنک تھی۔ (ذکر غالب از مالک رام)

نجف علی نواب ناظم بہادر مرشد آباد اور مہاراجہ الور کے استاد تھے۔ نواب وزیر خاں بہادر اور نواب محمد علی بہادر والیان ریاست ٹونک کی رفاقت میں ایک مدت تک رہے۔ فارسی و عربی کے بے مثل ادیب و محقق تھے۔ فارسی عربی میں چھوٹی بڑی بیس پچیس کتابیں لکھیں (مآثر غالب)

غالب منشی حبیب اللہ خاں ذکا کو لکھتے ہیں کہ ہاں صاحب! خط دیروزہ کے ساتھ ایک خط مولوی نجف علی صاحب کے نام کا مع اس حکم کے کہ میں مولوی صاحب کو

پہنچاؤں میں نے پایا۔ حال یہ ہے کہ مولوی صاحب سے میری ملاقات نہیں صرف اتحادِ معنوی کے اقتضا سے انھوں نے " دافع ہذیان" لکھ کر فنِ سخن میں مجھ کو مدد دی ہے۔ منشی گوبند سنگھ دہلوی ایک ان کے شاگرد میرے آشنا ہیں۔ ان کو وہ خط بجنسہٖ بھیج دیا۔ یقین ہے کہ وہ مولوی نجف علی صاحب کو بھجوا دیں گے۔ انھیں کے اظہار سے دریافت ہوا ہے کہ مولوی صاحب کو مرشد آباد میں نواب ناظم نے نوکر رکھ لیا ہے (اردوے معلیٰ)

خواجہ غلام غوث بےخبر کو لکھتے ہیں کہ ایک مولوی نجف علی ہیں، باوجود فضیلت عربی فارسی دانی میں ان کا نظیر نہیں۔ وہ جو ایک شخص مجہول الحال نے اہل دہلی میں سے میرے کلام کی تردید میں کتاب تصنیف کی ہے مسمی محرق قاطع انھوں نے اس کی توہین اور مسودہ کی تفضیح میں دو جز کا ایک نسخہ مختصر لکھا (اردوے معلیٰ)

غالب نے مولوی نجف علی کی تصنیف "سفرنگ دساتیر" کی تقریظ بھی لکھی ہے جس میں نجف علی کو جاماسب پایہ، ساسانمایہ، آذر کیواں پایہ لکھا ہے۔ (مآثر غالب)

قاضی عبدالودود صاحب لکھتے ہیں کہ غالب سے نجف علی کی ملاقات نہ تھی۔ دافع ہذیان غالباً انھوں نے غالب کے کسی معتقد کی تحریک سے سعادت کی مخالفت میں لکھی۔ (ممکن ہے کہ محرک گوبند سنگھ مذکور ہوں جو نجف علی کے شاگرد اور غالب کے آشنا تھے) مگر اس میں محض چند اعتراضات سے بحث کی ہے اور وہ بھی بیشتر لاطائل۔ غالب اور ان میں من تراحاجی بگویم تو مراحاجی بگو کا معاملہ تھا

(مآثر غالب)

غالب نے مولوی نجف علی کو عربی کے علاوہ فارسی دانی میں بھی بے نظیر مانا ہے۔ حالانکہ وہ ہند و پاکستان کے تمام فارسی دانوں کو اور فارسی گویوں کو ہیچ و پوچ سمجھتے تھے۔ لیکن یہ کیوں؟ یہ اس لئے کہ مولوی نجف علی نے دافع ہذیان ان کی حمایت میں لکھی تھی۔

جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی

سوالات عبدالکریم۔ آٹھ صفحے کا مختصر رسالہ اردو زبان میں ہے ۱۲۸۱ھ میں چھپا۔ محرق قاطع کے مصنف کی چند فارسی کی غلطیاں گرفت کرتے ہوئے مصنف سے سوال کئے ہیں۔ کل سولہ سوال ہیں۔

عبدالکریم ایک طالب علم تھا۔ یہ رسالہ لکھ کر سعادت علی کو ذلیل کرنا تھا کہ فارسی میں اس آدمی کی ہستی کیا ہے جس کی فارسی کی غلطیاں ایسی فاحش اور نمایاں ہیں کہ ایک طالب علم بھی ان کی گرفت کر لیتا ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ غالب ہی کی تالیف ہے یا ان کے زیر تربیت لکھا گیا ہے۔ غالب ایک خط میں غلام غوث بیخبر کو لکھتے ہیں کہ ایک طالب علم مسمی عبدالکریم نے سعادت علی مولف محرق قاطع سے سوالات کئے ہیں اور ایک مختصر اس نے بفحوائے علمائے شہر مرتب کیا۔ ایک میرے دوست نے بہ صرف زر اس کو چھپوایا۔ (اردوئے معلیٰ)

اس جملے نے کہ "ایک میرے دوست نے بہ صرف زر اس کو چھپوایا" راز فاش کر دیا کہ لکھنے والا عبدالکریم ہے کہ نہیں۔

رسالہ سوالات عبدالکریم غالب کی حمایت میں ہے۔ پھر کیوں نہ غالب شہر

کے ان علمائے فارسی کو محقق مان لیں جنھوں نے عبدالکریم کے اعتراضات کی تصدیق کی۔ لیکن یہ علما کون ہیں؟ غالب کے معتقدین اور علما بھی نہیں عالم یعنی مولوی سعادت علی ملازم گورنمنٹ اسکول جو ایک مقدمے میں غالب کے گواہ بنے تھے اور غالب کے شاگرد تھے۔

مالک رام صاحب لکھتے ہیں کہ یہ رسالہ بھی غالب کا لکھا ہوا ہے۔ یا کم سے کم اس تصنیف میں ان کا بہت زیادہ ہاتھ ہے۔ اس کے متعلق میرا (یعنی مالک رام صاحب کا) مضمون آجکل فروری ۱۹۵۳ء میں دیکھئے (ذکر غالب)

چونکہ بعض باتیں سوالات عبدالکریم اور لطائف غیبی میں مشترک ہیں اس لئے پورا یقین ہے کہ یہ دونوں کتابیں غالب کی لکھی ہوئی ہیں۔

یادگار غالب میں حالی نے لکھا ہے کہ "مرزا سے کسی نے پوچھا آپ نے قاطع القاطع کا جواب کیوں نہیں دیا" مرزا نے کہا کہ "اگر کوئی گدھا تمھارے لات مار دے۔ کیا تم بھی اسے لات مارو گے" یہی بات رسالہ عبدالکریم میں محرق سے متعلق ہے (مآثر غالب از قاضی عبدالودود)

تیغ تیز کی طرح اس کے آخر میں بھی چند استفتا و جواب ہیں۔

سوالات عبدالکریم کا دیباچہ یہاں نقل کیا جاتا ہے جس سے اس رسالے کے متعلق ساری باتیں معلوم ہوں گی۔ لکھا ہے۔

"اضعف بندگان رب کریم عاصی عبدالکریم منشی سعادت علی کی خدمت بابرکت میں عرض کرتا ہے کہ میں محرق قاطع برہان کو دیکھ کر آپ کی فارسی دانی بلکہ ہمہ دانی کا معتقد ہوا مگر اپنے قصور فہم سے بعض ترکیبوں کو نہیں سمجھا۔ ناچار ان کی

حقیقت آپ سے پوچھتا ہوں اور متوقع ہوں کہ ہر سوال کا جواب جُداگانہ بعبارت سلیس و عام فہم لکھئے گا اور یہ سوالات محرق قاطع مطبوعہ کے پچاس صفحے سے متعلق ہیں۔ اس نسخہ بے نظیر کے چھیالیس صفحے اور باقی ہیں۔ جب ان سوالوں کا جواب پا چکوں گا تو سوالات باقی پیش کروں گا۔"

نمونہ کے طور پر یہاں پہلا سوال نقل کیا جاتا ہے۔

سوال نمبر ا۔ صفحہ دو سطر آٹھ۔ آپ لکھتے ہیں کہ "پیش ازیں چند سالے کتاب مسمی بہ حدائق العجائب تالیف کردہ بودم" عاصی عرض کرتا ہے کہ "چند سالے" کیا ترکیب ہے۔ ہاں "سالے چند، ماہے چند، روزے چند" و "چند سال، چند ماہ، چند روز" مستعمل فصحا ہے۔ سعدی بجا کہتے ہیں "چار پائے بر او کتابے چند" اب "چند سالے" کی سند اساتذہ کے کلام سے آپ ہم کو دیں۔ میں تو آپ کے کلام کو سند مان لوں گا لیکن منکرین کو کیا جواب دوں گا۔"

سولھویں اور سترھویں سوالوں کی نوعیت جُدا ہے۔ سترھواں سوال ملاحظہ ہو۔

سوال۔ آپ سُنّی ہیں اور اہلِ سُنّت و جماعت خلفائے راشدین کو اپنا پیر و مُرشد اور ان کی تعظیم و تفضیل کو اپنے اوپر واجب اور سبّ صحابہ کو گناہ بلکہ کُفر جانتے ہیں۔ آپ کے حقیقی بھائی نے مذہب رفض اختیار کیا، محرم میں حاضریاں کھاتے اور تعزیہ خانوں میں بھُس اڑاتے پھرتے ہیں۔ تم ان سے خفا نہ ہوئے۔ مقام حیرت ہے کہ جامع قاطع برہان کی مذمت پر استیلائے غیظ و غضب ہو اور لعن و طعن صحابہ سُن کر کان پر جوں نہ پھرے اور تیوری پر بل نہ پڑے۔ کہو گے ہمارے بھائی نے ہمارے سامنے کبھی تبرّا نہیں کیا تو میں عرض کروں گا کہ "حسبی علمک بحالہ"

میر ارادت علی صاحب کا امامیہ ہونا اور مذہب امامیہ میں سبّ صحابہ کا استحسان بلکہ وجوب مشہور اور اظہر ہے، آپ کا سُننا نہ سُننا برابر ہے۔ للہ جلد بتایئے کہ سبّ صحابہ کیوں ناگوار نہ ہوا۔ باوجود اس تسنن اور تقدس اور تورع کے جو تم کو حاصل ہے حمیت دین کی رگ جُنبش میں کیوں نہ آئی۔ جیسے وہاں غضبناک نہ ہونے کا باعث لکھئے گا، یہاں خشمگیں نہ ہونے کی وجہ لکھئے گا۔

اس سوال کے جواب میں عبدالکریم سے یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ جب غالب بھی شیعی تھے تو انھوں نے غالب کی حمایت کیوں کی۔ اس سوال سے صاف ظاہر ہوتا ہوتا ہے کہ غالب یا غالب کے حامی علمی جھگڑے کو مذہبی رنگ دے کر سُنّی مسلمانوں کو سعادت علی کے خلاف ہنگامہ آرا کرنا چاہتے تھے۔

خاتمہ کتاب پر عبدالکریم لکھتے ہیں کہ آپ کا (یعنی سعادت علی کا) دستور یہ ہے کہ جب فقدان مادہ علمی کی جہت سے حریف کو جواب نہیں دے سکتے تو غصّے میں اندھے بن کر گالیاں دینے لگتے ہیں۔ نجم الدولہ اسداللہ خاں بہادر غالب امیر نامدار اور معہذا حلیم و بردبار ہیں۔ تمھاری ناسزا باتیں سُن کر چُپ ہو رہے۔ سُنئے میں نے ایک دن نواب صاحب معظم الیہ سے پوچھا کہ آپ نے منشی سعادت علی صاحب کی بدزبانی کا جواب کیوں نہ دیا۔ حضرت نے فرمایا کہ "بھائی! اگر راہ چلتے سڑک پر گدھا تم کو لات مار بیٹھے تو کیا تم بھی بسبیل تلافی سڑک پر ٹھہر جاؤ گے اور گدھے کو لات مارو گے میں نے کہا ہرگز نہیں۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ "پھر میں منشی جی کی خرافات کا جواب کیوں دوں" اس امر کے اظہار سے میری غرض یہ ہے کہ حضرت غالب تمھارے مقابلے کو ننگ و عار سمجھ کر سکوت کر گئے۔ میں دلی کا روڑا ہوں،

آپ مُنھ زور ہیں تو میں کوڑا ہوں۔ اگر جھگڑ لڑنے کا قصد کیجئے گا تو خم ٹھونک کر موجود ہو جاؤں گا۔ ایک کہو گے، دو سُناؤں گا۔ زنہار میرے سوالوں کا جواب جیسا طریقہ شرفا کا ہے دیجئے گا اور بد زبانی اور ژاژ خائی نہ کیجئے گا۔

عبدالکریم لکھتے ہیں کہ غالب حلیم اور بُرد بار تھے۔ لیکن غالب اپنے یار دوستوں میں اور اپنے خطوط میں اپنے مخالفوں، حریفوں اور فارسی دانان ماضی و حال کا تذکرہ جن لفظوں میں کرتے تھے اس کے برخلاف ثبوت ملتا ہے۔ ایک خط میں شہاب الدین احمد کو لکھتے ہیں کہ حکیم غلام نجف خاں نے میرے دیوان کا کیا حال کر دیا ہے۔ یہ اشعار جو تم نے بھیجے ہیں خُدا جانے کس ولدالزنا نے داخل کر دئے ہیں۔ دیوان تو چھاپے کا ہے۔ متن میں اگر یہ شعر ہوں تو میرے ہیں اور حاشیہ پر ہوں تو میرے نہیں ہیں۔ بالفرض اگر یہ شعر متن میں پائے جاویں تو یوں سمجھنا کہ کسی ملعون زن جلب نے اصل کلام میں چھیل کر یہ خرافات لکھ دئے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ جس مفسد کے یہ شعر ہیں اس کے باپ پر اور دادا پر اور پردادا پر لعنت اور وہ ہفتاد پُشت تک والدالحرام (اردوے معلی)

لطائف غیبی۔ اکتالیس صفحے کا رسالہ اُردو میں ہے ۱۸۶۴ء میں چھپا۔ مصنّف کی جگہ میاں داد خاں سیّاح کا نام ہے جو غالب کے ایک شاگرد تھے۔ میاں داد خاں نام اور سیّاح تخلّص ہے۔ غالب نے انھیں سیف الحق کا خطاب دیا تھا۔ داد خاں کو سیر و سیاحت کا بہت شوق تھا۔ داد خاں نے مختلف مقامات کی سیاحت کی تھی۔ اس وجہ سے سیّاح تخلّص اختیار کیا تھا۔ اس رسالے میں بیس لطائف ہیں۔ لطائف اس لئے نام رکھا گیا کہ اعتراض کے جواب پُر مذاق اور طنزیہ انداز میں دئے گئے ہیں۔ کتاب کا دیباچہ ملاحظہ ہو۔

سیاح بحر و بر ہیچمدان بے ہنر سیف الحق میاں داد خاں حق شناسوں کی خدمت میں عرض کرتا ہے کہ میں رہنے والا اورنگ آباد کا ہوں۔ بعد میں تحصیل علوم رسمیہ سیاحت اختیار کی۔ بنگالہ، دکن، پنجاب، وسط ہند، بلاد دقرا کے کہاں تک نام لوں۔ قلمرو ہند میں سرتاسر پھرا ہوں۔ بلکہ سندھ و کابل و کشمیر و قندھار بھی دیکھ آیا ہوں۔ ان دنوں دو رسالے میری نظر سے گذرے۔ ایک "قاطع برہان" اور دوسرا "محرق قاطع برہان"۔ پہلا نسخہ یعنی قاطع برہان کا مؤلف ایک شخص معزز و مکرم، والا رتبہ، عالی شان، عالی خاندان، انگریزی رئیس زادوں میں محسوب، بادشاہ دہلی کے حضور سے مخاطب بہ نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ یعنی غالب تخلص، اسد اللہ خاں بہادر اور محرق کا جامع کوئی شخص ہے رعایائے دہلی سے کہ کبھی کسی زمانے میں محکمۂ انگریزی کا سررشتہ دار ہو گیا تھا اور اب خانہ نشین ہے، موسوم بہ منشی سعادت علی۔ نہ نثر سے واقف نہ نظم سے آگاہ، نہ عقل کا سرمایہ نہ علم کی دستگاہ۔ کسی بستی میں، کسی گاؤں میں، کسی گھاٹ پر، کسی باٹ پر اس بزرگ کا نام نہیں سنا۔ اللہ اللہ غالب نام آور نامدار، کوئی شہر ایسا نہ دیکھا جس میں ان کے دو چار شاگرد، دس بیس معتقد نہ دیکھے ہوں۔ ایک عالم ان کی فارسی دانی اور شیوہ بیانی کا معترف نظم میں ظہوری و نظیری و عرفی کے برابر، نثر میں نثاران سابق و حال سے بہتر، کلیات نسخہ سحر سامری، نثر میں پنج آہنگ سلک در خوش آب، دستنبو گوہر نایاب، مہر نیمروز غیرت آفتاب، ہر نکتہ ایک کتاب، ہر کتاب مُمتنع الجواب، جو بلاغت اور فصاحت کو جانتے ہیں اور معنی کا حُسن پہچانتے ہیں متفق علیہ ان کا یہی عقیدہ ہے۔ اگر ایک آدمی

کو عوام میں سے عقیدہ نہ ہوا تو وہ آدمی بیشک ایک گروہ کا مردود ہوگا۔

گر نہ بیند بروز شپّرہ چشم　　چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

محرق کی عبارت، واہ کیا کہنا۔ مبتدا کچھ، خبر کچھ۔ روابط نامربوط۔ ضمائر محذوف۔ اوّل سے آخر تک سوال دیگر جواب دیگر کا التزام۔ عبارت یک قلم حشو اور حشو بھی قبیح۔ بایں ہمہ وہ رسالہ سراسر بغض و عناد و سوء ظن و حمق و خبط و سب و فحش کا مجموعہ ہے۔ آیا خاطر میمون منشی صاحب میں کیا آیا جو اس رسالے کی تحریر کا قصد فرمایا۔ کتاب خوگیر، عبارت خوگیر کی بھرتی، جو اشعار بچشم داشت سند لکھے ہیں وہ زیر تنگ، زبر تنگ، سوار نابینا، مرکب کہنہ لنگ، کتاب گدڑی، ہر فقرہ ٹکڑا، ہر ٹکڑے کا نیارنگ۔ کیا منشی جی نے یہ قیاس کیا ہے کہ تمام ہندوستان میں کوئی عالم، کوئی عاقل، کوئی منصف نہیں ہے۔ اللہ اللہ ہندوستان مجمع فضل و کمال ہے۔ منشی جی کے حمق کا پردہ کھل جائے گا۔ بلکہ مولانا غالب کا ایک ایک شاگرد منشی جی کا خاکہ اُڑائے گا۔ مجھ کو تو حمیت اور رعایت حق اس تحریر کی باعث ہوئی تاکہ میں نے بیس لطائف جمع کئے اور اس نگارش کا "لطائف غیبی" نام رکھا۔

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ اُستاد ازل گفت بگو می گویم

دلچسپی کے لئے ایک لطیفہ پڑھتے چلیے۔

لطیفہ ۲۔ اے صاحبان فہم و انصاف، عبارت محرق قاطع کو دیکھا چاہیے۔ خلط مبحث، اطناب مُمل، سوء ترکیب، تباہیٔ روزمرّہ، غلطیٔ فہم، اس سے مجھے کوئی کام نہیں۔ بھلا عامیان معوج الذہن کی نثر ادر کیسی ہوگی۔ خالصاً للہ یہ بتاؤ کہ

یہ مناظرہ ہے یا جھگڑا۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہجڑا تالیاں بجا بجا کر گالیاں دیتا
ہے یا ایک سڑی کو کسی نے چھیڑ دیا ہے، وہ فحش بک رہا ہے۔ ایک شخص عالی خاندان،
نامور، باوجود صفت امارت، صاحب کمال، یگانۂ روزگار، اہل ہندوستان کا مطاع
مسائل منطق و فارسی کا مفتی۔ بایں ہمہ مرنج و مرنجان، گوشہ نشیں، آزاد و وارستہ،
فروتنی اس کا شیوہ، مروت اس کا پیشہ، طرز بیان میں ایک عالم اس کا معتقد،
حسن خلق میں ایک جہاں اس کا مداح، بادشاہ کا مصاحب، حکام کا معزز متوسل،
ان صفات کا جامع اور پھر معمر، ستر برس کا آدمی یعنی اسد اللہ خاں غالب طال بقاؤہ
و زاد علاؤہ ایسے شخص کی نسبت ناسزا کہنا منافی شان علم و ادب بلکہ خلاف
آئین آدمیت ہے۔ منشی سعادت علی نے قطع نظر از حالات و کمالات سے کبر سن
کا بھی پاس نہ کیا۔ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔ ع

کہ حق شرم دارد ز موئے سفید

جس سے خالق کو شرم آئے مخلوق اس سے نہ شرمائے۔ ما بہ النزاع یہ ہے کہ
حضرت غالب نے برہان قاطع کے اغلاط پر اعتراضات لکھے ہیں۔ کہیں کہیں ازراہ
شوخی طبع ظریفانہ بطریق بذلہ رقم سنج ہوئے ہیں۔ منشی جی حضرت غالب کی شان
میں سفیہانہ وہ کلمات ناسزا لکھے ہیں کہ ایسے کلمات کوئی شریف النفس بہ نسبت
کسی آدمی کے نہ لکھے گا۔ محمد حسین کے انتقام لینے کا بہانہ مسموع و مقبول نہیں۔
وہ دکنی منشی جی کا کون تھا جو اس کی مذمت سن کر ایسا غصہ آگیا کہ چہرہ لال
ہوگیا، بدن سے پسینہ بہنے لگا، منہ میں جھاگ آگئی، آنکھیں بند کرلیں، گالیاں
بکنے لگے، مزا ایک اور ہے کہ منشی جی بذات خود سنی ہیں اور حقیقی بھائی ان کے شیعہ تبی

ہیں۔ محرم میں بھس اُڑاتے ہیں، حاضریاں کھاتے پھرتے ہیں، اصحاب ثلٰثہ رضی اللہ عنہم کو بُرا کہتے ہیں اور منشی جی کے ساتھ ایک گھر میں رہتے ہیں۔ ان پر منشی جی کو کبھی غصّہ نہ آیا۔ خلفائے راشدین کی مذمت سے منع نہ فرمایا۔ اس باب میں کوئی عذر پیش لائیں۔ اس کی وجہ بیان فرمائیں۔ بدیہی تو یہی ہے کہ منشی جی کو دکنی کا پاس اپنے بزرگان دین سے زیادہ ہے۔ ظاہرا اس سے باطنی استفادہ ہے۔ گاہ گاہ خواب میں آیا کرتا ہوگا اور منشی جی کو رگڑے جھگڑے بتاجایا کرتا ہوگا۔ ان کو فارسی داں کیا ہے، علم کا نلوا اُتار دیا ہے۔ یا یوں ہے کہ جامع برہان قاطع مرکر بھوت بن گیا ہے اور صاحب تب محرق یعنی مولف محرق قاطع برہان پر آچڑھا ہے۔ بھلا صاحب! جب دکنی طالب اور منشی جی مطلوب، وہ محب اور یہ محبوب ہیں تو چاہئے کہ از روئے ناز و کرشمہ جوتی پیزار، گالی گلوت سے اس کو رجھائیں۔ اوروں نے کیا گناہ کیا ہے کہ ان کو بھوگ سُنائیں۔ منشی جی کو میں نے دیکھا نہیں جو کہوں کہ گورے ہیں یا کالے۔ ان کی تحریر سے اس قدر پایا جاتا ہے کہ سیدھے سادے بھولے بھالے ہیں۔

توسین کے جملے پر غور فرمانے کے بعد لطیفے کی کثافت ملاحظہ کیجئے اور دیکھئے نصیحت کرنے والے کا طرز عمل اور انداز گفتگو کتنا شاندار ہے۔

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمھیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

لطائف غیبی داد خاں سیاح کے نام سے ہے۔ لیکن یہ کتاب سرتا سر غالب کی لکھی ہوئی ہے۔ چنانچہ غالب داد خاں سیاح کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "یہ جو میں نے (تم کو) سیف الحق کا خطاب دیا ہے اپنی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا ہو، ہے۔ تم میرے ہاتھ

تم میرے بازو ہو، میرے نطق کی تلوار تمھارے ہاتھ سے چلتی رہے گی۔ لطائف غیبی نے اعدا کی دھجیاں اُڑا دی ہیں۔ (اُردوے معلیٰ)

لفظ "غیبی" بھی اسی غیبی شخص (یعنی غالب) کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

مالک رام صاحب لکھتے ہیں۔

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ اُستاد ازل گفت بگو می گویم

اس بات سے ظاہر ہے کہ سیاح "در پسِ آئینہ طوطی صفت" بیٹھے ہوئے ہیں اور اُستاد ازل یعنی غالب) جو کچھ کہہ رہے ہیں سیاح وہی دُہرا رہے ہیں۔

کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں (ذکر غالب)

مذکورہ شعر نقل کرنے میں ایک بدتمیزی نظر آتی ہے۔ منقولہ فارسی شعر لسان الغیب خواجہ حافظ شیرازی کا ہے۔ خواجہ صاحب نے یہ شعر اپنے عارفانہ کلام کے بارہ میں کہا ہے۔ خواجہ صاحب اپنے کو طوطی اور اللہ تعالیٰ کو اُستادِ ازل کہہ کر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ مجھ سے کہوا رہا ہے میں وہی کہہ رہا ہوں۔ مگر غالب صاحب خُدا کو ہٹا کر خود اُستاد ازل بن بیٹھے۔ اُستاد تو وہ ضرور تھے مگر اُستاد ازل کیسے ؟

بہر حال کتاب غالب کی لکھی ہوئی ہے مگر دادخاں کا نام ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ غالب نے اس کتاب کو اپنے نام سے کیوں نہیں شائع کیا۔ محرق قاطع کی تردید و تنقیص میں دو رسالے دافع ہذیان اور سوالات عبدالکریم شائع ہو چکے تھے۔ لیکن غالب کو ان سے تشفی نہیں ہوئی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ کوئی ایسی کتاب

ہو جو زور دار بھی ہو اور اس میں غالب کی تعریفیں پچھے دار بھی ہوں علاوہ اس کے ناشائستہ طور پر سعادت علی کا خوب خوب مذاق بھی اُڑایا گیا ہو۔ چنانچہ انھوں نے میر غلام حسنین قدر بلگرامی کو ایک خط میں لکھا کہ "قرۃ العین میر غلام حسنین سلمکم اللہ تعالیٰ تم میرے یار ہو اور میری خدمت گزاری کے حقوق ہیں تم پر۔ مجھ کو مدد کرو اور اپنی قوت علمی صرف کرو۔ محرق قاطع برہان میرے پاس موجود ہے۔ مجھ سے منگاؤ۔ میں ہر موقع پر خطا اور ذلت مؤلف کا اشارہ کروں گا۔ تمھارے پاس دو نسخے ایک دافع ہذیان ایک سوالات عبدالکریم مع استفتا و افتائے دستخطی علمائے دہلوی موجود ہیں اور اب اس کتاب کے ساتھ میرے اشارات سود مند پہنچیں گے۔ تم کو معارضہ بہت آسان ہوگا .... محرق اور صاحب محرق کا خاکہ اُڑ جائے گا (خطوط غالب)

لیکن غالب قدر بلگرامی کو اس کام کے لئے آمادہ نہ کر سکے مجبوراً انھوں نے خود ہی اس کام کا بیڑا اُٹھایا اور لطائف غیبی لکھی۔ لیکن چونکہ اس کتاب میں اپنی پچھے دار تعریفیں اور مخالف کا ناشائستہ طور پر مذاق اُڑایا ہے اس لئے مناسب نہ سمجھا کہ اپنے نام سے شائع کریں۔ کیونکہ لوگ انھیں اپنے منہ میاں مٹھو بننے کا طعنہ دیں گے اور ان کی ذاتی و خاندانی شرافت کے دعوٰی کا مذاق اُڑائیں گے۔ میاں داد خاں ان کے شاگرد اور معتقد تھے انھیں کے نام سے شائع کرنا مناسب جانا اور داد خاں کے لئے اس سے بڑی بات کیا ہوگی کہ گفتگو ناشائستہ ہی سہی لیکن انھیں علم و تحقیق کے میدان کار زار کا ہیرو تو بنایا گیا اور جو کتاب غالب کے قلم سے وجود میں آئے گی وہ یقیناً ایک پائے کی چیز ہوگی۔ لہٰذا

ملے جو مفت کی قاضی کو بھی حرام نہ ہو

غالب نے انھیں داد خاں کے نام سے قتیل کے کلام پر بھی اعتراضات قائم کر کے شائع کئے تھے۔

داد خاں سیاح نے ایک کتاب "سیر سیاح" بھی لکھی تھی جو ان کا سفر نامہ ہے لیکن آج داد خاں کا جو تھوڑا بہت چرچا ہوتا ہے وہ سیر سیاح کی وجہ سے نہیں بلکہ اسی لطائف غیبی کی تصنیف کی وجہ سے۔ سچ ہے

بد نام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

۲۔ ساطع برہان۔ قاطع برہان کی تردید و تنقیص میں یہ دوسری کتاب ہے۔ ایک سو چوہتر صفحے کی کتاب فارسی زبان میں ہے۔ ۱۲۸۳ھ میں چھپی۔ اس کے مصنف مرزا رحیم بیگ رحیم تھے۔ میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ امام بخش صہبائی سے تلمذ کا دعویٰ تھا۔ اچھے فاضل تھے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ میرٹھ کے ایک مکتب میں مدرس تھے۔ آخر عمر میں ان کی بینائی بالکل یا قریب بالکل جاتی رہی تھی۔

غالب داد خاں سیاح کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "وہ جو ایک اور کتاب (یعنی ساطع برہان) کا تم نے ذکر لکھا ہے وہ ایک لڑکے پڑھانے والے ملائے مکتبدار کا خبط ہے۔ رحیم بیگ اس کا نام، میرٹھ کا رہنے والا، کئی برس سے اندھا ہو گیا ہے۔ باوجود نابینائی کے احمق بھی ہے۔ اس کی تحریر میں نے دیکھی۔ تم کو بھی بھیجوں گا۔ مگر ایک بڑے مزے کی بات یہ ہے کہ اس کی بیشتر وہ باتیں ہیں جن کو تم لطائف غیبی میں رد کر چکے ہو۔ بہر حال اس کے جواب کی فکر نہ کرنا۔

(اُردوے معلیٰ)

دوسرے خط میں داد خاں کو لکھتے ہیں کہ "بندہ پرور! سچ کہتے ہو، رحیم بیگ کا وطن اصلی سردھنہ اور فی الحال میرٹھ میں مقیم ہے اور معلمی اس کا پیشہ ہے اور آٹھ دس برس سے اندھا ہے۔ نظم و نثر میں مولوی امام بخش صہبائی کا شاگرد ہے اور فارسی میں شعر کہتا ہے (اُردوے معلیٰ)

مولوی عبدالرزاق شاکر کو لکھتے ہیں کہ "غالب کا مکتوب الیہ رحیم بیگ نامی میرٹھ کا رہنے والا ہے۔ دس برس سے اندھا ہوگیا ہے۔ کتاب پڑھ نہیں سکتا، سُن لیتا ہے۔ عبارت لکھ نہیں سکتا، لکھوا دیتا ہے۔ بلکہ اس کے ہم وطن ایسا کہتے ہیں کہ وہ قوت علمی بھی نہیں رکھتا، اوروں سے مدد لیتا ہے۔ اہل دہلی کہتے ہیں کہ مولوی امام بخش صہبائی سے اسے تلمذ نہیں ہے۔ اپنا اعتبار بڑھانے کے لئے اپنے کو ان کا شاگرد بتاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ وائے اس ہیچ و پوچ پر جس کو صہبائی کا تلمذ موجب عزو وقار ہو۔"

غالب کا یہ کہنا کہ "رحیم بیگ دس برس سے اندھا ہے، کتاب پڑھ نہیں سکتا سُن لیتا ہے، عبارت لکھ نہیں سکتا، لکھوا دیتا ہے، بلکہ قوت علمی بھی نہیں رکھتا، اوروں سے مدد لیتا ہے" اپنے مقصد کے لئے واقعہ کو بگاڑنا اور رائی کا پربت بنانا ہے اور ایسی مبالغہ آرائی بلکہ سخن پروری غالب کی پُرانی عادت ہے۔ میرا قیاس ہے کہ رحیم بیگ نے جس وقت ساطع برہان لکھی تھی اس وقت ان کی بینائی بہت کمزور رہی ہوگی لیکن وہ بالکل اندھے نہیں ہوئے ہوں گے۔ وہ ضرور لکھنے پڑھنے کے قابل رہے ہوں گے۔ البتہ مسودہ وغیرہ صاف دوسروں سے کروایا ہوگا۔ اسی کو

غالب نے کچھ کا کچھ بنا دیا۔

قاضی عبدالودود صاحب ۔اثرِ غالب میں لکھتے ہیں کہ مرزا رحیم بیگ کے متعلق صہبائی نے لکھا ہے کہ صہبائی سے تحصیل کُتب یا اصلاح شعر کا اتفاق نہیں ہوا۔ لیکن اپنے بعض رسائل پر اصلاح لی ہے اور اس کے علاوہ مراسلت سے بہت سے فوائد علمی حاصل کئے۔ (گلستاں)

قاضی صاحب مزید لکھتے ہیں کہ رحیم کا قول ہے کہ رحیق تحقیق لغات و کنایات از خمخانۂ فیض صہبائی خوردہ (ساطع برہان)

قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ ساطع برہان کا سال طبع ۱۲۸۳ھ ہے۔ رحیم نے سعادت علی کی طرح محض چند اعتراضات سے بحث نہیں کی۔ کل یا تقریباً کل اعتراضات کے جواب دیے ہیں۔ ان کا لہجہ عموماً طنزیہ ہے۔ کبھی غالب کو تیمار ساسان شُشم کہتے ہیں، کبھی یہ کہتے ہیں کہ ایسے اعتراض میرسا کور سواد کرے تو کرے، غالب کے لئے زیبا نہیں۔ مگر کہیں کہیں تُعلّم کُھلّا یہ بھی کہتے ہیں کہ غالب سے مقابلہ تضیع اوقات ہے۔ اس شخص نے بصارت سے محرومی کے باوجود کس طرح قاطع برہان کا جواب لکھا، حیرت انگیز ہے۔ غالب کا یہ بیان کہ میاں حاتم نے رحیم کے بیشتر جواب کو لطائف غیبی میں رد کر دیا بالکل خلاف واقعہ ہے۔ غالب نے نامۂ غالب میں محض چند امور سے بحث کی ہے۔ اس لئے ساطع برہان کا درجہ صحیح متعین نہیں کیا جا سکتا (قاضی عبدالودود ۔ نقد غالب)

غالب نے ساطع برہان کا جواب نہ خود دیا اور نہ دوسرے سے دلوایا۔ بلکہ رحیم کو اُردو میں ایک خط لکھا اور اس کو "نامۂ غالب" کے نام سے اپنے خرچ پر چھپوا کر

دور و نزدیک دوستوں میں تقسیم کر دیا۔ نامۂ غالب اگست ۱۸۶۵ء میں چھپا تھا
(ذکر غالب)

غالب کا یہ خط عودِ ہندی میں بھی شامل ہے۔ خط بہت طویل ہے جب حادثہ خط میں اوّل ہند و پاکستان کے فارسی دانوں اور اہلِ قلم کی تضحیک و تذلیل کی ایک بعد تین مرکب الفاظ "آب دہ دست، ماہوچی شمہ خضر، شیر شرزہ، غالب نے بحث کی ہے۔ آبدہ دست پر بحث طویل ہے۔ دلچسپی اور معلومات کے لئے اس خط کے دلچسپ اقتباسات کاٹ چھانٹ کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں۔

"عزم مقابلہ نہیں، قصد مجادلہ نہیں، سرتاسر دوستانہ حکایت ہے، خاتمہ میں ایک شکایت ہے۔ شکوہ دردمندانہ منافی شیوہ ادب نہیں اظہار درد دل ہے۔ کوئی بات جواب طلب نہیں۔ احسان مند ہوں کہ آپ نے منشی سعادت علی کے حُسن ظن کے مطابق مجھ کو معشوق میرے اُستاد (یعنی ہرمزد) کا نہ لکھا۔

"(آپ نے) ایک جگہ یہ الفاظ کہ بقول غالب (باکدام خرس جوال شدہ) بہم کئے یا اور دو جگہ کلمۂ توہین رقم کئے۔ میں نے اپنے لطف طبع اور حُسن عقیدت سے پہلے فقرے کا مفہوم یوں اپنے دلنشیں کیا کہ حضرت نے محمد حسین دکنی جامع برہان کو موافق میرے قول کے خرس یقین کیا یا خرس در جوال شدہ عبارت ہے صحبت سے، خواہی مرافعت کے واسطے ہو خواہی محبت سے۔ مجھ کو اس کا قرب بسبیل آویزش ہے، تم کو اس کا قرب از روئے آمیزش ہے۔ دوسرے فقرے کے معنی یہ ٹھہرائے بلکہ بے تکلف میرے ضمیر میں آئے کہ خرس کے مدد دینے سے کوفت حاصل ہوئی اور وہ کوفت باعث درد دل ہوئی۔ شدت درد میں آدمی چیختا ہے، چلّاتا ہے، ہائے وائے کرتا ہے،

غُل مچاتا ہے"۔

(رحیم بیگ نے غالب ہی کو خرس کہا تھا۔ مگر غالب نے اس کا رُخ جامع برہان کی طرف موڑ دیا)

"جو کچھ میں نے قاطع برہان میں لکھا ہے (مدعیان علم و عقل) نہ اس کو سمجھتے ہیں اور نہ آپ کچھ لکھتے ہیں نہ اس کے معنی سمجھتے ہیں۔ سوال دیگر جواب دیگر پر مدار ہے، خارج از بحث اقوال کی تکرار ہے، برہان قاطع والے کی محبت سے دل بے قرار ہے، فرطِ غیظ و غضب سے بدن رعشہ دار ہے"۔

پہلے یہ تو جانو کہ غالب سوختہ اختر کا فرہنگ نویسوں کے باب میں عقیدہ کیا ہے۔ اگرچہ قاطع برہان میں جا بجا لکھ آیا ہوں مگر اب ہندی کی چندی کرکے لکھتا ہوں کہ یہ عقیدہ میرا ہے کہ فرہنگ لکھنے والے جتنے گزرے ہیں سب ہندی نژاد ہیں"۔

"قواعد فارسی کا رسالہ اہل زبان میں سے کس نے لکھا ہے اور ان ہوس پیشہ فرہنگ لکھنے والوں نے وہ رسالہ کس فاضل عجم سے پڑھا ہے؟"

"اگر کوئی مجھ سے کہے کہ غالب! تیرا بھی مولد ہندوستان ہے۔ میری طرف سے جواب یہ ہے کہ بندہ ہندی مولد و پارسی زبان ہے"۔

"فرہنگ لکھنے والے! خدا ان کے بیچ سے نکالے۔ اشعار قدما آگے دھر لئے اور اپنے قیاس کے مطابق چل دئے۔ وہ بھی نہ کوئی ہمقدم نہ ہمراہ بلکہ سو بسو پراگندہ و تباہ۔ رہنما ہو تو راہ بتائے، استاد ہو تو شعر کے معنی سمجھائے۔ نہ آپ شیرازی نہ اصفہانی زہے رگ گردن تجھے دعوی زباندانی۔ میرا یہ قول خاص ہے نہ عام ہے۔ مجموع فرہنگ نگاروں کے محقق ہونے میں کلام ہے"۔

"ایک لطیفہ لکھتا ہوں اگر خفا نہ ہو جاؤ گے تو حظ اٹھاؤ گے جتنی فرہنگیں اور جتنے فرہنگ طراز ہیں یہ سب کتابیں اور یہ سب جامع مانند پیاز ہیں۔ تو بتو اور لباس در لباس، وہم در وہم اور قیاس در قیاس۔ پیاز کے چھلکے جس قدر اُتارتے جاؤ گے چھلکوں کا ڈھیر لگ جائے گا۔ مغز نہ پاؤ گے۔ فرہنگ لکھنے والوں کے پردے کھولتے جاؤ، لباس ہی لباس دیکھو گے، شخص معدوم، فرہنگوں کی ورق گردانی کرتے رہو، ورق ہی نظر آئیں گے، معنی موہوم، ظرافت پر مدار، تحقیق نہیں ہے۔"

"فرہنگ نویسوں کا قیاس معنی، لغات فارسی میں نہ سراسر غلط ہے، البتہ کمتر صحیح اور بیشتر غلط ہے۔ خصوصاً دکنی تو عجیب جانا نہ ہے، لغو ہے، پوچ ہے، پاگل ہے، دیوانہ ہے۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ یائے اصلی کیا ہے اور یائے زائدہ کیا ہے۔ حیران ہوں کہ اس کی جانبداری میں فائدہ کیا ہے۔ خدا جانتا ہے کہ میں یکرنگ ہوں مگر دکنی کے جانبداروں کا جو رنگ ہے مجھے جو چاہو سو کہو۔ اوروں سے تم کیوں لڑتے ہو۔ کہیں جامع لطائف غیبی کو بُرا کہتے ہو، کہیں نگارندۂ دافع ہذیاں سے جھگڑتے ہو۔"

"آویزہ اور افسوس کے بیان میں مجھ سے وہ سہو ہوا ہے کہ مجھے اس کا اقرار ہے اور میرا دوست میاں داد خاں شرمسار ہے۔"

(جامع برہان نے لکھا تھا کہ آویزہ گوشوارہ کو کہتے ہیں۔ غالب نے لکھا کہ آویزہ اور گوشوارہ دو الگ چیزیں ہیں۔ لیکن آویزہ کے معنے غلط بتا گئے۔ آویزہ کے معنی بتائے ہیں کہ آویزہ اس چیز کو کہتے ہیں جو کان کی لو میں سوراخ کرکے ڈال

دیتے رہیں تاکہ لٹکتا رہے۔ اور افسوس کے سلسلے میں غلطی یہ کی کہ افسوس کو عربی لفظ جانا اور اسف کے مشتقات کو افسوس کا مشتقات بتایا۔)

"یہ جو آپ نے مولوی امام بخش صہبائی کو امام المحققین کا خطاب دیا ہے، کتنے محققین نے ان کو اپنا امام مان لیا ہے۔ جب تک نہ اجماع محققین ہوگا یہ خطاب باجماع اہل عقل ناجائز و ناروا ہوگا۔ اگر حضرت بفتحۂ قاف ثانی بصیغۂ تثنیہ امام المحققین کہتے تو ایک ماموم آپ ہوتے اور نرائن داس تنبولی دوسرا ہوتا۔"

"ساطع برہان کے تیرھویں صفحے کی نویں سطر میں آپ لکھتے ہیں۔ وہ چنیں بر افراط وتفریط توضیح را کار بند نشدہ اند کہ بداں حرف گیری تواند کرد۔ "تواند" توانستن کے مضارع کی بحث میں سے صیغۂ واحد غائب ہے۔ فاعل چاہتا ہے۔ خواہی معرفہ جیسے احمد، محمود، خواہی نکرہ جیسے ہمہاں کسے یا شخصے یا مردے یا زنے۔ اور اگر فاعل مذکور نہ ہو تو اس صورت میں "تواں کرد" چاہئے کہ تواں مالم یسم فاعلہ ہے۔ کرامت تو مجھے حاصل نہیں۔ ہاں از روئے حسن عقیدت کہتا ہوں کہ آپ نے یوں لکھا ہے کہ رکسے بداں حرف گیری تواند کرد) یا "تواند" کی جگہ "تواں" رقم فرمایا ہے۔ دیکھئے آپ نے بیل کے جوئے کا بوجھ میری گردن پر رکھ دیا اور میں نے ایک بیل کا بوجھ پشت مبارک سے اٹھا لیا۔"

آبدہ دست کا مباحثہ ملاحظہ ہو

عبارت برہان قاطع (اردو ترجمہ) آبدہ دست بکسر دال ابجد و ہائے ہوز۔ خصوصاً حضرت رسول صلوٰۃ اللہ علیہ کی طرف اشارہ ہے اور عام طور پر اس محترم ہستی کو کہتے ہیں جس سے صدارت اور محفل کی زینت بڑھتی ہے۔

عبارت قاطع برہان۔ آبدہ دست تین لفظوں یعنی "آب" اور دادن کا صیغہ امر "دہ" اور "دست" سے مرکب ہے۔ اگرچہ دست کے ایک اور معنی "مسند" کے بھی آتے ہیں اور آبدہ دست کے معنی "مسند کو رونق دینے والا" کے بھی ہیں تاہم جب تک آبدہ دستِ نبوت یا آبدہ دستِ رسالت نہ کہیں اس کو نبی کے لئے استعمال نہیں کر سکتے۔ اسی طرح جب تک آبدہ دستِ امارت یا آبدہ دستِ شوکت وغیرہ نہ کہیں کسی صاحب عظمت کی تعریف کے لئے استعمال نہیں کر سکتے۔ صرف آبدہ دست کے معنی "ہاتھ دھونے والا" کے آتے ہیں اس لئے اگر رسالت یا امارت وغیرہ الفاظ کے بغیر نبی یا صاحب عظمت شخص کے لئے آبدہ دست استعمال کیا جائیگا تو اس سے نبی یا باعظمت ہستی کی توہین ہوگی۔ اس غریب نے (یعنی جامع برہان نے) آبدہ دست رسالت دیکھا ہوگا اور آدھے ٹکڑے کو لفظ سمجھ لیا (اردو میں خلاصہ)

عبارت ساطع برہان۔ یہ کنایہ قابل اعتراض نہیں ہے۔ عربی اور فارسی میں "دست" کے معنی مسند کے ہیں۔ آبدہ دست میں مضاف الیہ (یعنی نبوت یا رسالت یا امارت وغیرہ) محذوف ہے بلکہ آبدہ دست "بالا دست" کا مرادف ہے۔ مؤید الفضلا نے اپنی فرہنگ میں دو کتابوں کی سند سے یہی معنی لکھے ہیں۔ اور مدار الافضل اور فرہنگ رشیدی میں بھی آبدہ دست کے معنی "بزرگ مجلس" اور اس کے معنی ترکیبی "رونق دہ صدر و مسند" لکھے ہیں۔ غالب کہتے ہیں کہ اس غریب نے نعتیہ نظم و نثر میں "آبدہ دست رسالت" دیکھا ہوگا لیکن آدھے ٹکڑے کو لغت سمجھ لیا۔ میں کہتا ہوں کہ جامع برہان نے نظم و نثر میں

بغیر لفظ "رسالت" کے دیکھا ہے اور جیسا دیکھا ہے ویسا ہی لکھا ہے۔ خاقانی کہتے ہیں۔

دست آبدہ مجاور نشش — ار زن دہ برج کو تر انش

(اُردو ترجمہ)

(یعنی اس بیت میں دست آبدہ جو مقلوب شکل ہے آبدہ دست کی بغیر لفظ "رسالت" کے آیا ہے۔ اس لئے غالب کا یہ کہنا ہی غلط ہے کہ جامع برہان نے آبدہ دست رسالت دیکھا ہوگا۔ بلکہ جامع برہان نے آبدہ دست ہی رسول کے لئے دیکھا ہے جیسا کہ خاقانی کی اس بیت میں ہے)

غالب کا تبصرہ :۔ "رحیم بیگ صاحب کے مقلدین باب المیم میں "ماہی چشمہ خضر" میں ملاحظ فرمائیں کہ کہتے ہیں کہ آبدہ دست جو آنحضرتؐ کے لئے استعارہ ہے وہ خاقانی سے ماخوذ ہے اور اس میں کوئی رکاکت نہیں ہے۔ افسوس ہے اس عقیدے پر کہ آنحضرتؐ کو تو منصب رسالت پر فائز کریں اور پھر بعد میں ان کو رکاکت میں اندھے منہ ڈال دیں۔ "آب" کے ہندی معنی "پانی" اور آب "رونق ولطف" اور "اسلحہ کی تیزی" اور "جوہر کی صفائی" کو بھی کہتے ہیں۔ دست کے ہندی معنی "ہاتھ"۔ دست کے دوسرے معنی "قسم" اور "نوع" کے علاوہ "مسند" بھی ہیں۔ اس مقام میں آب بمعنی پانی اور دست بمعنی مسند ہے۔ اس کی ترکیب یعنی "آب دست" اور اس کے مقلوب "دست آب" میں کلام ہے۔ آبدست کا ترجمہ "غسالہ ید" اور خصوصاً وضو کو کہتے ہیں۔ پس آبدہ دست اور دستابدہ کے معنی "وضو کرانے والا اور ہاتھ دُھلانے والا" کے ہیں۔ آب

بمعنی رونق اور دست بمعنی مسند کا یہاں ادخال محض جہل اور صرف اہمال ہے۔ میرا تو قول ہے کہ آبدہ دستِ رسالت رسول کو کہہ سکتے ہیں۔ ایک بے ادب ہی ہوگا جو رسول کو صرف آبدہ دست کہے گا۔"

"مرزا رحیم بیگ صاحب! افسوس کی بات ہے کہ تم نے اس بیان خاص میں برہان قاطع والے کا قول کیونکر مانا۔ سراسر بے پردہ اشرف الانبیا علیہ وآلہ السلام کی تذلیل اور توہین ہے اور جو پیمبر کو ایسا کہے وہ مجموع اہل اسلام کے نزدیک مرتد و مردود و بے دین ہے۔"

"خاقانی کے شعر کے لکھنے سے آپ کی مراد کیا ہے۔ یہ شعر قطعہ بند اور اور اس کا پہلا شعر مجھ کو یاد ہے۔ پہلے پوچھتا ہوں کہ دستابدہ کا فاعل اور ضمیر کا مرجع تم نے کس کو ٹھہرایا اور آنحضرت کا نشان بطریق مذکور یا مقدور کہاں پایا۔ جب اس مصرعہ کی رو سے "دست آبدہ مجاور انش" دست آبدہ پیمبر کا نام قرار دیا تو دوسرے مصرع کے مطابق "ارزن دہ برج کو تر انش" یہ ارزن دہ کا خطاب بھی حضرت پر صادق آیا۔"

"بندہ پرور! خاقانی کا شعر قطعہ بند ہے۔ اور اس کا پہلا شعر یہ ہے۔

اشعار۔

روح از پئے آبروئے خود را ۔۔۔ خُلد از پئے رنگ و بوئے خود را

دستابدہ مجاور انش ۔۔۔ ارزن دہ برج کو تر انش

اوپر کے دونوں مصرعوں میں "را" زائد ہے۔ پہلا مصرع تیسرے مصرع سے اور دوسرا مصرع چوتھے مصرع سے متعلق ہے۔ نثر میں اس کی فارسی یوں

ہوتی ہے "روح از پے آبروے خود دست آبدہ مجاوران اوست وخُلد از پے رنگ و بوے خود ارزن دہ کبوتران اوست" یہ دونوں شعر کعبۂ معظمہ کی تعریف میں اور دونوں شینوں کی ضمیر بطرف کعبہ راجع ہے۔ اس اظہار کی تصدیق تحفۃ العراقین سے کیجئے اور ہندی کی چندی غالب سے سُن لیجئے۔ روح اپنی افزائش آبرو کے واسطے وضو کا پانی دیتی ہے کعبے کے مجاوروں کو اور خلد اخذ رنگ و بو کے واسطے دانہ کھلاتا ہے کعبے کے کبوتروں کو۔ وضو کا پانی دینا اور کبوتروں کو دانہ کھلانا ادنیٰ خدمت ہے۔ خُدا کے واسطے مخدوم کونین کو خادم کہنا مدح ہے یا مذمت۔ خاقانی کے اس مصرع سے دست آبدہ پیغمبر کو سمجھنا بے اعتنائی اور غفلت ہے۔ خاقانی نے روح کو دست آبدہ کا فاعل مانا۔ تم نے پیمبر کو معاً اس فعل کا فاعل اور ایک فعل کا دو فاعل سے متعلق ہونا کیونکر جائز جانا۔"

"مجھ کو تم پر ہنسی آتی ہے بعض بات سمجھی نہیں جاتی۔ خاقانی روح کو آبدہ دست مجاوران حرم کہتا ہے، تم کہتے ہو کہ خاقانی دستابدہ پیمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کہتا ہے۔"

خاقانی کی ابیات کے مفہوم کی تشریح کرتے ہوئے اور مجاورانش اور کبوترانش کے شین ضمیری کا مرجع کعبہ کو بتاتے ہوئے غالب نے کہا ہے کہ تصدیق کے لئے تحفۃ العراقین دیکھیں۔ میں نے غالب کی فرمائش کی تعمیل کرتے ہوئے تصدیق کے لئے تحفۃ العراقین دیکھی۔ "در صفت عالم کل یعنی دل فرماید" کے زیر عنوان تیئس ابیات کعبہ شریف کی تعریف میں کہی ہیں۔ اوّلین بیت یہ ہے۔

آں کعبہ کہ سکون معانیست — اورا ہمہ گرد خود طوافست

اس کے علاوہ پانچ متصل ابیات یہ ہیں۔

روح از پے آبروے خود را — خلد از پے رنگ و بوے خود را

دستابدہ مجاورانش — ارزن دہ برج کوترانش

ماندہ ہمہ سالکانش مادام — در سعی و وقوف و طواف و احرام

چوں دائرہ ہر کجا روی صدر — ہر روز عید و ہر شبش قدر

چوں نقطہ یکے شدہ وجودش — بیت اللہ اوّلیں حدودش

ان ابیات سے صاف ظاہر ہے کہ صاحب ساطع برہان نے جو بیت سند کے طور پر پیش کی ہے وہ کعبہ معظمہ کی تعریف میں ہے اور غالب نے خاقانی کی دو ابیات کے معنی کی جو تشریح کی ہے اس کا ایک ایک حرف صحیح ہے۔ یہاں دست آبدہ کے معنی وضو کرانے ہی کے ہیں اور صرف مجاورانش اور کوترانش کے ہی شین نہیں بلکہ تیئس شعروں میں جتنی بھی ضمیریں آئی ہیں سب کی سب کعبے کے لئے ہیں۔ ان تیئس شعروں میں حضرت رسول کی طرف کوئی بھی ایسا اشارہ نہیں کیا گیا کہ مجاورانش و کوترانش کے شین کو اور دست آبدہ کو پیغمبر سے منسوب کیا جائے۔ لہٰذا رحیم بیگ نے ناظرین ساطع برہان کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے یہ بیت سند کے طور پر پیش کی ہے۔ حالانکہ یہ سند ان کے دعویٰ کے بالکل خلاف پڑتی ہے۔

اس موقع پر ایک بات غور طلب یہ ہے کہ اس بیت کو سند کے طور پر رحیم بیگ نے پیش کیا، جامع برہان نے نہیں۔ جامع برہان محقق نہیں بلکہ ناقل

ہیں۔ انھوں نے اس لفظ کو دوسری فرہنگوں سے نقل کر کے بتایا ہے کہ آبدہ دست سے مراد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلّم ہیں۔ لیکن جن فرہنگوں سے یہ لفظ ان معنوں میں نقل کیا گیا ہے ان فرہنگوں کے جامعین نے اس لفظ کو خاقانی کی زیر بحث بیت سے نہ نقل کیا ہوگا۔ کیونکہ اگر وہ اس بیت سے نقل کرتے تو آبدہ دست کی بجائے دستابدہ نقل کرتے اور ساتھ ہی ساتھ توضیح بھی کرتے کہ دستابدہ مقلوب ہے آبدہ دست کا۔ اگر خاقانی کی اس بیت سے نقل کرتے تو ہرگز نہ لکھتے کہ اس سے مراد رسول کریمؐ ہیں میرے خیال میں ان جامعین نے یہ لفظ کسی ایسی نظم ونثر سے اخذ کیا ہوگا جس میں "رونق بخش مسند" کے معنی میں استعمال ہوا ہوگا۔ سیاق و سباق سے واضح طور پر معلوم ہوا ہوگا کہ اس سے مراد رسول کریمؐ ہیں اور جبکہ دست کے معنی مسند بھی ہیں اور آبدہ دست کے معنی رونق بخش مسند بھی ہیں تو یہ لفظ تنہا بھی بطور استعارہ رسول کریمؐ کے لئے استعمال ہو سکتا ہے بشرطیکہ سیاق وسباق سے واضح ہو کہ استعارہ رسول کریمؐ کے لئے مخصوص ہے مگر پھر بھی اس قباحت کا امکان ہے کہ پڑھنے والے اول اس کے معنی ہاتھ دُھلانے والے کے سمجھیں گے۔ لہٰذا جس لفظ سے ایسا مغالطہ ہو جس سے رسول خُدا کی توہین ہو جائے ایسا لفظ کے استعمال کرنے میں احتیاط ضروری ہے۔

لفظوں کے استعمال کے سلسلے میں ایک لطیفہ سُنتے چلئے

ایک دفعہ میر انیس نے ایک مجلس میں یہ مصرعہ پڑھا۔

بحرِ نبی کا گوہر یکتا حسین ہے

سامعین میں سے ایک صاحب نے کہا کہ لاحول ولا قوۃ! بہرے نبی! اس پر میر انیس

نے مصرعہ بدل کر یوں پڑھا۔

کانِ نبی کا گوہر یکتا حسین ہے

حاضرین میں سے پھر کسی نے کہا کہ استغفر اللہ! کانِ نبی! انیس نے پھر مصرعہ بدل کر پڑھا۔

گنجِ نبی کا گوہر یکتا حسین ہے

سامعین بول اُٹھے کہ ہائے ہائے! گنجِ نبی! اب کی بار انیس نے یوں پڑھا۔

کنزِ نبی کا گوہر یکتا حسین ہے

غور کیجئے کہ بحر، کان اور گنج یہ تینوں الفاظ بہت ٹھیک ہیں لیکن جہاں تک سماعت کا تعلق ہے اضافت کے ساتھ مذموم معنی بھی سمجھ میں آتے ہیں۔اس لئے رسول مقبول کی شان میں الفاظ کے استعمال میں احتیاط ضروری ہے۔اچھے سے اچھے لفظ کا استعمال بھی اس بے احتیاطی سے نہ ہو کہ رسول کی توہین ہو جائے۔ لہٰذا صرف آبدہ دست کا استعمال رسول کے لئے مناسب نہیں۔ بلکہ جیسا کہ غالب نے فرمایا آبدہ دست رسالت یا آبدہ دست نبوت استعمال کرنا چاہیے۔

چونکہ آبدہ دست کے معنی رونق بخش مسند، وضو کرانے والا اور ہاتھ دھلانے والا تینوں ہیں اس لئے محل استعمال اور سیاق و سباق ہی سے پتہ چلے گا کہ یہ لفظ کہاں کن معنوں میں استعمال ہوا۔ لہٰذا بحیثیت ایک لغت کے فرہنگ میں اس کے تینوں ہی معنے بتانے ہوں گے۔اس کے صرف یہ معنی بتانا کہ اس سے رسول کریم مراد ہیں غلط اور گمراہ کن طریقہ ہے۔

۳- موید برہان - قاطع برہان کی تردید و تنقیص میں موید برہان
سب سے بڑی اور سب سے زیادہ فاضلانہ و محققانہ کتاب ہے۔ اس کتاب کے
مصنف مولوی آغا احمد علی احمد بن آغا شجاعت علی بن آغا عبد العلی ہیں۔
آغا احمد علی اصفہانی النسل تھے اور آغا احمد علی اصفہانی کہلاتے تھے۔ جیسا کہ
ان کے تاریخی نام مظہر علی سے معلوم ہوتا ہے۔ ۱۲۵۵ھ (لگ بھگ ۱۸۳۹ء)
میں جہانگیر نگر (ڈھاکہ) میں پیدا ہوئے۔ شوال کی دسویں تاریخ تھی۔ عربی کے
زبردست عالم اور فارسی علم و ادب کے زبردست محقق، ادیب اور شاعر تھے۔
۱۸۶۳ء میں پروفیسر کاویل کی سفارش پر کلکتہ کے سرکاری مدرسہ یعنی مدرسہ عالیہ
کلکتہ میں فارسی کے مدرس مقرر ہوئے۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگالہ میں مصحح تھے۔
اور ویس و رامن، سکندر نامۂ بحری یا اقبال نامہ سکندر مصنفہ نظامی، اقبال نامہ
جہانگیری، منتخب التواریخ مصنفہ بدایونی، مآثر عالمگیری اور اکبر نامہ مصنفہ
ابو الفضل جیسی کتابوں کو ایڈٹ کیا۔ موید برہان، شمشیر تیز تر، ہفت آسمان
اور رسالۂ ترانہ ان کی تصنیفات ہیں۔ ۶ ربیع الثانی ۱۲۹۰ھ مطابق جون
۱۸۷۳ء کو بخار میں مبتلا ہو کر انتقال کیا (دیباچہ رسالہ ترانہ از بلاک مین)
ہجری تاریخ کے مطابق وفات کے وقت عمر چونتیس برس چار مہینے چوبیس
دن تھی۔ بلاک مین نے لکھا ہے کہ وفات ڈھاکہ میں ہوئی۔ ہجری تاریخ کے اعتبار
سے احمد علی غالب سے لگ بھگ تینتالیس برس کے چھوٹے تھے۔

موید برہان چار سو اڑسٹھ صفحے کی کتاب ہے۔ بلاک مین کے قول کے مطابق
۱۸۶۵ء اور مصنف کے قول کے مطابق ۱۲۸۲ھ میں چھپی۔ سوائے دس بارہ کے

احمد علی نے ان سب اعتراضوں کی مدلل تردید کی ہے جو غالب نے برہان قاطع پر وارد کئے تھے۔ دو چار اعتراضوں کو مان بھی لیا ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب لکھتے ہیں کہ موید برہان بہترین کتاب ہے جو قاطع برہان کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ اگر اس کا لہجہ معتدل ہوتا اور جا بجا طول بیجا سے کام نہ لیا جاتا تو اور بہتر ہوتی۔
(مآثر غالب)

غالب کے بیان کے مطابق احمد علی نے غالب کو سڑی، کتّا اور گدھا وغیرہ کہا۔ ایک جگہ انھوں نے غالب کو ابوجہل ہندی بھی لکھا ہے۔ ایک شعر یہ ہے۔

نباشد آدمیت نکتہ گیری　　　کہ کارِ سگ بود آہو گرفتن

غالب کے کہنے کے مطابق موید برہان قاطع برہان کی تردید میں چوتھی کتاب اور قاطع القاطع تیسری کتاب ہے۔ مگر احمد علی شمشیر تیز تر میں بغرض تردید لکھتے ہیں کہ

ع۔ دو صد و ہشتاد آمد بر ہزار

کے مطابق موید برہان کا سال تالیف ۱۲۸۰ھ ہے اور

ع۔ یک ہزار و دو صد ہشتاد و دو

کے مطابق سال طبع ۱۲۸۲ھ ہے لیکن قاطع القاطع کا سنہ تالیف

ع۔ نقش بستم سال ترتیبش "فراغ"

کے مطابق لفظ "فراغ" سے ۱۲۸۱ھ اور

ع۔ شمشیر آبدار زبان امین دریں

سے سنہ طبع ۱۲۸۳ھ نکلتا ہے۔ اس لحاظ سے موید برہان تیسری اور قاطع القاطع چوتھی کتاب ہوئی۔

غالب نے مؤید برہان کو چوتھی اور قاطع القاطع کو تیسری کتاب لکھا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ قاطع القاطع ان کی نظر سے پہلے گذری ہوگی اور مؤید برہان بعد میں۔

اب یہاں دیباچۂ مؤید برہان کے کچھ حصّے بشکل اُردو ترجمہ نقل کیے جا رہے ہیں۔

"مرزا اسد اللہ خاں غالب کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ قاطع برہان کلکتہ پہنچی اور میری نظر سے گذری۔ معلوم ہوا کہ حضرت غالب فارسی زبان کی قدردانی قدیم فارسی کی محبت اور زباندانی کے دعوے کے ساتھ محمد حسین تبریزی المتخلص بہ برہان سے گتھ پڑے ہیں اور اس بزرگوار کی تصنیف برہان قاطع پر خاک اڑائی ہے اور ہزاروں صحیح اور نازک و حسین الفاظ کو اپنی تیغ قلم سے ہلاک و برباد کر کے ان کی جگہ الفاظ باستانی کو پسند کیا ہے اور صاحبِ برہان کے سر فاحش غلطیوں کا الزام تھوپ دیا ہے اور اس کے سینے کو سنانِ طعن سے چھلنی کر دیا ہے اور اس کو غیر معتبر ٹھہرایا ہے اور رائے الکنی و دکنی کہہ کر طعنہ دیا ہے اور جس لفظ کو بھی دساتیر کا ترجمہ نہیں دیکھا اسے غلط سمجھا اور جو لفظ اپنے اُستاد ہرمزد عبد الصمد سے نہیں سُنا اسے ناروا جانا۔ غرضکہ جس لفظ کو بھی حضرت غالب نے نہیں دیکھا یا نہیں سُنا اسے غلط اور ناجائز سمجھا۔ معترض کو چاہیے تھا کہ جو الفاظ انھیں غلط اور ناجائز نظر آئے دوسری فرہنگوں مثلاً فرہنگ جہانگیری، مجمع الفرائس سروری، سرمۂ سلیمانی اور صحاح الادویہ (جو برہان قاطع کے ماخذ ہیں) اور مؤید الفضلا میں دیکھ لیتے اور جو الفاظ ان میں نہ پاتے ان کے

متعلق سوال کرتے کہ جامع برہان کو کہاں سے ملے۔ بغیر تحقیق و تفتیش
کے جامع برہان سے لڑنے اور اہل دانش کے روبرو اپنے کو رسوا کرنے کی
کیا ضرورت پڑی تھی۔ اگرچہ جناب موصوف فرماتے ہیں کہ نہ مجھ کو محمد حسین
دکنی سے بحث ہے اور نہ برہان قاطع کی شہرت پر حسد ہے لیکن "دکنی" لفظ
کے استعمال سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کو صاحب برہان سے غایت درجہ
کا حسد ہے۔ کبھی جانتے ہیں کہ برہان تبریزی تھے جس کا ثبوت یہ ہے کہ
وہ مخلوط حروف (یعنی بھ، پھ، چھ وغیرہ) نہیں ادا کر سکتے تھے۔ چھوکری
اور تھوڑا کو چکری اور تورا بولنا ان کے ایرانی ہونے کی دلیل ہے۔ بہرحال
اگر ایرانی نہ بھی ہوں تو کیا ضرور ہے کہ وہ دکنی ہی ہوں۔ کسی اور جگہ کے
بھی ہو سکتے ہیں۔ غرضکہ حضرت علی مرتضیٰ کے قول پر عمل کرتے ہوئے یہ نہیں
دیکھنا چاہئے تھا کہ "کس نے کہا" بلکہ یہ دیکھنا چاہئے تھا کہ "کیا کہا" اور
چونکہ آدمی فرشتہ نہیں، بلکہ خطا و نسیان سے مرکب ہے اس لئے قائل کی
غلطیوں کو نظر انداز کرنا چاہئے تھا۔ لیکن جذبۂ حسد نے غالب کو اندھا
کر دیا۔ تیغ بننا اور کسی کے بدن میں پیوست ہونا بقول مولوی روم

چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد   میلش اندر طعنۂ نیکاں برد

گویا اپنے ہی عیب کو بے نقاب کرنا ہے۔ شعر

نباشد آدمیت نکتہ گیری   کہ کار سگ بود آہو گرفتن

چونکہ اکثر اعتراض بیجا اور بے بنیاد ہیں اور صاحب برہان پر حد درجہ
ستم ڈھائے گئے ہیں اس لئے اس مظلوم کی حمایت کرنا اقتضائے عقل ہے

ان اعتراضوں کو دیکھ کر میرے دل کو بڑا دکھ ہوا۔ اس وجہ سے میں غالب کا مخالف اور برہان کا طرفدار ہوا۔ چونکہ میرے پاس برہان کی ساری ماخذ کتابیں موجود نہیں ہیں نے خصوصیت سے فرہنگ جہانگیری مجمع الفرائس، سرمۂ سلیمانی اور صحاح الادویہ کا مطالعہ کیا۔ صاحب برہان نے دیباچۂ برہان قاطع میں ان فرہنگوں کو اپنا ماخذ بتایا ہے۔ میں نے موید الفضلا کا بھی مطالعہ کیا ہے کیونکہ صاحب برہان نے کہیں کہیں اس کا بھی ذکر کیا ہے۔ مذکورہ تمام فرہنگیں لغت کی معتبر کتابیں ہیں۔ میں نے ان فرہنگوں کا ایک ایک ورق کھنگالا ہے۔ علاوہ ان کے میں نے ارادۃ الفضلا، شرفنامہ، مدار الافاضل، فرہنگ رشیدی، منتخب اللغات، کشف اللغات، سراج اللغات، چراغ ہدایت، خیابان گلستان آرزو، بہار عجم، نوادر المصادر، جواہر الحروف وابطال، مصطلحات الشعرا، ہفت قلزم، غیاث اللغات (جو چودہ سال میں مکمل ہوئی) نفائس اللغات اور ترجمہ دساتیر سے مدد لی ہے۔ چونکہ یہ کتاب برہان قاطع کی تائید میں لکھی ہے میں نے اس کا نام "موید برہان" رکھا۔ انصاف پسند ناظرین سے امید ہے کہ اس کتاب کو ملاحظہ فرماتے وقت دامن انصاف کو نہ چھوڑیں گے اور میری محنتوں کو ضائع نہ ہونے دیں گے اور مظلوم برہان کو غالب کے پنجۂ ظلم سے نجات دلوائیں گے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ احمد علی صاحب نے بیسیوں فرہنگوں کی چھان بین کر کے غالب کے اعتراضوں کا جواب لکھا ہے۔ لیکن غالب صاحب کو کیا کیا جائے۔

وہ تو تمام فرہنگوں کو ساقط الاعتبار اور تمام لغت نویسوں کو ناک کا بال سمجھتے ہیں۔ غالب کی اس سمجھ کے جواب میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ

انھیں نفرت ہوئی سارے جہاں سے
نئی دُنیا کوئی لائے کہاں سے

بہر حال جب مؤید برہان چھپ کر کلکتے میں منظر عام پر آئی تو غالب کے ایک مرحوم دوست کے لڑکے یوسف علی نے غالب کو اس کتاب کی اطلاع دی۔ غالب منشی حبیب اللہ خاں ذکا کو ایک خط مورخہ ۱۶ر شعبان ۱۲۸۳ھ میں لکھتے ہیں کہ (یوسف علی) نے کلکتے سے اطلاع دی ہے کہ مولوی احمد علی احمد مدرس مدرسہ عالیہ کلکتہ نے ایک رسالہ لکھا ہے، نام اس کا مؤید برہان ہے۔ اس رسالہ میں دفع کئے ہیں تیرے وہ اعتراض جو تو نے دکنی پر کئے ہیں اور تیری تحریر پر بھی کچھ اعتراضات وارد کئے ہیں اور اہل مدرسہ اور شعرائے کلکتہ نے تقریظیں اور تاریخیں بڑی دھوم دھام سے لکھی ہیں۔ بس بھائی اتنے علم پر ایک قطعہ لکھ کر چھپوایا اور کئی اوراق اس دوست کو اور چار چار جلدیں درفش کاویانی کی علاوہ اوراق مذکور کے بھیج دئے (اردوئے معلی)

قطعۂ غالب

سپاس گذاری یاد آوری بعالی خدمت مولوی آغا احمد علی
جہانگیر نگری از جانب پوزش خواہ جرم بیراہ روی اسد اللہ خاں غالب

مولوی احمد علی احمد تخلص نسخۂ — درخصوص گفتگوے پارسی انشا کردہ است
کیچ و مکراں را کہ سندست و از ایراں جدا — شامل اقلیم ایراں بے محابا کردہ است

قوم برنج را به ایرانی نژاداں داد خلط / ترک ترکانِ سمرقند و بخارا کرده است

در جہاں توأم بود روے وے و خشتِ قتیل / پیشواے خویش ہندو زاده را کرده است

ہندیاں را در زباندانی مسلم داشته / تا که اندر خاطرِ والاے او جا کرده است

ہر که بینی با زبانِ مولدِ خود آشناست / ساز نطقِ موطنِ اجداد دیبا کرده است

خواجه را از اصفہانی بودن آبا چه سود / خالقش در کشورِ بنگاله پیدا کرده است

با قتیل و جامعِ برہان و لاله ٹیک چند / لابه و سوگیری و لطف و مدارا کرده است

داوری گاہے بنا فرمود در روے ہر سه را / منصف و صدرِ امین و صدرِ اعلیٰ کرده است

گر چنیں با ہندیاں دارد تولا در سخن / من ہم از ہندم چرا از من تبرا کرده است

کرده است از خوبیِ گفتارِ من قطعِ نظر / ظلم زیں قطعِ نظر بر چشمِ بینا کرده است

میل او با ہر کسے از ہند حیفش خاصِ من / حیف میلے با دو عالم شور و غوغا کرده است

مطلب از بد گفتنِ من چیست گوئی نیک مرد / مزد ایں کار از حق آمرزش تمنا کرده است

در چنیں نبود چناں باشد که در عرضِ کمال / تا برآرد نام ایں ہنگامه برپا کرده است

صاحبِ علم و ادب و انگه ز افراطِ غضب / چوں سفیہاں دفترِ نفریں و ذم وا کرده است

در جدل دشنام کارِ شوقیاں باشد ولے / ننگ دارد علم از کارے که آغا کرده است

انتقامِ جامعِ برہان قاطع می کشد / آنچه ما کردیم با او خواجه با ما کرده است

من سپاہی زاده ام گفتارِ ما باید درشت / وائے بر وے گر به تقلیدِ من انشا کرده است

زشت گفتم لیک دادِ بذله سنجی داده ام / شوخیِ طبعی که دارم ایں تقاضا کرده است

می کند تائیدِ برہاں لیک برہاں ناپدید / نیست جز تسلیم تو کش ہر چه انشا کرده است

سستیِ طرزِ خرامِ خامهٔ برہاں نگار / یا نمی دانست یا دانسته اخفا کرده است

بہر من توہین و بہر خویش تحسیں جابجا — ہم مراہم خویش را در دہر رسوا کردہ است
آید و بیند ہمہ اندر کتابِ مولوی — ہر چہ از ہنگامہ گیراں کس تماشا کردہ است
لغو و حشو و ادعائے محض و اطنابِ مُمل — مار و موش و سوسمار و گربہ یکجا کردہ است
بگذر از معنی ہمیں الفاظ برہم بستہ ہیں — بادہ نبود شیشہ و ساغر مہیا کردہ است
یافتم از دیدنِ تاریخہائے ایں کتاب — خود بدم گفت و باجواب خود ایما کردہ است
غازیاں ہمراہ خود آورد از بہرِ جہاد — تا نہ پنداری کہ ایں پیکار تنہا کردہ است
جوش زد از غایتِ قہر و غضب خود در دلش — تاز بانش را بدیں کلپترہ گویا کردہ است
آتشِ خشمے کہ سوزد صاحبِ خود را انخست — در دلش ہمچوں شرر در سنگ ماوا کردہ است

چوں نباشد باعثِ تشنیع جز رشک و حسد
باد غالب خستہ تر گر خستہ پروا کردہ است

خلاصہ ۔ مولوی احمد علی احمد نے فارسی زبان کے متعلق ایک کتاب لکھی ہے۔ انھوں نے ایک ہندوزادہ یعنی قتیل کو اپنا پیشوا بنایا ہے۔ نہ معلوم خاطر والا میں کیا گذری کہ ہندیوں کو فارسی دانی میں مسلّم الثبوت مان لیا۔ ہر شخص اپنی مادر وطن کی زبان سے آشنا ہوتا ہے۔ اس لئے اپنے اجداد کے وطن کی زبان میں زباندانی کا دعویٰ کرنا بیجا ہے۔ اگر ان کے آبا اصفہانی تھے تو اس سے ان کو کیا فائدہ جبکہ خُدا نے خود ان کو بنگالہ میں پیدا کیا ہے۔ قتیل، جامع برہان اور لالہ ٹیک چند صاحب بہار عجم کی اتنی خاطر کیوں ہے کہ ان کو منصف، صدر امین اور صدر اعلیٰ بنا دیا۔ اگر ہندوستانیوں سے انھیں پیار ہی ہے تو میں بھی ہندوستانی ہوں۔ پھر مجھ پر تبرا کیوں کیا گیا اور میری گفتگو کی خوبیوں کو نظر انداز کر دیا گیا۔ اس سے تو چشم بینا پر بڑا ظلم ہوا۔ اسس

ہنگامہ کے برپا کرنے کا مقصد فقط شہرت حاصل کرنا ہے۔ صاحب علم و ادب جوش غضب میں کمینوں کی طرح نفرت و بدگوئی کا دفتر کھول بیٹھے۔ لڑائی میں گالیاں دینی نیچ لوگوں کا کام ہے۔ آغا صاحب نے جو کام کیا اس سے علم کو شرم آ رہی ہے۔ وہ جامع برہان کا انتقام لے رہے ہیں۔ جو کچھ ہم نے اس کے ساتھ (یعنی جامع برہان کے ساتھ) کیا خواجہ نے (یعنی آغا نے) وہی ہمارے ساتھ کیا۔ میں تو ایک سپاہی زادہ ہوں، میری گفتگو کا انداز سخت ہونا ہی چاہیے لیکن افسوس ہے ان پر کہ انھوں نے میری تقلید کی۔ میں نے بدگوئی کی اس طرح کہ داد بذلہ سنجی بھی دی ہے۔ چونکہ میری طبیعت ہی شوخ ہے، لہٰذا میری طبیعت کا تقاضا ہی یہی تھا۔ وہ برہان کی تائید کر رہے ہیں لیکن بے دلیل۔ صاحب برہان کے طرز لغزش کو یا تو جان ہی نہ پائے یا پھر دانستہ حقیقت کو چھپایا۔ انھوں نے جا بجا میری توہین اور اپنی تحسین کی ہے۔ مولوی کی کتاب لغو، حشو، ادعائے بیجا اور اطناب مخل کا مجموعہ ہے۔ یعنی انھوں نے سانپ، چوہے، گوہ اور بلی کو اکٹھا کر دیا ہے معانی کو چھوڑ کر الفاظ کو دیکھو، شراب تو ہے ہی نہیں اور ساغر و مینا جمع کر دیے۔ قطعات تاریخ دیکھ کر معلوم ہوا کہ انھوں نے اکیلے ہی مجھے برا بھلا نہیں کہا بلکہ اپنے احباب کو بھی اس طرف متوجہ کیا ہے۔ میرے خلاف جہاد کرنے کے لئے غازیوں کو (یعنی تعریظ نگاروں کو) بھی اپنے ساتھ لائے ہیں۔ تاکہ یہ نہ سمجھا جائے کہ انھوں نے یہ جنگ تنہا کی ہے۔ لیکن معلوم ہونا چاہیے کہ غصّے کی آگ پہلے غصّہ کرنے والے ہی کو جلاتی ہے۔

غالب نے لکھا ہے کہ انھوں نے موید برہان دیکھی نہ تھی۔ صرف یوسف علی کے چند باتوں کی اطلاع دینے پر انھوں نے یہ قطعہ لکھا۔ لیکن قطعہ کی بعض ابیات

سے واضح ہے کہ انھوں نے اگر بغور نہیں تو سرسری طور پر پوری کتاب ضرور دیکھی تھی۔ یا پھر یوسف علی نے بہت کچھ لکھ بھیجا تھا اور غالب کا یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ احمد علی نے برہان کی تائید کی مگر بے دلیل۔

احمد علی کے ایک شاگرد مولوی عبدالصمد فدا سلہٹی نے غالب کے اس قطعہ کے جواب میں ایک قطعہ لکھ بھیجا۔ فدا کا قطعہ یہ ہے۔

فرق حق و باطل اے صاحب نظر خنوز من　　گر ترا جویائے حق ایزد تعالیٰ کردہ است

دید چوں غالب سوید آں کتابِ لاجواب　　کش بصد تحقیق املا ہادیٔ ما کردہ است

قطعۂ در پوزشِ کرد ار خود ترتیب داد　　گاہ درو ے فخر گہ لطف و مدارا کردہ است

گفتگو بالائے طاق از اصل مضمون کتاب　　ہرزہ گوئی ہرچہ دارد بے محابا کردہ است

گاہ می گوید ز فخر و کبر و عجز و انکسار　　"ہم مرا ہم خویش را در دہر رسوا کردہ است"

گاہ فریادے ہمی از غایتِ رشک و حسد　　"مار و موش و سوسمار و گربہ یکجا کردہ است"

حیف مرزا شد چرا زینساں سراسر بوالفضول　　کبر و زعمش عیب او را آشکارا کردہ است

من کیم عبدالصمد ہمنام[1] استاد اسد[2]　　شہر سلہٹ مولدم ایزد تعالیٰ کردہ است

من یکے از کمتریں خُدّام آغا احمدم　　چوں بدیدم معترض ایں شکوہ بیجا کردہ است

پاسخ اقوال بیجایش نوشتم بیدرنگ　　کردہ ام ابطال ہر یک آنچہ ایما کردہ است

من نخست ابلہ فریبہائے او ظاہر کنم　　نام اکثر کردہ اخفا بعض را وا کردہ است

از سروری قوسی و فرہنگہائے معتبر　　ہرچہ ہست اندر ادلہ جملہ اخفا کردہ است

ہا دیم قول بہار[3] آوردہ اندر بعض جا　　می نویسد احمد او را صدر اعلیٰ کردہ است

---

[1] ہرمزد عبدالصمد۔ [2] غالب کا تخلص جو پہلے تھا۔ [3] ٹیک چند بہار

اوستادم ما ہر فن گر حکم شد قبح چیست
چون نگارش را باہلِ فارس ہمتا کردہ است

بازی گوید کہ احمد سستی، برہان نگار
یا نمی دانست یا دانستہ اخفا کردہ است

گر بدے اخفائے حق منظور او ریس چرا
سہو برہان چند جا نیکو ہویدا کردہ است

بسمل و ایثار بخش، آوندی و دیگر لغت
کن تماشا گر خدایت چشم بینا کردہ است

گر کسے بیند کتابش درج گوید بالیقیں
دُرّ و لعل و عسجد و یاقوت یکجا کردہ است

حبّذا اعجاز خوش در کار بردہ اوستاد
ہم لغت ہم صرف و نحو و شعر انشا کردہ است

ہم دران قطعہ دگر رہ گوید آقائے مرا
"ننگ دارد علم از کاریکہ آغا کردہ است"

نیک اے یاران! بگوشِ ہوش خود تان جا دہید
ہر چہ از تحقیق الملا خواجہ، ما کردہ است

فاضلان و شاعرانِ کشورِ ایران و تور
بر زبان دارند این مطلع کہ سروا کردہ است

مطلع

ننگ دارد علم از کاریکہ مرزا کردہ است
رنگ دارد علم از کاریکہ آغا کردہ است

ہم باحمد می نگارد میرزائے سالخورد
"ساز نطقِ موطن اجداد بیجا کردہ است"

این اگر بیجا بود اے ناظرینِ باخرد
غالبِ ہندی چرا در پارس انشا کردہ است

نیک می دانند دانایان تحقیق آشنا
کز مجیب و معترض کہ کار بیجا کردہ است

میرزا را از بخاری بودن آبا چہ سود
خالق او را چو بہ ملکِ ہند پیدا کردہ است

زشت گوئی را چو کار سفلہ داند بس چرا
نامیانِ ہند را دشنام بیجا کردہ است

عذر بدگفتن بود او را سپاہی زادگی
خوش جوابے از سپاہی زادہ پیدا کردہ است

جد آغا بُد سپہ سالار فوج نادری
خواجہ غافل زاں سبب ایں سست دعویٰ کردہ است

مصرعِ دیگر طراز د غالبِ زیبا بیاں
"تا برآرد نام ایں ہنگامہ برپا کردہ است"

اوستادم بہر نام ایں کار خود نگرفتہ پیش
مردہ را جاں داد حقا کار عیسیٰ کردہ است

بشنوید اے دوستاں! آخر خدارا بشنوید
حضرتِ غالب با احمد ایں چہ ایما کردہ است

"می کند تائید برہان لیک برہاں ناپدید"
در برائے خویشتن توصیف بیجا کردہ است

داد ازیں ناراستی فریاد زیں ناراستی
ہر کہ دیدہ نسخہ را کے باور اینہا کردہ است

ہر یک از اقوال احمد با سندہا مستند
اوستادم خود ستائی ہمچو او ناکردہ است

از کلامِ ہرزہ و اقوال پوچ و بے نشاں
وائے غالب خویشتن را خوار و رسوا کردہ است

شیخ را دانم کہ علم و فضل او گمرہ نہ کرد
نخوت و کبرے کہ دارد ایں تقاضا کردہ است

چوں نظر انداخت بر تقریظہائے آں کتاب
دوستانِ احمدی را وہ چہ ایما کردہ است

"غازیاں ہمراہِ خویش آورد از بہرِ جہاد
تا نہ پنداری کہ او پیکار تنہا کردہ است"

دوستانِ احمدی غازی و پیکارش جہاد
حق بدستِ کیست ظاہر در معما کردہ است

جنگ غازی باکہ باشد در جہاں داند خلق
حیف خود را از زبانِ خویش رسوا کردہ است

چیست جز ایں موجب خرسندی تو اے فلاں
اوستادت خواجہ را تعلیم جاہا کردہ است

گر بظاہر او کند انکار لیکن خفیۃً
لامحالہ ورد جانش ہر سخن را کردہ است

خُلاصہ — اے صاحبِ نظر! اگر خُدا تعالیٰ نے تجھے جویائے حق بنایا تو حق و باطل کا فرق مجھ سے سُن۔ جب غالب نے ہمارے اُستاد کی لاجواب محققانہ کتاب موید برہان دیکھی تو اپنے کردار کی معذرت میں ایک قطعہ لکھا جس میں انھوں نے

غرور اور انکسار دونوں سے کام لیا ہے۔ لیکن کتاب کے اصل موضوع سے
ہٹ کر ہرزہ سرائی پر اُتر آئے ہیں۔ کبھی تو کہتے ہیں کہ صاحب موید برہان نے
مجھ کو بھی اور اپنے کو بھی رُسوا کیا اور کبھی جذبۂ حسد کے تحت کہتے ہیں کہ سابؔ
جو ہے گوہ اور بلی کو جمع کر دیا ہے۔ لیکن افسوس اس یاوہ گوئی سے اپنے ہی
عیب کو آشکار کیا۔ میں کون ہوں؟ عبدالصمد یعنی غالب کے اُستاد (یعنی ہرمزد
عبدالصمد) کا ہمنام، سلہٹ کا رہنے والا۔ میں آغا احمد کے کمترین خادموں میں
ہوں۔ میں غالب کے بیجا اقوال کا جواب دے رہا ہوں اور ان کی ہر بات کی تردید
کر رہا ہوں۔ پہلے تو میں ان کی ابلہ فریبیوں کو ظاہر کرنا چاہتا ہوں۔ غالب نے
سوائے چند کے سب ناموں کو پوشیدہ رکھا ہے۔ دلائل کے طور پر سروری، قوسی
اور دیگر معتبر فرہنگوں سے استفادہ کیا ہے لیکن ان کے نام حذف کر دئے (یعنی
ان کا حوالہ نہیں دیا) اور چونکہ ہمارے اُستاد نے بعض جگہ لالہ ٹیک چند جامع
بہار عجم کے قول پیش کئے ہیں اس لئے غالب کہتے ہیں کہ احمد نے ٹیک چند کو
صدر اعلیٰ بنا دیا۔ اگر ایک ماہر فن اُستاد حکم بنا تو اس میں قباحت کیا ہے پھر
کہتے ہیں کہ احمد یا تو برہان کی لغزشوں کو جان ہی نہ پائے یا پھر جان بوجھ کر پردۂ
خفا میں رکھا۔ اگر انھیں اخفائے حق منظور ہوتا تو وہ برہان کی بعض غلطیوں کو
ظاہر کیوں کرتے۔ اگر خدا نے آپ کو چشم بینا عطا کی ہے تو "بسمل وایثار بخش
وآوندی" اور دوسرے الفاظ کی بحثوں کو ملاحظہ کیجئے۔ جو کوئی ان کی کتاب کو
ملاحظہ کرے گا وہ یقیناً کہے گا کہ لعل، عسجد، یاقوت اور گوہر جمع کر دئے ہیں۔ غالب
کہتے ہیں کہ آغا نے وہ کام کیا جس سے علم کو شرم آرہی ہے۔ لیکن ایران کے فاضلوں

اور شاعروں کی زبان پر یہ مطلع چڑھا ہوا ہے۔

ننگ دارد علم از کارے کہ مرزا کردہ است
رنگ دارد علم از کارے کہ آغا کردہ است

یعنی مرزا نے جو کام کیا اس سے علم شرمندہ ہے اور آغا نے جو کام کیا اس سے علم پر نکھار آگیا۔ بوڑھے مرزا احمد کے بارہ میں فرماتے ہیں کہ احمد کا اپنے اجداد کے وطن کی زبان کا ذکر چھیڑنا بیجا ہے۔ ناظرین غور کا مقام ہے کہ اگر یہ بیجا ہے تو غالب ہندی فارسی میں کیوں لکھتے ہیں۔ (ان کو ہندی میں لکھنا چاہیے) - اہل تحقیق اچھی طرح جانتے ہیں کہ مجیب و معترض میں کس کا کام بیجا ہے۔ اگر مرزا کے آبا بخاری تھے تو اس سے مرزا کو کیا فائدہ۔ خدا نے تو انھیں ہندوستان میں پیدا کیا ہے۔ اگر وہ بدگوئی کو کمینوں کا فعل سمجھتے ہیں تو انھوں نے خود ہندوستان کے ناموروں کو گالیاں کیوں دیں۔ اپنی بدگوئی کا یہ اچھا عذر پیش کیا کہ میں سپاہی زادہ ہوں۔ اگر یہی بات ہے تو آغا صاحب کے دادا بھی نادر شاہ کی فوج کے سپہ سالار تھے۔ مرزا یہ خوب کہتے ہیں کہ احمد نے شہرت حاصل کرنے کے لئے یہ ہنگامہ برپا کیا ہے۔ لیکن میرے اُستاد نے اس ہنگامے کا آغاز نہیں کیا۔ اُنھوں نے تو مُردے کے اندر جان ڈال دی ہے اور مسیحا کا کام کیا ہے۔ اے دوستو! خُدا کے واسطے سنو کہ غالب نے احمد کے بارہ میں کیا فرمایا۔ فرماتے ہیں کہ برہان کی تائید کرتے ہیں لیکن بے دلیل۔ اور احمد نے جابجا اپنی تعریف آپ کی ہے۔ انصاف کا مقام ہے۔ جس کسی نے ان کی کتاب کا مطالعہ کیا غالب کے قول کا یقین نہیں کیا۔ ہمارے اُستاد نے غالب کی طرح اپنی تعریف آپ نہیں کی۔ غالب نے

اپنی ہرزہ سرائی اور پوچ کلامی سے اپنے کو رُسوا کر دیا۔ جب غالب کی نظر مؤید برہان کی تقریظوں پر پڑی تو انھوں نے دوستان احمدی کی طرف کیا ہی اچھا اشارہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ "احمد جہاد کے لئے اپنے ساتھ غازیوں کو بھی لائے ہیں اکیلے نہیں آئے ہیں"۔ غور فرمائیے دوستان احمدی غازی اور ان کی لڑائی جہاد۔ دیکھئے غالب اس معما گوئی کے اندر بتا گئے کہ حق کس طرف ہے۔ ساری دُنیا جانتی ہے کہ غازی کی جنگ کس کے ساتھ ہوتی ہے (یعنی احمد اور ان کے ساتھی مجاہدین اہل حق اور غالب اور ان کے ساتھی اہل باطل)۔

غالب کے ایک شاگرد منشی باقر علی نے مولوی عبدالصمد فدا کے قطعہ کے جواب میں ایک قطعہ لکھا۔ منشی باقر کا قطعہ ملاحظہ ہو۔

ہاں تماشائے سخندانان معنی آشنا — الکنی با فصحی ہنگامہ برپا کردہ است

ماجرائے طرفہ باشد قصۂ باشد عجیب — زاغ پیش بلبلے سر شور و غوغا کردہ است

صعوہ با شہباز گرم رزم شد نے نے غلط — روبہے با شیر جنگِ فتنہ آرا کردہ است

ہاں کجا احمد علی و حضرتِ غالب کجا — ذرۂ خود را باوج مہر مہتا کردہ است

غالب آمد غالب بر شاعرانِ نکتہ سنج — گلشنِ معنی نے گلگشت مطرا کردہ است

در فنِ معنی ہر آں کس با فلک سر بر کشید — سجدۂ خاکِ در او زیب سیما کردہ است

رستمِ میدان معنی حضرتِ غالب بود — رحم بر شوخی کہ با وے جنگ برپا کردہ است

گفت در ردِّ کتابِ حضرتِ غالب کتاب — ایں مگس را بیں کہ با شہباز پروا کردہ است

گرچہ زاید باشد از حیثیتش نامِ خدا — لائقِ تحسیں بود کارے کہ آغا کردہ است

از چہ جہلش گشت ثابت با دلیلِ قاطعی — دعوی تردید قاطع گر نہ بیجا کردہ است

ہم بغور و فکرِ بسیار ز تحریرِ جواب | سرسری ہر آنچہ کلکِ غالب انشا کردہ است
خود چو قاصر گشت آغا کوچک ابداش چرا | خویش را با اوستادِ خویش رسوا کردہ است
آں فدائے بے خرد بیچارہ بنگالی نژاد | من فدائے او چہ خوش تقریر انشا کردہ است
چوں نداند شیوۂ گفتار را ناداں چرا | ریشِ خندۂ خلقِ خود را بے محابا کردہ است
شوخیِ طبعش بنازم آنکہ در عرضِ کمال | پردۂ شرم و حیا از روئے خود وا کردہ است
در گمانِ خویش خود پشت و پناہِ اوستاد | عیبِ پنہانش حقیقت آشکارا کردہ است
سستیِ طرزِ کلامش گر نویسم سربسر | دفترے باشد بشرحِ آنکہ انشا کردہ است
لیک ظاہر می کنم زاں جملہ عیبِ چیدہ | تا ببیند ہر کہ حقش چشم بینا کردہ است
با فصاحتہا کہ دارد ایں چنیں ارشاد کرد | "بر زباں دارند ایں مطلع کہ سودا کردہ است"
بر نمودن واز مطلع پر غریب است و عجیب | نیک نتواں گفت کیں بیہودہ املا کردہ است
سر برہنہ بودن است از عادتِ بنگالیاں | آنچہ خود می کرد شعرش نیز گویا کردہ است
باز می سازد بہ دیگر جا چنیں تقریرِ خوش | "کز مجیب و معترض کہ کار بیجا کردہ است"
نیک می دانند اہلِ راز کیں اشباعِ کاف | از فصاحت مصرع را بیشک معرا کردہ است
گر بگفتن زیں نمط بودے فصیح و خوب تر | "کز مجیب و معترض آخر کہ بیجا کردہ است"
شد ترنم آشنا جائے بآہنگِ دگر | "نا میانِ ہند را دشنام بیجا کردہ است"
کردنِ دشنام کے باشد روا نزدِ فصیح | بے خبر از کوچۂ دانش چہ آیا کردہ است
غیر ازیں از سستیِ ترکیب لغو و حشوِ نغز | پختہ مغز بہائے او ہر چہ تقاضا کردہ است
ہمچو روزِ روشن است و نیک بر دفن گشتہ است | بر سخندانِ جہاں ہر کس تماشا کردہ است
با ہمہ فقدانِ استعداد ایں شور و شغب | بود کے جائز مگر از راہ سودا کردہ است

بے خرد شاگرد ی احمد کہ کرد ست آشکار | تا چہ طرفے بست زیں کار یکہ پیدا کردہ است
ہاں بیا، ناداں بیا، با اوستادِ خود بیا | غالب اُستادِ جہانش حق تعالیٰ کردہ است
سر بخاکِ آستانش نہ پےِ عذرِ گناہ | حق پرستیہا اگر در دل تُرا جا کردہ است
سر مکتوم معنی بوالہوس ایں جا بجوے | گر دلت رمزِ معانی را تمنا کردہ است

با قرار ازشکرِ نہ، ایں کے تواں آمد بروں
کہ مرا تلمیذ غالب حق تعالیٰ کردہ است

خُلاصہ ۔ اے سخندانان معنی آشنا ذرا ملاحظہ تو فرمایئے ایک لڑکھڑاتی زبان والا ایک فصیح ترین شخصیت سے ہنگامہ آرا ہوا ہے۔ عجیب تماشا یہ ہے کہ کوا بلبل کے مقابلے میں چیخ پکار کر رہا ہے۔ شہباز کے ساتھ رزم آرا نہیں بلکہ لومڑی شیر کے ساتھ فتنہ آرا ہوئی ہے۔ کہاں حضرت غالب اور کہاں یہ احمد علی! ذرہ بلندی میں آفتاب کی برابری کرنے لگا ہے۔ غالب تمام شاعران نکتہ سنج پر غالب ہے۔ اس کے قلم نے گلشن معنی کو آراستہ کیا۔ جو بھی فن معنی میں آسمان کا ہمسر بنا غالب کے دروازے کی خاک سے اپنی پیشانی کو مزین کیا۔ غالب میدان معانی کا رستم ہے۔ جو اس کے ساتھ برسر پیکار ہوا اس کی شوخی پر رحم کرنا چاہیے۔ احمد نے حضرت غالب کی کتاب کے رد میں کتاب لکھی ہے۔ ذرا سی مکھی کو دیکھو شہباز کے ساتھ پرواز کر رہی ہے۔ چونکہ آغا نے اپنی اوقات سے بڑھ کر ایک کام کیا ہے اس لئے قابل تعریف ہے۔ اس نے اپنی جہالت سے بدلیل ثابت کر دیا کہ قاطع برہان کی تردید کا دعوٰی بیجا ہے۔ جب خود آغا جواب دینے سے عاجز رہا تو اس کے شاگرد نے اُستاد کے ساتھ اپنے کو کیوں ذلیل کیا۔ میں اس بیچارے بنگالی النسل

بیوقوف فدا کی خوش نگاری پر فدا ہو گیا۔ یہ نادان جب گفتگو کا طریقہ نہیں جانتا تو کیوں گفتگو کر کے لوگوں کو اپنے اوپر ہنسوایا۔ میں اس کی شوخیِ طبع پر ناز کرتا ہوں کہ اس نے اپنے چہرے سے شرم و حیا کا پردہ اٹھا دیا۔ اپنے گمان میں اپنے اُستاد کا سہارا بنا۔ لیکن حقیقت میں اس کے عیب کو آشکار کر دیا۔ اگر اس کے کلام کی لغزشوں کو ضبط تحریر کروں تو ایک دفتر بن جائے۔ اس لئے میں چند خاص الخاص عیوب بیان کر رہا ہوں۔ کس فصاحت کے ساتھ یہ مصرعہ ارشاد فرمایا ہے۔

"بر زباں دارند ایں مطلع کہ سروا کردہ است"

"سراز مطلع وانمودن" کیا بیہودہ تحریر ہے۔ ننگا سر رہنا بنگالیوں کی عادت ہے۔ جو وہ خود کرتا ہے اپنے شعر سے بھی وہی کروا دیا۔ دوسری جگہ یہ خوش بیانی ہے۔

"کز مجیب و معترض کہ کار بیجا کردہ است"

کاف اشباع نے مصرعہ کو فصاحت سے بے نصیب کر دیا۔ اگر مصرع یوں ہوتا۔ ؎

کز مجیب و معترض آخر کہ بیجا کردہ است

تو فصیح تر اور حسین تر ہو جاتا۔ ایک اور جگہ یوں ترنم ریز ہوتا ہے۔

نامیاں ہند را دُشنام بیجا کردہ است

دُشنام کردن فصحا کے نزدیک جائز نہیں لیکن علم زبان سے ناآشنا کرتا ہی کیا۔ اس قسم کی کتنی ہی سستی، ترکیب اور لغو و حشو ہے۔ اس فقدان استعداد کے باوجود یہ شور و شغب کب زیب دیتا ہے۔ لیکن دیوانگی کے ہاتھ سے مجبور تھا۔ اے نادان!

غالب کو خدا نے اُستادِ عالم بنایا ہے۔ لہٰذا اگر تیرے دل میں حق پرستی کا جذبہ ہے تو تو خود بھی آ اور اپنے اُستاد کو بھی ساتھ لیتا آ اور عذرِ گناہ کے لئے ان کی چوکھٹ پر سر رکھ دے۔

عنوان قطعہ دوم

قطعہ دوم بجواب مولوی عبدالصمد فدا از نتائج افکار سید فخرالدین حسین دہلوی سخن تخلص تلمیذ و نبیرۂ حضرت جناب اسداللہ خاں غالب ممدوح الصدر تعالی اللہ شانہ و مدظلال جلالہٗ

مولوی احمد علی آں واقفِ ہر علم و فن — در سخن با جدِ من پیکار بیجا کردہ است
دیگرے عبدالصمد شاگرد آں زیبا بیاں — ہم دریں جنگ و جدل تائید آغا کردہ است
آں یکے ہرزہ درا مغرور بر گفتار خویش — ویں دگر خود بیں کہ ایں ہنگامہ برپا کردہ است
آں یکے عاقل کہ می خواہد نمائے خویشتن — ویں دگر الکن کہ با افصح سخنہا کردہ است
آں یکے حاسد کہ می دارد سرِ پیکار ہا — ویں دگر ناداں کہ خود را نیز رسوا کردہ است
می تراود خوں ز چشم من چوں می کنم جواب — آنکہ از رشک و حسد در نظم انشا کردہ است
دسترس باشد اگر بر مدعی من آں کنم — آنکہ در پیکار اسکندر بدارا کردہ است
ہاں بیا اے ساکنِ بنگالہ با من در ستیز — خالقِ کونین دہلی مولدِ ما کردہ است
در سخن سنجی سخن دارم تخلص آشکار — با تامل بیں کہ کلکِ من چہ انشا کردہ است
حضرتِ غالب کہ یک عالم بود تلمیذ او — وائے بر آغا کہ با وے جنگ برپا کردہ است
آں سخن سنجیکہ در روزِ ازل پیشِ ظہور — از رضائے حق تعالیٰ مشق املا کردہ است

آں معانی آفریں کز حکمِ ربِّ ذوالمنن
ہر کہ پنہاں در عدم بود آشکارا کردہ است

عرفیٔ وقتش بگویم گر بمطلب وا رسد
خامۂ جادو طرازش آنچہ انشا کردہ است

با چنیں کس در سخن پیکار آغا ناسزا
خویشتن را بیگماں در دہر رسوا کردہ است

وہ چہ خوش گفتار دارد در زبانِ فارسی
از تفاخر ایں چنیں تقریر زیبا کردہ است

"من کیم، عبدالصمد در شعر نامِ من فدا
شہرِ سلہٹ مولدم ایزد تعالیٰ کردہ است"

من فدائے شوخیٔ تحریرِ آں جادو بیاں
نامِ خود را با فصاحت آشکارا کردہ است

جائے دیگر بے سبب از غایتِ رشک و حسد
بہرِ غالب ایں چنیں تحریر بیجا کردہ است

"دوستانِ احمدی غازی و پیکارش جہاد
حق بدستِ کیست ظاہر در معما کردہ است"

اے فدا چوں از مذاقِ شاعری آگہ نۂ
تو چہ دانی حضرتِ غالب چہ انشا کردہ است

گر بہاں مفہوم باشد از جہاد و غازیاں
در ہمیں مضمونِ کفر اندر دلت جا کردہ است

بشنو از من بے خبر ایں پاسخِ دنداں شکن
ہمتِ مردانۂ من ایں تقاضا کردہ است

ہندیاں دارند با غالب تولا در سخن
کافر آں باشد کہ از غالب تبرا کردہ است

اے کہ غالب ہست در دینِ سخن پیغمبرے
آنچہ کرد آغا باو شخصے بموسیٰ کردہ است

متفق ہستند بر ایں جملہ اربابِ خرد
لائقِ نفریں بود کاریکہ آغا کردہ است

حاشا للہ من نخست او را نگفتم ناسزا
پاسخِ اقوال او دادم کہ انشا کردہ است

اے سخن داناں با انصاف آخر بشنوید
در جوابِ قاطعِ برہاں کہ بیجا کردہ است

تا چہ اندیشید آغا کاندریں عرضِ جواب
از رہِ تہذیب گمرہ خویشتن را کردہ است

بو العجب ہا ماندہ ام کایں صاحبِ علم و ادب
با چنیں فہم و فراست ایں چہ آیا کردہ است

من عزیزِ غالبم ہم در سخن تلمیذ او
عرض می دارم باو کایں جنگ برپا کردہ است

گفتگو داری چوں در مُوجزِ کتاب لاجواب | آنکہ در تردید برہاں غالب انشاکردہ است
گفتگو با من بفرما پا سخش بشنو زمن | در حضورِ حضرتِ غالب چہ انشا کردہ است
شرط آں باشد ولیکن در جوابِ اعتراض | آں چناں نبود کہ در اخبار املا کردہ است
محترز باشید از تحریرِ الفاظِ درشت | تا نگوید غیر کایں بیہودہ املا کردہ است
لیک آں دانم کہ از آغا نباشد احتیاط | حق زبانش را چو با دشنام گویا کردہ است
اے سخن بر یک سخن اکنوں سخن کوتہ کنم | خواجہ از رشک و حسد ایں شور غوغا کردہ است

اوستادِ من شدہ از بہرِ آں محسودِ خلق
بر ہمہ غالب چو اورا حق تعالیٰ کردہ است

خُلاصہ۔ ہر علم وفن سے آگاہ مولوی احمد علی میرے نانا سے برسرِ پیکار ہوئے ہیں۔ اس جنگ میں ان کا شاگرد عبدالصمد بھی ان کے ساتھ ہے۔ ان ہنگامہ کرنے والوں میں احمد علی تو خود بیں ہیں اور عبدالصمد ہرزہ گو۔ وہ تو عقلمند ہیں اور خود نمائی چاہتے ہیں اور لڑائی کا دماغ رکھتے ہیں اور اس نادان نے اپنے کو ذلیل کیا۔ شعر میں اس کا جواب دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اگر مجھے دسترس ہوتا تو میں اس مدعی کے ساتھ وہی کرتا جو سکندر نے دارا کے ساتھ کیا۔ اے بنگال کے رہنے والے! آ اور میرے ساتھ لڑ۔ خالق دو عالم نے دہلی کو میری جائے ولادت بنایا ہے۔ ایک عالم حضرت غالب کا شاگرد ہے۔ افسوس ہے آغا پر کہ وہ اُستادِ عالم کے ساتھ برسرِ پیکار ہوئے۔ غالب وہ سخن سنج ہیں جو روز ازل میں ظہورِ عالم سے پہلے مشق سخن کرتے چلے آئے ہیں۔ یہ وہ معانی آفریں ہیں جنھوں نے خُدا کے حکم سے وہ سب کچھ آشکار کر دیا جو عدم میں پنہاں تھا۔ میں انھیں عرفیِ وقت

اور ان کے قلم کو جادو نگار کہوں گا۔ ایسے آدمی کے ساتھ آغا کی لڑائی بیجا ہے۔ بیشک انھوں نے یہ لڑائی مول لے کر دنیا میں اپنے کو ذلیل کیا۔ سبحان اللہ عبدالصمد کا کیا تفاخر ہے۔

من کیم عبدالصمد در شعر نامم من فدا
شہر سلہٹ مولدم ایزد تعالیٰ کردہ است

یعنی میں کون؟ عبدالصمد اور شاعری میں میرا نام فدا اور اللہ تعالیٰ نے شہر سلہٹ کو میری جائے ولادت بنایا ہے۔ کس فصاحت کے ساتھ اپنا نام ظاہر کیا ہے۔ قربان جاؤں اس جادو بیانی کے۔ دوسری جگہ رشک و حسد کی بنا پر غالب کے بارہ میں کیا بیجا تحریر سپرد قلم فرمائی ہے۔

دوستانِ احمدی غازی و پیکارش جہاد
حق بدستِ کیست ظاہر در معما کردہ است

یعنی دوستان احمدی غازی اور ان کی لڑائی جہاد ہے۔ غالب نے معما میں ظاہر کر دیا کہ حق کس طرف ہے۔ ارے او فدا! تو تو مذاق شاعری سے واقف نہیں، پھر تو کیا جانے کہ غالب نے کیا نکتہ ارشاد فرمایا ہے۔ جو مفہوم تو نے لیا ہے اس سے تیرے دل میں کفر بیٹھ گیا۔ اے بے خبر! سُن، شاعری میں ہندوستان والے غالب سے محبت رکھتے ہیں (اور وہی ایمان و حق ہے) اور جو غالب پر تبرا کرتے ہیں وہی کافر ہیں۔ اور چونکہ غالب دین شاعری کے پیغمبر ہیں اس لئے آغا نے ان کے ساتھ وہی کام کیا جو فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کیا۔ تمام ارباب عقل کا اتفاق ہے کہ آغا نے جو کام کیا وہ لائق نفریں ہے۔ آغا نے قاطع برہان کا

جواب لکھ کر گمراہی اختیار کی۔ تعجب ہے کہ اس صاحب علم و ادب نے اس قدر علم و فراست کے باوجود ایسی گمراہی اختیار کی! برہان کی تردید میں غالب نے جو لاجواب کتاب لکھی آپ کو اس میں کلام ہے اور آپ نے غالب کے بارہ میں جو کچھ لکھا اس کا جواب مجھ سے سُنئے۔ لیکن شرط یہی ہے کہ جواب دینے اور اعتراض کرنے میں سخت الفاظ استعمال نہ کئے جائیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ آغا سے احتیاط نہ ہو سکے گی۔ کیونکہ خدا تعالیٰ نے ان کی زبان کو بدگو بنایا ہے۔

فدا صاحب نے ایک قطعہ میں باقر صاحب اور سخن صاحب دونوں کے قطعات کا مشترک جواب دیا ہے۔ جوابی قطعہ یہ ہے

مولوی باقر علی باقرؔ تخلص قطعۂ
در جواب قطعۂ ایں بندہ انشا کردہ است

ہمچنیں نظمِ دگر بنوشت فخرالدین حسین
کو تخلص در سخن سنجی سخن را کردہ است

من جواب ہر دو قطعہ می نویسم یک بیک
کلک من در حق و باطل فرق پیدا کردہ است

باقرا اندر لغت "دشنام کردن" آمدست
ز اہل فن خواجہ حسن در شعر املا کردہ است

اینکہ می گوئی کہ "سروا کردن" آمد بر غریب
بر غریب است آنچہ اندر خاطرت جا کردہ است

لفظ "واکردن" بود با "باز کردن" متحد
در لغت بیں گر ترا در دل خلکے جا کردہ است

نیز وصف جبہہ و پیشانی و مانند آں
صائب استادِ سخن "واکردن" املا کردہ است

می کنم تحسیں کنوں بر قطعۂ باقر کہ او
دفتر از جوش فصاحتہائے خود وا کردہ است

زاں فصاحتہائے او رانم سخن در چند شعر
می تواں فہمید ازیں دیگر چہ انشا کردہ است

ہاں سخنداناں بخوش اضراب و ترقی بنگرید
اندریں شعریکہ کلکِ باقرا املا کردہ است

"صعوہ با شہباز گرم رزم شد" نے غلط
روبہے با شیرِ جنگ فتنہ آرا کردہ است

نغز تر باشد ازیں ہم آں دو شعرِ دیگرش　　کز بلندی جاے بر اوجِ ثریا کردہ است

"گرچہ زاہد باشد از حیثیتش نامِ خدا　　لائقِ تحسیں بود کارے کہ آغا کردہ است"

"ہم بغور و فکرِ بسیارے ز تحریرِ جواب　　سرسری ہر آنچہ کلکِ غالب انشا کردہ است"

لفظ "حیثیت" بجاے علم می خواہد شد　　زاہل پارس آں ازیں معنی کہ املا کردہ است

خوش مضاف آوردہ در شعرِ دوم لفظِ جواب　　دوستاں! ببینید کایں ہندی تماشا کردہ است

ریشخندہ خلق خوش بستہ ست در شعرِ دگر　　ضحکۂ خلق از زبانِ خویش خود را کردہ است

جاے دیگر باز می گوید کہ "ایں اشباعِ کاف　　از فصاحت مصرع را بیشک معرا کردہ است"

خندہ می آید مرا بر خردہ گیری ہاے او　　خود بدو آنگہ بطعنِ غیر لب وا کردہ است

عین "مصرع" را فگند و خونِ شعرِ خود بریخت　　خونِ ایں بر گردنش ظلم آشکارا کردہ است

عین را افگندن از کوری نباشد چیست ایں　　آرے آرے فرطِ جہلش کورا دراکردہ است

بارخ اشباعِ کاف از قولِ او روشن بجود　　کاندریں دو شعرِ نغز خود چہ املا کردہ است

"غیر ازیں ارستیٔ ترکیب لغو و حشو نغز　　پختہ مغزیہاے او ہرچہ تقاضا کردہ است"

"با قرار از شکرانہ ایں کہ تواں آمد بروں　　کہ مرا تلمیذِ غالب حق تعالیٰ کردہ است"

چشوکہ چوں ہر دو با اشباع آوردہ خودش　　ہر جوابے کو کند آں پاسخِ ما کردہ است

ہم نشستِ لفظ "شکرانہ" تماشا کردنیست　　شکر و شکرانہ مرادف آشکارا کردہ است

سرسری نتواں ازیں شعرِ تو اے باقر گذشت　　بسکہ لطف و خوبیش محوِ تماشا کردہ است

"ہمچو روزِ روشن است و نیک روشن گشتہ است　　بر سخندانِ جہاں ہر کس تماشا کردہ است"

ماوراے خبط ایں لفظِ "سخندانِ جہاں"　　طرفہ حسن و خوبیٔ شعر آشکارا کردہ است

لفظِ واحد را بجاے جمع آوردن چرا　　ایں چنیں جا ہا چہ لفظے را تقاضا کردہ است

آفریں خوانم کنوں بر حسنِ گفتارِ سخن — کوز شاگردیِ غالب فخر و دعویٰ کردہ است
قطعۂ خود را مزین کردہ با عنوانِ نثر — تا نہ پنداری کہ مشقِ نظم تنہا کردہ است
چیست معنیٔ "تعالی اللہ شانہ" نحویاں — ایں عجب ترکیب در روئے قائل املا کردہ است
بچنیں باہائے مضموم آں دگر فقرہ بہ بیں — رفع جائے کسرائے نحوی چہ بیجا کردہ است
بنگرید اے شاعراں یک رہ کہ شاگردِ رشید — شعر خوش در مدحِ اُستاد خود انشا کردہ است
"عرفی و قتیل بگویم گر بمطلب وا رسد — خامۂ جادو طرازش آنچہ انشا کردہ است"
فاعلِ فعلِ "رسد" یا ظاہر آمد پس کدام — فعل واحد یا بحذفِ فاعل املا کردہ است
بانہ ربطِ ہر دو مصرعہ از رہِ ترکیب چیست — حیرتے دارم کہ آیا ایں ز سودا کردہ است
"بوالعجب ہا ماندہ ام" با لفظِ "ہا" باشد عجب — جمع و واحد اندریں یک فقرہ یکجا کردہ است
"در عجب ہا ماندہ ام" یا "بوالعجب ماندم" ہمیں — جائے آں فقرہ چرا قائل نہ انشا کردہ است
لفظِ "حاشا" با الف بنوشت و خواندن بے الف — گر نمی خواند الف را از چہ املا کردہ است
"بشنود فرما" خطاب و فعلِ غائب کردہ است" — جمع ایں ہر دو بیک شعر از چہ املا کردہ است
باز در تقریرِ معنیٔ کلامِ اوستاد — ہاں تماشائے سخن طرفہ تماشا کردہ است
دید چوں غالب تقاریظِ کتابِ لاجواب — خوش تریں شعرے بمدحِ احمد انشا کردہ است
"غازیاں ہمراہِ خویش آوردہ از بہرِ جہاد — تا نہ پنداری کہ ایں پیکار تنہا کردہ است"
یاد خواہد بود یاراں! بیش ازیں در پاکش — کلکِ حق گوئے من ایں دو شعر املا کردہ است
"دوستانِ احمدی غازی و پیکارش جہاد — حق بدستِ کیست ظاہر در معما کردہ است"
"جنگِ غازی با کہ باشد در جہاں دانندِ خلق — حیف خود را در زبانِ خویش رسوا کردہ است"
لیک شرحِ ایں سخن شاگردِ او گوید چنیں — "غازی آں باشد کہ با غالب تولا کردہ است"

نیک سنجیدا اے سخن سنجان معنی آشنا! گفتۂ غالب چہ معنی را تقاضا کردہ است

ہرزہ گوئی این چنیں کر دست و انگہ نام آں "یا رخِ دنداں شکن" یا رب ایچہ زیبا کردہ است

در حقیقت یا بخش دندان او را خود شکست "یا رخ دنداں شکن" نامش ازیں جا کردہ است

بر سخن ایراد تا کے اے فدا آخر ترا

ایں نہ بس باشد کہ موزوں شعر انشا کردہ است

خلاصہ ۔ مولوی باقر علی نے میرے قطعہ کے جواب میں ایک قطعہ لکھا ہے اور فخر الدین حسین نے بھی ایک قطعہ لکھا ہے۔ میں دونوں کا جواب ایک ساتھ دے رہا ہوں اور بتانا چاہتا ہوں کہ میرے قلم نے حق و باطل کا کیا فرق دکھایا ہے۔ باقر میاں! "دشنام کردن" بھی محاورہ ہے اور ارباب فن میں خواجہ حسن نے اپنے شعر میں استعمال کیا ہے۔ "سروا کردن" کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ استاد سخن حضرت صائب نے جبہہ وا کردن" "پیشانی وا کردن" وغیرہ لکھا ہے۔ اب باقر کی شیوہ بیانی کی تعریف کرنا چاہتا ہوں۔ اس شعر میں

صعوہ با شہباز گرم رزم شد نے نے غلط

رو بہے با شیر جنگِ فتنہ آرا کردہ است

اضراب و ترقی دیکھیے۔ اور اس شعر سے بڑھ کر تو یہ دو شعر ہیں۔

گرچہ زاید باشد از حیثیتش نام خدا لائقِ تحسیں بود کارے کہ آغا کردہ است

ہم بغور و فکر بسیارے ز تحریر جواب سرسری ہر آنچہ کلکِ غالب انشا کردہ است

لفظ "حیثیت" علم کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ اہل فارس کے کلام سے اس کی سند چاہیے۔ دوسرے شعر میں لفظ "جواب" کیا خوب مضاف ہے۔

یہ ہندی کا اچھا تماشہ ہے۔ دوسرے شعر پر لوگوں کو ہنسی آگئی۔ باقر نے لوگوں کو اپنے اوپر ہنسوایا۔ ایک جگہ باقر کہتا ہے کہ یہ کاف اشباع ہے۔ اس کاف کی وجہ سے مصرع فصاحت سے گر گیا۔ مجھے اس کی خردہ گیری پر ہنسی آرہی ہے۔ جو عیب اپنے میں ہو اسی عیب پر دوسرے کو طعنہ دیتا ہے۔ مصرع کا عین ساقط ہونے سے خود اس کے شعر کا خون ہوگیا۔ عین کو ساقط کرنا اندھاپن نہیں تو کیا ہے۔ واقعی فرط جہالت نے اسے اندھا بنا دیا۔ کاف اشباع کا جواب اس کے ان شعروں میں موجود ہے۔

غیر ازیں از سستیٔ ترکیب لغو و حشو نغز　　پختہ مغز یہائے او ہرچہ تقاضا کردہ است

باقر از تشکرانہ ایں کے تواں آمد بروں　　کو مرا تلمیذ غالب حق تعالیٰ کردہ است

چہ اور کہ دونوں اشباع ہیں یہی مثالیں میرا جواب ہے اور لفظ "تشکرانہ" کا محل استعمال ملاحظہ ہو۔ تشکرانہ بمعنی تشکر استعمال کیا ہے۔ اس شعر کو دیکھیے:

ہمچو روز روشن است ونیک روشن گشتہ است

بر سخندان جہاں ہر کس تماشا کردہ است

شاعر کا خبط تو اپنی جگہ "سخندان جہاں" نے شعر کے حسن کو چمکا دیا ہے۔ یعنی سخندان جہاں بجائے سخندانان جہاں "یعنی واحد بجائے جمع۔ اب سخن صاحب کی خوبیٔ کلام کی داد دینا چاہتا ہوں۔ شاگردی غالب کا دعویٰ بڑے فخر کے ساتھ کیا ہے۔ اس نے اپنے قطعہ کا عنوان نثر میں لکھا ہے۔ یہ اس لئے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ سخن کو صرف نظم نگاری آتی ہے، نثر نگاری نہیں آتی۔ مگر یہ " تعالیٰ اللہ شانہ" کے کیا معنی ہیں۔ اس ترکیب نے مجھے اس کی نگارش کا قائل کر دیا اور "ظلال جلالہٗ"

میں ہا بالضمہ کیا؟ یہ تو بالکسرہ ہونا چاہیے۔ اے سخن سنجو! ملاحظہ ہو کہ شاگرد رشید نے اپنے اُستاد محترم کی تعریف میں کیا عمدہ شعر نکالا ہے۔

عرفیٔ وقتش بگویم گر بمطلب وا رسد
خامہ جادو طرازش آنچہ انشا کردہ است

فعل "رسد" کا فاعل لامعلوم ہے۔ فاعل لامعلوم کے لئے فعل جمع آتا ہے نہ کہ واحد۔ علاوہ اس کے دونوں مصرعوں میں ربط کیا ہے۔ شاید جنون کے تحت ایسا ہو گیا اور "بوالعجب ہا" میں یہ "ہا" تو عجیب ہے۔ اس فقرے میں واحد و جمع دونوں یکجا ہو گئے ہیں۔ یا تو "در عجب ہا ماندہ ام" ہونا چاہیے یا پھر "بوالعجب ماندم" ہونا چاہیے۔ اور "حاشا" میں الف لکھا تو گیا لیکن بے الف پڑھا جاتا ہے اگر نہ پڑھنا تھا تو لکھا کیوں؟ مزید سُنئے! "بشنو" اور "فرما" خطاب اور فعل "کردہ است" غائب یعنی صیغہ واحد حاضر کے لئے فعل واحد غائب آیا۔ سخن صاحب! اپنے اُستاد کے کلام کو دیکھئے کیا نظارہ پیش کیا ہے۔ انھوں نے جب کتاب لاجواب فرید برہان کی تقریظیں دیکھیں تو ایک حسین شعر کہہ دیا۔

غازیاں ہمراہ خویش آوردہ اند بہرِ جہاد
تا نپنداری کہ ایں پیکار تنہا کردہ است

یعنی احمد علی جہاد کرنے کے لئے اپنے ساتھ غازیوں کو بھی لائے ہیں تاکہ یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ تنہا جنگ کرنے آئے ہیں۔ دوستوں کو یاد ہوگا کہ اس کے جواب میں میرے حق نگار قلم نے یہ دو شعر لکھے تھے۔

دوستانِ احمدی غازی و پیکارش جہاد حق بدستِ کیست ظاہر در معما کردہ است

Scanned by CamScanner

جنگ غازی یاکہ باشد درجہاں دانند خلق   حیف خود را از زبانِ خویش رسوا کردہ است

یعنی بقول غالب دوستان احمدی غازی ہیں اور ان کی لڑائی جہاد۔ گویا انھوں نے گول مول انداز میں بتا دیا کہ حق کس طرف ہے۔ دُنیا جانتی ہے کہ غازیوں کی جنگ کس کے خلاف ہوتی ہے۔ لیکن غالب کے شاگرد صاحب اپنے اُستاد کے کلام کی یوں تشریح کرتے ہیں۔

غازی آں باشد کہ با غالب تولا کردہ است

یعنی غازی وہ ہے جس نے غالب سے محبت کی۔ غالب کے شعر کا یہ اچھا مطلب نکالا ہے۔ اس نے بکواس کی ہے اور اپنی بکواس کا نام دنداں شکن جواب رکھا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ اس کے جواب نے خود اسی کے دانت توڑ دیے ہیں۔ اس لئے اس جواب کا نام دنداں شکن جواب رکھا۔ فدا کو نہیں چاہیے کہ سخن پر زیادہ اعتراض کرے۔ کیونکہ یہی کیا کم ہے کہ اس بیچارے نے شعر موزوں کر لیا۔

باقر صاحب کے قطعہ کی شان میں یہی کہنا کافی ہے کہ

مصرعہ تو کچھ نہیں ہے فقط ٹھونس ٹھانس ہے

باقر صاحب نے فدا کی ایک بھی گرفت کا جواب نہیں دیا۔ فدا کی ایک گرفت یہ تھی کہ غالب نے دوستان احمدی کو غازی اور ان کی لڑائی کو جہاد کہہ کر گویا مان لیا کہ حق احمد کی طرف اور کفر غالب کی طرف ہے، کیونکہ دُنیا جانتی ہے کہ غازیوں کا جہاد کفر و باطل کے خلاف ہوتا ہے۔ باقر کو کم سے کم اس گرفت کا جواب دینا چاہیے تھا۔ مگر اس طرف توجہ دینے کی بجائے وہ کہتے ہیں کہ فدا کے قطعہ میں

اتنی لغزشیں ہیں کہ اگر ان کو جمع کیا جائے تو ایک دفتر بن جائے۔ مگر وہ کُل تین ہی غلطیاں نکال سکے۔ باقر بالکل اپنے اُستاد کی طرح مبالغہ کرتے ہیں۔ ان کے اُستاد کو برہان قاطع میں ہزار نہیں بلکہ ہزارہا غلطیاں نظر آئیں اور بڑی دھوم دھام سے قاطع برہان شائع کی۔ لیکن اس میں ایک سو تیس سے زیادہ غلطیاں نہ دکھا سکے۔ اور کتاب کی ضخامت بڑھانے کے لئے دوسروں کی غلطیاں بھی شامل کرنی پڑیں۔ دوسرے اڈیشن یعنی درفش کاویانی میں اور چند ہی غلطیوں کا اضافہ کر سکے۔

باقر نے خدا کی غلطیاں نکالنے کو تو نکالیں مگر خود ان سے بدتر غلطیاں کر گئے: "ہر شاعراں، شکرانہ بجائے شکر اور سخندان جہاں" بجائے سخندانان جہاں مبتدیوں جیسی غلطیاں ہیں۔ علاوہ اس کے کاف اشباع کے ساتھ چ اشباع بھی خود ان کے قطعہ میں موجود ہے۔ لہٰذا باقر کی شان میں خود ان کی یہ بیت چست ہے۔

باہمہ فقدان استعداد ایں شور و شغب
بود کے جائز مگر از راہ سودا کردہ است

سخن صاحب نے اپنی ہمہ دانی کی نمائش کے لئے "تعالی اللہ شانہٗ" اور "مد ظلال جلالہٗ" جیسے بھاری بھرکم عربی فقرے استعمال کئے۔ تعالی اللہ شانہٗ مہمل فقرہ ہے۔ اس کا مطلب ہوا کہ "بڑا ہو اللہ اس کی شان" یا پھر اسے کھینچ تان کر یوں بامعنی کیا جا سکتا ہے کہ "اللہ کی شان بڑی ہو" لیکن سخن صاحب کہنا چاہتے ہیں کہ "اللہ ان کی (یعنی غالب کی) شان بڑی کرے" مد ظلال جلالہٗ میں ظلال اور جلالہٗ مضاف اور مضاف الیہ ہے۔ اس لئے "ل" بالکسرہ ہونا چاہئے۔ یہ جلال کا سایہ بھی خوب ہے۔ جلالہٗ اور شانہٗ یہ دو الفاظ اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص

ہوگئے ہیں۔ مثلاً عام طور پر کہتے ہیں اللہ جلّ جلالہٗ و تعالیٰ شانہٗ۔ تعالیٰ کا لفظ بھی اللہ کے لئے مخصوص ہے۔ سخن صاحب کو غالب کے لئے "شانہ" اور "جلالہ" استعمال نہیں کرنا چاہیے تھا۔

اسی طرح سخن صاحب مولوی فدا کی سب سے بڑی گرفت کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہوئے بالکل بہکی باتیں کر گئے۔ غالب دوستان احمدی کو غازی اور ان کی پیکار کو جہاد کہتے ہیں لیکن سخن صاحب دوستان احمدی کو کافر اور احمد کی پیکار کو فرعون کی لڑائی کہتے ہیں۔ دونوں کا تضاد دیکھیے۔ سخن صاحب کے خیال کے مطابق کافروں کو غازی اور کافروں کی لڑائی کو جہاد کہنا چاہیے۔ ان کے کہنے کے موافق فرعون نے موسٰی علیہ السلام کے خلاف جہاد کیا تھا۔ بہرحال سخن صاحب کی بدولت ہمیں چند اصطلاحات کے صحیح معنی معلوم ہوئے۔ یعنی غازی اور مومن وہ ہے جو غالب سے محبت کرے اور کافر وہ ہے جو غالب کی مذمت کرے۔ لہٰذا مفسّرین قرآن کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ "جاہدوا فی سبیل اللہ" یا ایہاالکافرون اور یا ایہاالذین آمنو" کی تفسیریں غلط کرتے چلے آئے ہیں۔

یہ قطعہ بازی مؤید برہان کا جواب نہیں ہوسکتی تھی۔ اس لئے قطعہ بازی کا سلسلہ ختم کیا گیا اور مؤید برہان کی کاٹ کے لئے غالب نے "تیغ تیز" چمکائی۔ غالب منشی حبیب اللہ خاں ذکا کو ایک خط مورخہ ۱۴ مارچ ۱۸۶۶ء میں لکھتے ہیں کہ "مؤید برہان میرے بھی پاس آگئی ہے اور میں اس کی خرافات کا حال بقید شمار صفحہ و سطر لکھ رہا ہوں" (اردوئے معلّٰی)

غالب نے بقول انھیں کے احمد علی کی خرافات کو کتابی شکل میں "تیغ تیز" کے نام سے شائع کیا۔ کہتے ہیں۔

برآنم بہ نیروے ایں تیغ تیز
کہ مغزِ عدو را کنم ریز ریز

عدو آنکہ برہان قاطع نوشت
بگفتار سُست و بہنجار زشت

زہے نامہ کز فرّ اقبال او
"یکے تیغ تیز" آمدہ سال او

"یکے تیغ تیز" سے مادہ تاریخ ۱۲۸۲ھ نکلتا ہے۔ تیغ تیز کا دیباچہ ملاحظہ ہو۔

"اللہ جل شانہ اپنے بندوں کو ورزش امور خیر کی توفیق دے۔ اچھا ہے وہ بندہ جس کو ظلم کی خو نہ ہو۔ اور ظلم کے انواع ہیں۔ از اں جملہ ایک سخن پروری ہے کہ اس کو بے ایمانی کہنا چاہیے۔ یعنی کتمان حق اور اعلان باطل بامرار۔ اسد اللہ خاں غالب کہتا ہے کہ میں نے خاص نظر برہان قاطع کی سستی اور بیان کی غلطی اور اطناب مُمِل کی نکوہش میں ایک رسالہ لکھا اور اس کا نام قاطع برہان اور درفش کاویانی رکھا۔ جب بعد انطباع وہ رسالہ مشتہر ہوا تو پہلے پہل اس مثل ہندی کے "بیل نہ کودا گون کودی گون" ایک مرد بے مغز معوج الذہن نہ فارسی داں نہ عربی خواں نے میری نگارش کی تردید میں ایک کتاب بنائی اور چھپوائی۔ محرق قاطع اس کا نام رکھا اور اس کو مشتہر کیا۔ میرے ایک یار نے اس کتاب کے جواب میں کچھ لطائف جمع کیے، اور "لطائف غیبی" اس کا نام رکھا اور وہ نسخہ بھی مشہور ہوا۔ پھر ایک مرزا رحیم بیگ میرٹھ کے رہنے والے بروئے کار آئے اور ایک تحریر مسمّٰی بہ ساطع برہان نکال لائے۔ مطالب مندرجہ لغو، بیشتر محرق قاطع کے

مضامین سے منقول۔ فقیر نے صرف ایک خط مرزا جی کو لکھ بھیجا۔ زیادہ اس طرف التفات کو تضیع اوقات جانا۔ ثالثاً میاں امین الدین کہ اب پٹیالہ میں ملقب بہ مدرس ہیں انھوں نے ایک قاطع القاطع چھپوایا۔ استعداد سے بُعد، صرف مقاصد نحو و صرف فارسیت کی اس قدر رعایت منظور رکھی کہ فقیر کے بعض فقروں کی ترکیبیں اپنی عبارت کے قالب میں ڈھال لیں۔ باقی سوائے عربی قشری اور فارسی مسروقہ کے وہ مغلظ گالیاں دی ہیں جو کنجڑے، بھٹیارے استعمال کرتے رہتے ہیں۔ کمال یہ کہ ان کا منطق ہندی اور حضرت کی عبارت فارسی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کئی جُلاہے ان دنوں میں علم تحصیل کرکے مہذّب ہو گئے ہیں، عمامہ باندھے ہوئے پڑے پھرتے ہیں۔ فحش نہیں بولتے۔ خلاف اپنی قوم کے صاحب و قبلہ ان کا روزمرہ ہے۔ یارب! میاں امین الدین کس بُری قوم کے اور کس پاجی گروہ کے ہیں کہ مولوی کہلائے، مدرّس بنے، الفاظ مستعملہ قوم نہ چھوڑے۔ اگر میری طرف سے ازالہ حیثیت کی نالش دائر ہو جاتی تو میاں پر کیسی بنتی؟ میرے کبر نفس نے ازالہ حیثیت کے لفظ کو گوارا نہ کیا۔ ان کی تحریر ان کے پاجی پن پر سجل ہے۔ بمہر ذرہ تا آفتاب۔ رابعہم مدرس احمد علی صاحب، عربیت میں امین الدین سے بڑھ کر، فارسیت میں برابر، فحش و ناسزاگوئی میں کمتر، جتنے الفاظ توہین و تذلیل کے ہیں وہ چُن چُن کر میرے واسطے صرف کئے اور یہ نہ سمجھا کہ غالب اگر عالم نہیں، شاعر نہیں، آخر شرافت و امارت میں ایک پایہ رکھتا ہے، صاحب عزّ و شان ہے عالی خاندان ہے، امرائے ہند، رؤسائے ہند، راجگان ہند سب اس کو جانتے ہیں، رئیس زادگان سرکار انگریزی میں گنا جاتا ہے۔

بادشاہ کی سرکار سے نجم الدولہ خطاب ہے۔ گورنمنٹ کے دفتر میں 'خاں صاحب، بسیار مہربان دوستاں' القاب ہے۔ جس کو گورنمنٹ خاں صاحب لکھتی ہے اس کو سڑی اور گتا اور گدھا کیوں لکھوں۔ فی الحقیقت یہ تذلیل بفحوائے ضرب الغلام اہانۃ المولیٰ، گورنمنٹ بہادر کی توہین اور وضیع و شریف ہند کی مخالفت ہے۔ میرا کیا بگڑا، مولوی نے اپنا پاجی پن ظاہر کیا۔ میں نے معلّم امین بیدین کو شیطان کے حوالے کیا اور احمد علی کے الفاظ مذموم سے قطع نظر کر کے ان کے مطالب علمی کا جواب اپنے ذمہ لیا۔ اس نگارش کا نام تیغ تیز رکھوں گا اور بعد اتمام اس کو چھپواؤں گا اور اپنے احباب دور و نزدیک کی خدمت میں بھجواؤں گا اور اگر مرگ نے امان نہ دی تو خیر۔ مصرع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اب یہاں سے آغاز فصول ہے۔ داد کا طالب غالب"

غالب کو احمد علی سے شکایت ہے کہ انھوں نے غالب کی ذاتی اور خاندانی شرافت و عظمت اور شاہی اور گورنمنٹی اعزاز کا کوئی لحاظ نہ کیا اور ان کو سڑی گتا اور گدھا وغیرہ کہا۔ مگر خود غالب کی گفتار نے غالب کے دعوی شرافت و عظمت کو بے طرح صدمہ پہنچا لیا۔ اس شکایت کے دو ہی صفحے بعد غالب نے ایک نہایت ہی گھناؤنی اور غیر شریفانہ تشبیہہ کا استعمال کیا۔ احمد علی نے مؤیّد برہان کے دیباچے میں لکھا ہے کہ چونکہ غالب کے اکثر اعتراض بیجا اور بے بنیاد ہیں اور غالب نے صاحب برہان پر صد درجہ ستم ڈھائے ہیں اس لئے میں نے غالب کی مخالفت اور برہان کی طرفداری اختیار کی۔ انصاف پسند ناظرین سے امید ہے کہ

موید برہان کا مطالعہ فرماتے وقت دامنِ انصاف کو ہاتھ سے نہ چھوڑیں گے اور مظلوم برہان کو غالب کے پنجۂ ظلم سے نجات دلائیں گے۔ غالب احمد علی کی اس حمایت کی پکار کو تشبیہتہً یوں بیان کرتے ہیں۔

"لوطیان ایران میں رسم ہے کہ چند بدمعاش جمع ہو کر ایک امرد کو کچھ دے کر باغ میں یا کسی مکان میں لے جاتے ہیں اور نوبت بہ نوبت اس سے اغلام کرتے ہیں اس جماعت میں سے ایک شخص اس امرد کا سر پکڑے رہتا ہے۔ سو موید برہان کے پانچویں صفحے میں مولوی جی لوگوں کی منتیں کرتے ہیں اور بلاتے ہیں کہ آؤ اور دکنی کا سر پکڑ لو۔"

یہ تشبیہہ دوسری جگہ بھی دُہرائی گئی ہے۔ اس قسم کی گندہ کلامی اور فحش نگاری کو دیکھ کر یگانہ چنگیزی کہتے ہیں۔

ہاں میرؔ سے اعجاز بیانی سیکھی	گویا کہ تلوار کی روانی سیکھی
اور قاطع برہان سے کیا فیض ملا	غالب کی طرح بدزبانی سیکھی

لیکن مصنف قاطع القاطع کی (جن کا ذکر آئے گا) گالیاں پڑھ کر غالب کو معلوم ہوا کہ اللہ کی دُنیا میں ایک سے ایک آدمی موجود ہے۔

تیغ تیز محض چند صفحوں کا رسالہ اُردو میں ہے۔ احمد علی کی صرف چند تردیدوں سے بحث کی ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب لکھتے ہیں کہ یہ (یعنی تیغ تیز) موید برہان کا جواب ہے مگر احمد کے چند اعتراضات سے بحث کی ہے اور وہ بھی تشفی بخش نہیں۔ مزید یہ کہ متعدد مقامات پر صریحاً خلاف واقعہ باتیں لکھی ہیں (ماثر غالب)

ایک جگہ غالب احمد علی پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ اصل بات سے کترا جاتے ہیں اور طول طویل غیر متعلق بحثیں کرتے ہیں۔ مثلاً لفظ "آہنگ" کو لیجئے۔ غالب کہتے ہیں کہ "مولوی جہانگیر نگری نے موید برہان کے ۸۳ اور ۸۴ صفحے کو سیاہی سے لیپ دیا ہے۔ بارہ معنی آہنگ کے لکھے اور ہر معنی کی سند ایک شعر۔ مثال اس کی یہ ہے کہ ایک گندھی عطر فروش محفل میں آیا اور تنکوں میں روئی لپیٹ کر ہر ایک تنکے کی روئی کو ایک ایک شیشی میں بھگویا اور اہل محفل کو سنگھایا' یہ گلاب کا ہے' یہ سہاگ کا ہے' اور یہ موتیا کا ہے۔ اس طرح مولوی کہتا ہے کہ یہ شعر فلاں کا ہے اور یہ شعر فلاں کا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مولوی نے سب فرہنگوں کو دیکھ کر دس بارہ شعر نقل کئے ہیں۔ یہ تو سب کچھ ہوا لیکن میرے اس فقرے کا جواب کہاں ہے کہ "ہر حال میں ماضی آہنگید ہونا چاہئے نہ کہ آہنگ" سوال کا جواب نہیں اور خرافات ہزار در ہزار' مگر غالب کا صرف یہی اعتراض نہ تھا کہ ہر حال میں ماضی آہنگید ہونا چاہئے بلکہ یہ بھی اعتراض تھا کہ آہنگ کے بیشتر معانی بے سند لکھے ہیں۔ اس وجہ سے احمد علی نے ہر معنی کی سند میں ایک ایک شعر شعرائے عجم کے کلام سے پیش کیا اور جہاں تک آہنگ کے ماضی نہ ہونے کا سوال ہے احمد علی نے برہان کی غلطی تسلیم کر لی ہے۔ لہٰذا آہنگ کی بحث پھر چھیڑنا بے تکی بات ہے۔

جس طرح دینی مسائل پر مُفتیانِ شرع متین سے استفتا کیا جاتا ہے اس طرح غالب نے سولہ سوال مرتب کئے اور ان پر نام نہاد مفتیوں سے فتویٰ بھی لیا۔ ان مُفتیوں میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ مفتی اعظم ہیں اور مولانا الطاف حسین حالی' مولوی سعادت علی اور نواب ضیاء الدین خاں نیرّ' مفتی مصطفیٰ خاں

کے فتاویٰ کی تصدیق کرنے والے ہیں۔ تیغ تیز کے آخر میں ان سوالوں کو مع جوابات شامل کیا گیا ہے۔ مگر یہ ایک طفلانہ حرکت ہے۔

اب سنئے، مفتی صاحبان کون تھے؟ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ غالب کے شاگرد، معتقد اور قدرداں دوست، مولوی سعادت علی ایک غیر معروف شخص ہیں۔ البتہ گورنمنٹ اسکول دہلی میں مدرس تھے۔ یہ بھی غالب کے شاگرد تھے۔ نواب ضیاءالدین خاں نیّر غالب کے چچیرے سالے اور شاگرد تھے۔

قاضی عبدالودود صاحب لکھتے ہیں کہ تعجب ہے کہ غالب کو یہ نہ سوجھا کہ جب میں ہندوستانی فارسی دانوں کو خواہ وہ شاعر ہوں خواہ فرہنگ نویس غیر معتبر قرار دے چکا ہوں تو ہندوستانیوں سے فتویٰ لینے کے کیا معنی۔ اور یہ بات ان کے ذہن میں نہ آئی کہ جو اصحاب خود میری فارسی دانی کے قائل نہیں وہ میرے معتقدین و تلامذہ کو کیا خاطر میں لا سکتے ہیں۔ تمہید کی عبارت عیوب سے مملو ہے۔ سوالوں کا جواب فارسی دانوں اور شاعروں سے طلب کرنا تھا صاحبان قوت ناطقہ و قوت عاقلہ سے استفتا بے محل ہے۔ (مآثر غالب)

مفتی صاحب کے جوابات محققانہ نہیں ہیں بلکہ معتقدانہ ہیں۔ مولوی عبدالغفور نسّاخ اپنی خود نوشت سوانح عمری میں جس کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی مغربی بنگال میں موجود ہے لکھتے ہیں کہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے زیادہ مہذّب آدمی نہیں دیکھا۔ لیکن وہ بھی غالب کے چکّر میں پڑ کر مخالف کو احمق، اندھا اور چارپایہ کہہ گئے۔ غالب نے اپنے سوالوں کا عنوان "اللہ اکبر" رکھا اور شروع میں یہ تحریر شامل کی۔

اللہ اکبر

"صاحبان قوت ناطقہ و قوت عاقلہ سے کہ وہ مقربان بارگاہ مبداء فیاض ہیں غالب کی یہ استدعا ہے کہ جب یہ تحریر کہ استفتا ہے نظر سے گذرے تو احد اللغتین میں سے جو لغت صحیح ہو اس کی صحت اور لغتِ غلط کی غلطی لکھ کر خاتمۂ عبارت پر اپنا نام لکھ دیں۔ مثلاً جہاں میں نے لکھا ہے کہ "چشم عیب بیں" صحیح ہے یا "چشم غلط ساز" اس کے جواب میں رقم فرمائیں کہ چشم عیب بیں صحیح اور چشم عیب ساز غلط ہے۔ یہ عبارت چھاپی جائے گی، اس واسطے ضرور ہے کہ فتوی میں توضیح ہو۔"

یہ بھی عجیب تماشہ ہے کہ مستفتی نے مفتی کو جواب دینے کا ڈھنگ بھی مثال دے کر بتا دیا۔ یعنی یہ کہو کہ "چشم عیب بیں صحیح اور چشم عیب ساز غلط ہے"۔ مطلب یہ ہوا کہ دیکھو سوال کے تیور سے ہیں کیا جواب چاہتا ہوں، جو جواب چاہتا ہوں وہی جواب دو۔ جامع برہان نے تمہید میں دیدۂ غلط ساز لکھا ہے اس لئے سوال ہونا چاہئے تھا کہ "دیدۂ غلط ساز" صحیح ہے یا غلط؟ یہ سوال نہیں ہونا چاہئے کہ چشم عیب بیں صحیح یا چشم عیب ساز؟ چشم عیب بیں تو مابہ النزاع لفظ نہیں۔ پھر اس کے بارہ میں صحیح یا غلط ہونے کا سوال کیوں کیا جائے۔ اس کا مقصد فقط یہ ہے کہ بات کو الجھا کر مخالفین کے دماغ کو پریشان کیا جائے تاکہ وہ اعتراض کا جواب نہ دے سکیں۔ غالب نے یہ بھی لکھا ہے کہ فتوی میں توضیح ہو۔ مگر کوئی توضیح نہیں ہے۔

شمشیر تیز تر۔ غالب کی تیغ تیز کے مقابلے میں احمد علی نے شمشیر تیز تر

نکالی۔ شمشیر تیز تر تاریخی نام ہے اس سے مادۂ تاریخ ۱۸۶۹ء نکلتا ہے اور مصرعہ۔ ترکی دادہ جواب ترکی۔ سے سال ہجری ۱۲۸۶ھ نکلتا ہے۔ ایک سو چھ صفحے کا رسالہ فارسی میں ہے۔ دیباچے کے کچھ حصے یہاں دے جاتے ہیں۔

"میری کتاب موید برہان چھپی اور جناب اسداللہ خاں غالب دہلوی کی نظر سے گذری۔ انھوں نے اسے پڑھ کر جگہ بجگہ سے کچھ نامکمل باتیں جمع کیں اور انھیں ایک رسالے کی شکل میں "تیغ تیز" کے نام سے شائع کیا۔ یہ رسالہ نہ فارسی میں لکھا نہ ترکی میں بلکہ اپنی مادری زبان اُردو میں لکھا ہے۔ اپنے گمان میں موید برہان کا جواب دیا ہے اور اپنی کتاب قاطع برہان کو حذف و اضافہ کے ساتھ دوبارہ شائع کیا ہے اور اس کو "درفش کاویانی" کا لقب دیا ہے۔ گویا انھوں نے میدان معرکہ میں درفش کاویانی (قدیم ایران کا قومی نشان) بلند کیا ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھا کہ جب یہ درفش کاویانی احمد گنجشوں کے ہاتھ میں پڑے گا تو پارہ پارہ ہوجائے گا۔ انھوں نے جو تیغ نکالی وہ جوہر شناسوں کی نظر میں ہیثم بن ربیع کی تیغ ہے۔ ہیثم بن ربیع ایک پرلے درجے کا جھوٹا اور فریبی آدمی تھا۔ اس کے پاس ایک لکڑی کی تیغ تھی۔ اس نے اس کا نام "لعاب المنیہ" (یعنی موت کا لعاب دہن) رکھا تھا۔ مختصر کہ یہ تیغ ایک رگ بھی نہیں کاٹ سکتی تھی۔ کیونکہ فولاد کی بنی تیغ اور ہوتی ہے اور لکڑی کی بنی اور ہوتی ہے۔ مجھے اس رسالے کے بارہ میں کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ اس رسالے کو موید برہان سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی یہ موید برہان کو کاٹ سکتا ہے اور اس رسالے میں جو کچھ کہا گیا ہے موید برہان میں پہلے ہی سے اس کا

جواب موجود ہے۔ اگر ارباب نظر نے موید برہان اور تیغ تیز دونوں کو دیکھا ہوگا تو یہ بات ان کی نظر سے پوشیدہ نہ ہوگی۔ لیکن چونکہ ناسمجھ لوگ دھوکہ کھا سکتے ہیں اس لئے چپ رہنا بھی مناسب نہ تھا۔ چنانچہ تیغ تیز کے مقابلے میں شمشیر تیز تر نکالی گئی۔ کیونکہ

می تواں داد بشمشیر جوابِ شمشیر

(یعنی تلوار کا جواب تلوار ہی سے دینا چاہیئے)۔ ایک امر بحث طلب یہ ہے کہ غالب کہتے ہیں کہ غیر اہل زبان کی لکھی ہوئی فرہنگیں معتبر و مستند نہیں ہوتیں۔ یہ بات حقیقت کے خلاف ہے۔ مثال کے طور پر عربی زبان کی کتب لغات یعنی امام اللغتہ الجوہری الفارابی الترکی کی صحاح، ابوالفضل محمد کاشغری کی صراح اور مجدالدین شیرازی کے قاموس کو لیجئے۔ یہ سب عربی زبان کی مستند فرہنگیں تسلیم کی گئی ہیں۔ میں نے موید برہان میں فرہنگ سُروری اور فرہنگ جہانگیری سے استناد کیا ہے۔ صاحبِ فرہنگ سروری (یعنی مجمع الفرس) سُرور کاشانی تھے اور صاحبِ فرہنگ جہانگیری میر جمال الدین انجو شیرازی تھے سرور کاشانی شاہجہاں کے عہد میں ہندوستان آئے اور انجو اکبر کے دربار میں شش صدی منصب پر فائز تھے۔ جہانگیر کے عہد سلطنت میں چہار ہزاری اور پنج ہزاری منصب پر فائز ہوئے۔ غالب کہتے ہیں کہ میں نے موید برہان میں ہندو اور ہندیوں سے استناد کیا ہے۔ ناظرین کی نظر میں غالب کا یہ قول معتبر نہیں ہو سکتا۔ البتہ جن کا بر ہند کا کلام اہل زبان کے موافق ہے ان سے استناد کیا ہے۔ مثلاً خسرو، فیضی، غنی کاشمیری وغیرہ۔ غالب نے خود فرہنگ جہانگیری اور شرفنامہ احمد منیری سے استدلال کیا ہے (مگر نام لئے بغیر)

اس پر بھی جہانگیری اور خرفنامہ سے استناد کرنے کو غیر معتبر قرار دینا عجائب روزگار میں سے ہے۔ البتہ انصاف اور چیز ہے اور سخن پروری اور چیز۔ واضح ہو کہ غالب ہندی نے بعض فارسی الفاظ کے سلسلے میں اکابر ہند سے استفتا کیا ہے۔ چنانچہ ان کے سوالات اور جوابات کو جو تیغ تیز کے آخر میں شامل ہیں ملاحظہ کیجئے۔ (یعنی غالب نے اپنے سوالات کی تمہید میں بجائے علمائے اہل زبان کے صاحبان قوت ناطقہ و قوت عاقلہ سے فتویٰ طلب کیا ہے اور فتویٰ دینے والے سو فیصدی ہندی ہیں)۔

احمد علی نے دیباچے میں لکھا ہے کہ جب یہ درفش کاویانی احمد کیشوں کے ہاتھ میں پڑے گا تو پارہ پارہ ہو جائے گا۔ اس میں جنگ قادسیہ اور فتح ایران کی طرف بھی اشارہ ہے۔ درفش کاویانی قدیم ایران کا قومی جھنڈا تھا۔ احمد پیغمبر اسلام کا ایک نام ہے۔ اس لئے احمد کیش کا اشارہ پیروانِ احمد یعنی مسلمان فاتحین ایران کی طرف بھی ہے۔ یعنی جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں پیروانِ احمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایران فتح کر لیا اور ایرانیوں کے قومی نشان درفش کاویانی کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اسی طرح غالب کی یہ درفش کاویانی بھی احمد علی احمد اور ان کے معتقدین و تلامذہ کے ہاتھ میں پڑ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی۔ یعنی غالب کے اعتراضات کی دھجیاں اُڑ جائیں گی۔

شمشیر تیز تر میں احمد علی نے تیغ تیز کے تمام اعتراضوں سے طول طویل بحث کی ہے۔ اس میں غالب کے سوالوں اور مفتیوں کے فتاوئی پر بھی تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ ہم قارئین کی دلچسپی اور معلومات کے لئے غالب کے معترضانہ سوالات، مفتیوں کے جوابات، احمد علی کے جواب الجواب اور قاضی عبدالودود صاحب کے

اپنے تبصروں کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

"آتش" باتائے مفتوح یا باتائے مکسور

بُرہان قاطع۔ آتش دراصل "آدیش" کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ اس لئے آتش جو باتائے مفتوح مشہور ہے غلط ہے۔ تمام فرہنگوں میں باتائے مکسور آیا ہے۔ اور اسے "دانش" سے مقفی کیا گیا ہے۔ چونکہ "آدیش" میں دال کے بعد یا ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تا مکسور ہے۔

قاطع برہان۔ یہ دعویٰ کہ "آتش" کو "دانش" کا قافیہ کیا گیا ہے قابل قبول نہیں۔ کیونکہ یہ ہزاروں جگہ "سرکش" اور "مشوش" کے قافیہ میں آیا ہے۔ مثلاً زلالی خوانساری کی مثنوی کی ایک بیت ہے۔

یکے گفتا بدو کائے یار دلکش — کہ مُردہ از عزیزاں گفت آتش

خاقانی نعت میں کہتا ہے۔

باعیں کمالت اے ملک دش — طوبیٰ خشک است دکوثر آتش

اور آدیش کو آتش قرار دینا گمراہی ہے اور اس کی "ی" کو کسرہ سمجھنا ناواقفیت ہے۔ قدیم پہلوی میں آدیش تعظیم و تکریم کے معنی میں ہے۔ فارسی میں آگ کو آتش کہتے ہیں۔

مویدبرہان۔ جامع برہان "ی" کو کسرہ نہیں کہتے ہیں۔ بلکہ وہ کہتے ہیں کہ آدیش کی یائے خطی ماقبل کے حرف (یعنی تا) کے کسرہ پر دلالت کرتی ہے اس لئے آتش کی "ت" کے کسرہ سے انکار ناواقفیت کی دلیل ہے اور آدیش کے

معنی آگ نہ لینا گمراہی ہے۔ تحقیق یہ ہے کہ "آتش" کی "ت"، مکسور ہے اور قدما کے کلام میں "دانش" کے قافیہ میں آیا ہے۔ چنانچہ فخرالدین گرگانی کی مثنوی میں جو شعرائے قدیم سے ہے یہ ذوقافیتیں شعر ہے۔

بہ آب پاک و خاک و آتش و باد
بہ فرہنگ و وفا و دانش و داد

شعرائے متقدمین کے کلام میں آتش کا لفظ یائے اشباع کے ساتھ بھی آیا ہے۔ مثلاً ؎

از بسکہ تنم سوختہ شد ز آتش فرقت
در خرقہ بجز شعلۂ آتیشی ندارم

قدما نے بھی آتش با تائے مفتوح استعمال کیا ہے۔ پس جامع برہان کا یہ کہنا کہ آتش با تائے مفتوح غلط ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وضعاً غلط ہے نہ کہ استعمالاً غلط ہے جیسا کہ متاخرین کے یہاں ہے اور یا لفتحہ غلط العام ہے نہ کہ غلط العوام۔ لہٰذا آجکل بالفتحہ فصیح ہے۔ چنانچہ صاحب جہانگیری، صاحب رشیدی در قاطع برہان نے بھی "تش" کے معنی آگ کے لکھے ہیں اور اس کے مرکبات مثلاً آتشیزہ اور آتشک وغیرہ کو با تائے مفتوح لکھا ہے۔ صاحب جہانگیری نے آدیش کے معنی آتش لکھا ہے اور غالب آدیش کے معنی تعظیم و تکریم بتاتے ہیں۔ لیکن فارسی فرہنگوں میں اور ناموہائے دساتیر میں یہ معنی نظر نہیں آئے۔

نوٹ۔ لفظ آتش کے سلسلے میں احمد علی کی بحث بہت طویل ہے۔ میں نے اس کا مختصر پیش کیا ہے۔ احمد علی کے اس جواب کے باوجود غالب نے تیغ تیز میں اپنے اس

اعتراض کو دُہرایا ہے۔

تیغ تیز۔ جامع بُرہان آتش کی تے کو مکسور بتاتا ہے اور میاں انجو کے قول کو سند لاتا ہے۔ مگر جس حال میں کہ نظامی یہ نقش بٹھاتا ہے۔

نے کو ست حلوائے ہر غم کشی — ندیدہ بجز آفتاب آتشی

خاقانی فرماتا ہے

با عین کمالت اے ملک وش — خوبی خسک است و کوثر آتش

ہر چند سعدی کی نظم اور بہت سے اساتذہ کے کلام میں فتحہ فوقانی آتش کا النقش علی الحجر ثابت ہے لیکن میں دو بالغ کلاموں کی سند دے کر بلغا اور کبرا سے پوچھتا ہوں کہ کیوں حضرت خاقانی اور نظامی سچے یا انجو فرہنگ جہانگیری والا اور دکنی برہان والا سچا۔ وہ دو ایرانی بلند پایہ اور یہ دو ہندی فرومایہ۔ برہان والا اندھا ہے اور فرہنگ جہانگیری اس کی عصا ہے۔ جامع فرہنگ سے تعجب ہے کہ فارسی زبان کے مالکوں کے خلاف اپنے وہم کی رو سے آتش بکسرہ لکھتا ہے۔

غالب کا استفتا نمبرا۔ لغت فارسی کی حقیقت اور حروف کی حرکت میں فردوسی اور خاقانی سچے ہیں یا ہندوستانی فرہنگ لکھنے والے؟

مفتیوں کا جواب۔ فردوسی و خاقانی سچے۔ ہندوستانی ان کے مطابق لکھیں تو سچے، ان کے برخلاف لکھیں تو جھوٹے۔

شمشیر تیز تر۔ موید برہان میں لکھا ہے کہ آتش متقدمین کے یہاں با تائے مکسور اور متاخرین کے یہاں با تائے مفتوح استعمال ہوا ہے۔ اور آتیش اور آدیش میں یائے اشباع تائے مکسور کی دلیل ہے جس کی سند اساتذۂ عجم کے کلام سے پیش

کی گئی ہے۔ علاوہ اس کے خود فرہنگ جہانگیری اور برہان قاطع میں آتش
با تائے مفتوح لکھا ہے۔ اس طرح آفریں بروزن آتشیں، آخش با خائے مفتوح
بروزن آتش لکھا ہے۔ لیکن مصنف کے خیال کے مطابق آتش با تائے مکسور
ہے جیسا کہ آدیش کی بحث میں تشریح کی گئی۔ اور غالب کہتے ہیں کہ یہ دو ہندی!
افسوس ہے اس کہنے پر۔ انجو شیرازی تھے اور برہان تبریزی۔ غالب کو دلیل
کے ساتھ دعویٰ کرنا چاہئے تھا (یعنی انجو اور برہان کے ایرانی نہ ہونے کا ثبوت دینا چاہئے)

"گرفتن کی "ر" کو بالفتحہ ثابت کرنے کے لئے غالب نے جو دلیل پیش کی ہے
وہ دعویٰ کے مطابق نہیں۔ غالب خود ہی کہتے ہیں کہ" اختلاف حرکت ماقبل روی
سے قدما کے دیوان بھرے ہوئے ہیں" اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ گرفت کی "ر"
بالفتحہ نہیں ہے بلکہ گرفت کی "ر" بالکسرہ ہے اور کسرہ کو فتحہ سے بدل کر" رفت"
کے قافیہ میں لایا گیا۔ غالب کہتے ہیں کہ فردوسی نے شاہنامہ میں سو جگہ "گرفت" کو
گفت اور خفت کا قافیہ کیا ہے اور ہزار جگہ شگفت کا قافیہ کیا ہے اور یہ کسرہ
فقط تغایر حرکت ماقبل روی کے قاعدے کی رو سے ہے۔ لیکن غالب کے اس بیان
سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ گرفتن کی "ر" مکسور نہیں ہے بلکہ مفتوح ہے۔ اس سے
تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ فردوسی کے نزدیک بھی گرفت کو جو با رائے مفتوح استعمال
کیا گیا وہ تغایر حرکت ماقبل حرف روی کے قاعدے سے فائدہ اٹھا کر کیا گیا۔
بہر حال غالب نے گرفتن با رائے مفتوح ہونے کے ثبوت میں فردوسی اور
خاقانی کے جو اشعار پیش کئے ہیں ان سے غالب کا دعویٰ مضبوط نہیں ہوتا
اور میں نے جو کچھ موید برہان میں لکھا ہے وہ مولانا جامی اور محقق طوسی کے

رسالوں سے لکھا ہے۔ ان رسالوں کو ملاحظہ فرمائیں جس طرح غالب نے استاد فرخی کے مصرع کا وزن اور تقطیع پوچھ کر علم عروض سے اپنی آشنائی کا ثبوت دیا اسی طرح "گرفت" کی گرفت کرکے علم قوافی سے اپنی آشنائی کا ثبوت دیا۔

قاضی عبدالودود صاحب کا محاکمہ۔ اس سوال میں بڑا فریب ہے۔ فردوسی اور خاقانی شاعر ہیں۔ مگر قطران اور اسدی کی طرح نثر میں اور شمس فخری کی طرح نظم میں کوئی فرہنگ نہیں لکھی۔ شاعر کو الفاظ کے استعمال کا خاص سلیقہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس کی زباندانی اس قسم کی ہو جیسی فرہنگ نگاروں کی ہوتی ہے۔ شعرا کے کلام کا مطالعہ فرہنگوں سے بے نیاز نہیں کر سکتا۔ بلکہ قدیم شعرا کے کلام کا مفہوم فرہنگوں کی طرف رجوع کئے بغیر اچھی طرح سمجھ میں نہیں آسکتا۔ قیاس سے ہر جگہ کام نہیں چل سکتا۔ فرہنگ نگاروں کے مستند ہونے کا دار و مدار اس کے وطن پر نہیں اس کی تحقیقات پر ہے۔ یہ خوب ممکن ہے کسی خاص مسئلے کی تحقیق ہندوستانی ایرانیوں سے بہتر کریں۔ ایرانی خود ہندوستانی فرہنگ نگاروں کی سندیں بے تکلف پیش کرتے ہیں۔ لغات کے معانی تو درکنار، اشعار سے لغات کی حرکات و سکنات کا بھی علم بہت کم ہوتا ہے۔ بڑے لفظوں کو جانے دیجئے، دو حرفی الفاظ "دُر" (بمعنی موتی) اور "دَر" (بمعنی دروازہ) کو لیجئے۔ اگر بطور قافیہ نظم نہیں ہوئے تو زیادہ سے زیادہ جو علم ہو سکتا ہے وہ یہ کہ "ر" ساکن ہے اور "د" متحرک ہے۔ "د" کی حرکت کیا ہے اس کا پتہ مطلقاً نہیں چل سکتا۔ بطور قافیہ آئیں اور حرف وصل سے مل کر "ر" متحرک ہو جائے تو اس صورت میں بھی "د" کی حرکت کا علم نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ وہ قافیہ میں شامل نہیں رہی۔ دَرش اور دُرش بے تکلف ایک دوسرے کا قافیہ

ہوسکتے ہیں "ر" متحرک نہ ہو تو اس صورت میں بھی "د" کی حرکت کا صحیح علم اس وقت
ہوگا جب یہ یقین ہو کہ شاعر اقوا کا مرتکب نہیں ہوا۔ فردوسی کہتے ہیں۔

بہ زرین و سیمیں دو صد تیغ ہند   ہمہ تیغ زہر آب دادہ پرند
ز زابلستاں تا بہ دریائے سند   نوشتیم عہدے ترا بر پرند

ہند کی "ہ" اور سند کا "س" ہر شخص جانتا ہے کہ مکسور ہے۔
پرند کی "ر" کا مفتوح ہونا مسلم ہے۔ فردوسی کے اشعار سے ان حروف
کی صحیح حرکت کا بھی علم نہیں ہوسکتا۔

سوال کی مجموعی حیثیت کو چھوڑ کر یہ دیکھئے کہ غالب نے یہ بحث کیوں
چھیڑی۔ غالب نے قاطع برہان میں دعویٰ کیا تھا کہ جو لوگ سعدی کے شعر کی سند
پر "گرفت" کی "ر" کو مکسور کہتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ فردوسی شاہنامہ میں
سو جگہ "گرفت" کو خفت و گفت کا اور ہزار جگہ شگفت کا قافیہ لایا ہے لیکن
ایک جگہ اسے "رفت" کا قافیہ بھی لایا ہے۔

(سر دل پر از کینہ کردو برفت   تو گوئی کہ عہد فریدوں گرفت)

اور خاقانی نے کہا ہے۔

خور پیش تو رہ پیادہ رفتہ   مہ حاشیہ تو برگرفتہ

سعدی کا شعر جس کا ذکر آیا یہ ہے۔

تبسم کناں دست بر لب گرفت   کہ سعدی مدار آنچہ دیدی شگفت

یہ ظاہر ہے کہ غالب اس سے اختلاف نہیں کرتے کہ شگفت کا گاف
مکسور ہے ورنہ وہ ضرور کہتے کہ سعدی کی سند دینی غلط ہے۔ اگر اس سے اختلاف

نہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ فردوسی نے جب شگفت کے قافیہ میں گرفت ہزار بار استعمال کیا اور گفت و خفت کے قافیہ میں سو بار اور رفت کے قافیہ میں ایک بار تو ایک اور سو کے مقابلے میں ہزار بار جو استعمال کیا گیا اسے ترجیح کیوں نہ دی جائے۔ اور اگر فردوسی ہزار بار ایک طرح اور سو بار ایک طرح تغایر حرکت ماقبل ردی کا ارتکاب کر چکا تو یہ کیوں ناممکن سمجھا جائے کہ رفت، اور گرفت کے قافئے میں عیب ہے۔

ل ۔ رضا قلی خاں ہدایت جو ایران کے ایک بلند پایہ شاعر اور صاحبِ علم و قلم ہیں اپنی فرہنگ انجمن آرائے ناصری میں لکھتے ہیں کہ آدیش با دال مکسور و یائے معروف بمعنی آتش، زیرا کہ تبدیل تا و دال در لغت عجم جائز است و آتش بفتحہ تا چنانکہ مشہور است غلط است ۔ حکیم انوری گوید۔

گر گنند چوب آستان تو حکم شحنۂ چوبھا شود آدیش

غالب کہتے ہیں کہ "گرفت" با رائے مفتوح ہے اور جو لوگ سعدی کے شعر کی سند سے با رائے مکسور کہتے ہیں غلطی پر ہیں۔ اب نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ اور دیگر مفتی حضرات بتائیں کہ کون جھوٹے۔ سعدی جنھوں نے با رائے مکسور لکھا یا وہ جو کہتے ہیں کہ سعدی کے کلام سے سند پیش کرنے والے غلطی پر ہیں۔

"گرفت" کے سلسلے میں فردوسی بھی ساقط الاعتبار ٹھہرتے ہیں۔ کیونکہ انھوں نے با رائے مفتوح بھی لکھا ہے، با رائے مکسور بھی اور با رائے مضموم بھی۔ اس صورت حال کی موجودگی میں خاقانی و فردوسی کے کلام کے مقابلے میں فرہنگوں ہی پر بھروسہ کرنا پڑے گا۔

میں پانچ زبانیں اچھی طرح پڑھ سکتا ہوں ۔ ان زبانوں میں صرف بنگلہ
اور ہندی ہی ایسی زبانیں ہیں کہ ان کی تحریرات پڑھ کر الفاظ کا صحیح تلفظ معلوم
کیا جا سکتا ہے ۔ کیونکہ ان زبانوں کی تحریر میں ہر حرف کے ساتھ ماترائیں (یعنی
اعراب) بھی لکھی جاتی ہیں ۔ اس لئے کوئی لفظ دو تلفظوں کے ساتھ نہیں پڑھا
جا سکتا ۔ انگریزی میں b-u-t بٹ اور p-u-t پٹ اور Colonel
اور Lieutenant کا تلفظ کرنل اور لفٹننٹ ہوتا ہے ۔ عربی، فارسی اور
اردو میں اعراب نہیں لگائے جاتے ۔ اس لئے ان زبانوں کی تحریر پڑھ کر لفظ
کا تلفظ معلوم نہیں کیا جا سکتا ۔ ایک چھوٹے سے چھوٹا یعنی دو حرفی لفظ تین طریقے
طریقے سے پڑھا جا سکتا ہے ۔ مثلاً لفظ "دل" اس لفظ کا نہ جاننے والا اسے دِل
بھی پڑھ سکتا ہے دَل بھی پڑھ سکتا ہے اور دُل بھی پڑھ سکتا ہے اگر تین حرفی لفظ ہو اور
قافئے میں آئے تو اس کے آخر کے حصے کا تلفظ معلوم ہو سکتا ہے ۔ شروع کے حصے کا نہیں ۔
مثلاً شکن اور چمن ہیں "ش" اور "چ" مفتوح ہیں یا مکسور یا مضموم معلوم نہیں ہو سکتا ۔
چونکہ فارسی تحریر میں اعراب نہیں لگائے جاتے ۔ اس لئے فارسی تحریر پڑھ کر
لفظوں کا صحیح تلفظ معلوم نہیں ہو سکتا ۔ لہٰذا صحیح تلفظ معلوم کرنے کے دو ہی ذریعے
ہیں ۔ اوّل فرہنگ دوم ارباب علم سے سن لیا جائے یا پوچھ لیا جائے ۔ ہر لفظ کا
تلفظ ارباب علم سے جا کر معلوم کرنا ناممکن ہے ۔ اس لئے دوسرے ذریعہ سے بہت
کم الفاظ کا تلفظ معلوم کرنے کا موقع ملتا ہے ۔ مگر فرہنگ سے ہر لفظ کا تلفظ
بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے ۔ فردوسی نے گرفت بارائے مفتوح بارائے مکسور
اور بارائے مضموم بھی لکھا ہے ۔ اب فرہنگوں ہی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ان تین

میں صحیح تلفظ کون ہے۔ فرہنگ کو فیصلہ کرنے کا حق اس لئے ہوتا ہے کہ فرہنگ بہت تحقیق اور تفتیش کے بعد لکھی جاتی ہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ سب کے سب الفاظ کا تلفظ معلوم کرنے کا واحد ذریعہ فرہنگ ہے۔ اہل قلم کی تحریر یا اہل علم کی تقریر نہیں۔ غالب نے اپنی نظم و نثر میں جتنے الفاظ استعمال کئے ہیں ان کو ان الفاظ کا تلفظ کس طرح معلوم ہوا؟ کیا ہرمزد عبدالصمد نے قبل از وقت ان سب الفاظ کا تلفظ بتا دیا تھا اور ہرمزد کو معلوم بھی تھا کہ غالب کتنے اور کون الفاظ استعمال کرنے والے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ غالب نے کچھ الفاظ کا تلفظ اپنے اُستادوں سے معلوم کیا اور باقی سب الفاظ کا تلفظ ان فرہنگوں سے معلوم کیا جو ہندوستان میں دستیاب تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہر فرہنگ میں کچھ نہ کچھ غلطیاں ضرور رہ جاتی ہیں اور بعد کے فرہنگ نویس مختلف فرہنگوں اور کتابوں کی محققانہ چھان بین سے ان غلطیوں کی تصحیح کرتے ہیں لہٰذا غالب نے اگر برہان قاطع کی بعض غلطیوں کی تصحیح کی ہے تو اس لئے نہیں کہ وہ ماں کے پیٹ ہی سے وہ غلطیاں معلوم کر کے آئے تھے۔ انھوں نے ان ان الفاظ کے معنی اور تلفظ مختلف فرہنگوں کے مطالعہ سے معلوم کیا تھا۔

غالب نے "گرفت" کو، بارائے مفتوح ثابت کرنے کے لئے خاقانی اور فردوسی کے اشعار سند کے طور پر پیش کئے ہیں۔ مگر گرفت کے گاف کی صحیح حرکت ان شاعروں کے شعروں سے معلوم نہیں کی جا سکتی ہے۔ اب بتایئے گاف کی حرکت کیونکر معلوم ہوگی۔ فرہنگ ہی سے معلوم ہوگی۔

پیدائی، زیبائی، پیدائش، زیبائش

تیغ تیز۔ جناب مولانا ۱۸ صفحے میں حکم دیتے ہیں کہ پیدائی و زیبائی صحیح، پیدائش و زیبائش غلط۔ اقول۔ آخر حاصل بالمصدر بنانے کے لئے دو ہی حرف موضوع ہیں۔ یا آخر میں "شین" یا تحتانی (یعنی "ی")۔ موافق مولوی جی کے اجتہاد کے سیکڑوں لفظ متروک و مطرود ہو جائیں گے۔ ہم کہتے ہیں کہ زیبایش اور پیدایش اور گنجایش کو زیبائی و پیدائی و گنجائی بھی کہہ سکتے ہیں۔ مگر آرایش و آسایش و کاہش و بخش کے آگے بے ترکیب "شین" کی جگہ یاے حطی نہیں لاسکتے اور مقدمہ نہ دلائل کا محتاج ہے نہ نظائر کا حاجتمند۔

غالب کا استفتا نمبر۲۔ پیدائی و زیبائی صحیح اور پیدایش و زیبایش غلط یا چاروں صحیح؟

مفتیوں کا جواب۔ چاروں صحیح۔

شمشیر تیز تر۔ میں نے موید برہان میں غلط العوام کی مثالوں میں پیدایش و زیبایش براے پیدائی و زیبائی لکھا ہے۔ اس کا یہ مطلب کہاں ہوتا ہے کہ حاصل مصدر صرف "ی" اور "شین" لگا کر بنایا جاتا ہے اور میرے اجتہاد کے موافق کون سے سیکڑوں الفاظ متروک و ناقابل استعمال ہو گئے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ماضی مطلق واحد غائب کے آخر میں "ار" لگا کر مثلاً کردار و گفتار، صفت کے آخر میں "ی" لگا کر مثلاً دوستی و مہربانی اور بندگی بھی اور امر کے آخر میں "ش" لگا کر مثلاً کاہش و خواہش و دانش و نالش و گنجایش حاصل مصدر بناتے ہیں۔ لیکن متاخرین کے کلام میں صفت کے آخر میں "ش" لگا ہوا حاصل مصدر

بھی نظر آیا ہے اور گنجائی قیاس کے موافق مستعمل ہے۔ لیکن پیدائش اور زیبائش محتاج دلیل ہے اور اہل زبان شعرا کے کلام میں یہ دو لفظ نہیں آئے۔

قاضی عبدالودود صاحب۔ پیدائش اور زیبائش کے متعلق غالب صرف یہ کہنا کافی سمجھتے ہیں کہ ان کا صحیح ہونا نظائر کا حاجت مند نہیں۔ لیکن چونکہ قاعدہ ان کا مخالف ہے ایرانیوں کی لکھی ہوئی فرہنگوں سے یا ان کے ادب سے ان کے استعمال کی سند پیش کرنی تھی۔ پیدائش مخفی کے دیوان (مطبوعہ و مخطوطہ) میں ایک جگہ ملتا ہے۔ مگر بطور قافیہ نہیں۔ جناب ڈاکٹر عندلیب شادانی نے مجھے اطلاع دی ہے کہ ابوالفضل کے یہاں کئی جگہ آیا ہے۔ آجکل ایرانی بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ مخفی کے معاصر یا اس کے قبل کے ایرانیوں کے یہاں مجھے یہ لفظ نہیں ملا۔ زیبائش اُردو میں مستعمل ہے۔ ایرانیوں کی زبان پر نہیں۔

ل۔ صفت کے آخر میں یاے معروف اور امر کے آخر میں "ش" لگاکر حاصل مصدر بنانے کا قاعدہ بہت پُرانا اور عام ہے لیکن صفت کے آخر میں "ش" لگاکر حاصل مصدر بنانے کا قاعدہ نہ قدیم قواعد فارسی میں ملتا ہے اور نہ جدید قواعد فارسی میں۔ اور چونکہ پیدا اور زیبا صفت ہیں اس لئے مسلمہ قاعدہ کی رو سے پیدائی اور زیبائی صحیح اور پیدائش اور زیبائش غلط ہیں۔ اب اگر دو ایک آدمی خلاف قاعدہ پیدائش و زیبائش استعمال کر گئے ہیں تو وہ صحیح قرار نہیں دئے جاسکتے۔ ورنہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایرانی کی زبان سے جو نکل جائے وہ قاعدہ کلیہ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو اس کو وحی آسمانی تسلیم کرنا چاہئے اور اس پر آمنّا و صدّقنا کہنا ضروری ہے۔ مُرغ کی جمع مُرغاں اور طفل کی جگہ طفلاں ہے لیکن خاقانی نے خلاف قاعدہ مُرغگاں و طفلگاں استعمال کیا ہے۔ تو کیا اب

مرغگاں اور طفلگاں بجائے مرغاں اور طفلاں استعمال کرنا چاہیے۔ اور یہ کہاں کی بات ہے کہ غالب کبھی قاعدے کو اہل زبان کے استعمال پر ترجیح دیتے ہیں اور کبھی اہل زبان کے استعمال کو قاعدہ کلیہ پر ترجیح دیتے ہیں۔ غالب تیغ تیز میں لکھتے ہیں کہ "ماند کو مُند اور خواند کو خُند بولنا لہجہ ہے قاعدہ نہیں۔ شاعر اور منشی کو تتبع قاعدہ کا چاہیے" قاعدہ ہوتا ہی ہے صحیح و غلط میں امتیاز کرنے کیلئے۔ لہٰذا قاعدے ہی کی رو سے فیصلہ کیا جائے گا کہ پیدائش و زیبائش صحیح ہیں یا غلط۔ غالب کے شاگردوں اور معتقدوں کے اُستاد پرستانہ فتوی سے اس کا فیصلہ نہ ہوگا۔ وہ غالب سے بھی بہت کمتر درجے کے محقق اور فارسی داں تھے۔ ہماری اُردو کے امام الفصحا میر انیس "یارب ذوالکرام" استعمال کر گئے ہیں۔ تو کیا ایک افصح اہل زبان کے ذوالکرام استعمال کر جانے سے اس لفظ کو صحیح مان لیا جائیگا۔ غلط بہر صورت غلط ہے۔ اب اگر فصحائے اہل زبان ایک غلط لفظ کو عام طور پر استعمال کرنے لگیں تو اس لفظ کو صحیح تو نہیں کہیں گے مگر "غلط العام فصیح" کے تحت اس کا استعمال جائز سمجھا جائے گا۔ لیکن صرف دو چار آدمیوں کے استعمال کر جانے سے غلط لفظ فصیح و جائز نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ شعر تو ہر شاعر کہتا ہے، لیکن ہر شاعر کو اُستاد سخن اور اُستاد فن کا درجہ حاصل نہیں ہوتا۔ لہٰذا جن شاعروں کو اُستاد سخن اور اُستاد فن کا درجہ حاصل نہ ہو سکا وہ قابل تقلید نہیں ہو سکتے اور ان کے کلام سے پیش کی ہوئی سند قابل قبول نہیں ہو سکتی۔

رانْد۔ مانْد

تیغ تیز۔ (مولوی صاحب) ۱۸ اور ۱۹ صفحے میں ماند و خواند کو بروزن

چاند غلط بتاتے ہیں اور مُند و خُند کو بر وزن تُند و کُند صحیح فرماتے ہیں۔ پس اس سے لازم آتا ہے کہ ماندن و خواندن بھی بے الف بر وزن کُندن ہو جو ہندی اسم زیر بحث ہے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ خوان مع الواو معدولہ و الف اور ماندن مع الالف اور خواند مع الواو اور الف اور ماند مع الالف مولوی جی کی مثال کے مطابق بر وزن چاند صحیح ہے۔ لیکن اہل ایران الف کو سلا دیتے ہیں اور یہ لہجہ ہے، نہ قاعدہ۔ شاعر اور منشی کو تتبع قاعدہ کا چاہیے۔ لہجے کی تقلید بہرویوں اور بھانڈوں کا کام ہے۔

غالب استفتا نمبر ۳۔ راند و ماند در اصل بوزن چاند صحیح۔ رند و مند لہجہ ہے۔ اصل میں بوزن تُند و گُند نہیں۔

مفتیوں کا جواب۔ راند و ماند بروزن چاند صحیح۔ بروزن تُند و گُند لہجہ ہے۔

شمشیر تیز تر۔ لہجہ کے معنی زبان و لغت اور تلفظ کی بناوٹ ہے جیسا کہ فرہنگ میں لکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ "سخن" کی "خ" پر پیش بھی ہے اور زبر بھی ہے۔ اسی طرح اختلاف لہجہ کی بنا پر خود و خورد و خوش کی "خ" متاخرین کے لہجے میں مفتوح بھی ہے اور مضموم بھی ہے۔ اسی طرح "چناں" اور "چنیں" کا لہجہ "چوناں اور "چونیں" ہے۔ دور حاضر کے اہل اعراق "چراغ" کی "ج" بالکسرہ و بالفتحہ دونوں بولتے ہیں۔ بات در اصل یہ ہے کہ مقلد کو (یعنی غیر اہل زبان کو) ہر زبان کا تلفظ اسی زبان کے لہجے کے مطابق کرنا چاہیے۔ عربی کا تلفظ عربی کے مطابق اور فارسی کا تلفظ فارسی کے مطابق کرنا چاہیے۔ لہٰذا زبان کے قواعد مرتب کرنے کا

مقصد ہی یہی ہے کہ زبان کے مطابق لفظ کا استعمال اور لہجہ سیکھا جائے۔اس لئے منشی اور شاعر کو اہل زبان کے لہجے کی تقلید کرنی واجبات میں سے ہے۔متاخرین میں دو قاعدے بہت زیادہ استعمال ہوئے ہیں۔ایک یہ کہ نون غنہ کے قبل کے الف کو واو سے بدلنا۔چنانچہ شاعر کہتا ہے۔

ہر کہ مدح شاہ خواند از دہون   از دہانش بوے مشک آید برون

ہماں اور ہموں اور یکساں اور یکسوں بھی اسی قبیل کے ہیں۔دوسرا قاعدہ یہ کہ نون غنہ کے قبل کے الف ممدودہ کے مدہ کو حذف کرنا اور صرف الف پڑھنا مثلاً آن کو بروزن من بمعنی آن۔اسی طرح 'اُن' بروزن کُن مخفف "کون" ہے جو "ان" سے بدل گیا اور اس کے مرکبات ہیں انجا' اُنکہ' اُنچہ۔غالب کہتے ہیں کہ میں مُند اور خُند کو صحیح کہتا ہوں۔موید برہان میں مُند بغیر الف کے اور خُند بغیر واو اور الف کے کہیں نہیں لکھا۔لہٰذا میرے اس کہنے کا مدعا یہ ہے کہ مُند اور خُند بولا جاتا ہے۔یہ مدعا نہیں کہ لکھا جاتا ہے۔اگر کہا جائے کہ دشخوار بروزن ہشیار ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ دشخوار کا واو نہ لکھا جائے۔اس طرح خواند بروزن تُند کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ خواند میں واو اور الف نہ لکھا جائے۔قدما کا قاعدہ ہے کہ جو نون الف کے بعد آئے اسے باخفا (یعنی ناک سے) پڑھا جائے اور اس نون کو نون غنہ کہتے ہیں۔مثلاً بانگ بروزن جانگ اور متاخرین کا قاعدہ ہے کہ جو الف نون ساکن کے قبل آتا ہے اس الف کو حذف کر دیتے ہیں۔لہٰذا وہ نون غنہ نہیں رہتا بلکہ نون ظاہر ہوتا ہے چنانچہ بانگ بروزن گنگ پڑھتے ہیں۔اسی طرح قدما کے لہجے میں ماند اور خواند بروزن دانت ہیں

اور متاخرین کے لہجے میں بروزن تُند ہیں۔ فوائد احمدیہ میں نوں کی بحث بالتفصیل موجود ہے۔ صایب تبریزی کہتے ہیں۔

اگر دل از علائقِ کندہ باشی | بمنزل بار خود افگندہ باشی
سواد الوجہ فی الدارین فقر | حدیثِ مصطفیٰ را خواندہ باشی
عنانِ نفس سرکش گر بگیری | بگردوں رخش ہمت راندہ باشی
نسازی گر ز نیکی دست کوتاہ | ز نام نیک دایم زندہ باشی

راضی شُشتری

چو پسر بیہودہ گرد افتد علاجش راندن است
چو ز جا جنبید دنداں چارۂ او کندن است

حکیم زلالی مثنوی "میخانہ" میں کہتے ہیں۔

اشکم از نام او غنچہ کند | روے خود سُرخ از طپانچہ کند

والہ ہروی۔ رُباعی

مرد آنکہ بزیر چرخ پُر شورش و بانگ | از ترک و ز تجرید کلہ سازی دلنگ
از کس نہ پذیرد کہ برابر سازد | منّت چہ بجز دارد طسّوج و چہ دانگ

مسیح کاشی

آتش بزباں شعلہ برمن زدہ بانگ | کز بہر چہ بسان خاکستر گنگ

قاضی عبدالودود صاحب۔ احمد نے صایبؔ، زلالیؔ، والہ ہرویؔ، مسیح کاشی وغیرہ کے کلام سے ثابت کیا ہے کہ ایرانی راند و ماند کی قسم کے لفظوں کو تُند و کُند کی قسم کے لفظوں کا قافیہ لاتے ہیں۔ غالب اور ان کے مددگار

اپنے دعوی کو ثابت نہ کر سکے۔

ل۔ ہمیں غالب کی دو باتوں پر غور کرنا ہے۔ ایک یہ کہ اگر ماند و خواند کو بروزن تُند و کُند (یعنی مُند و خُند) پڑھا جائے گا تو ماندن و خواندن کو مُندن و خُندن پڑھا جائے گا۔ دوسری بات یہ کہ لہجے کی تقلید بہرد بیوں اور بھانڈوں کا کام ہے۔

پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ الف کو نہ پڑھنے اور نون کو بالاعلان پڑھنے کا قاعدہ مصدر کے لئے نہیں ہے۔ صرف ماضی کے لئے ہے۔

لہجے سے مراد وہ لہجہ ہے جو آب و ہوا کے زیر اثر ہوتا ہے لیکن ماند و خواند کا لہجہ مند اور خند آب و ہوا کے زیر اثر نہیں ہے۔ پھر کس لئے اس لہجے کی تقلید کو بھانڈوں کی نقالی سمجھا جائے۔ ہندوستان کے فارسی گو "ایک آدمی" کو "مردے" بولتے ہیں۔ مگر ایرانی "مردی" بولتے ہیں۔ اب اگر کوئی ہندوستانی اپنے طرز میں "مردے" کی بجائے "مردی" بولے تو اس کو بھانڈوں کی نقالی سے تعبیر کیا جائے گا یا اسی کو صحیح مانا جائے گا؟ ہندوستانی "افسانہ" کو "افسانا" پڑھتے ہیں لیکن ایرانی "افسانے" پڑھتے ہیں۔ لہٰذا فارسی بولتے وقت اگر "افسانہ" کو "افسانے" بولا جائے تو یہ ہرگز بھانڈپن نہ ہوگا۔

ث۔ ذ۔ ض۔ ط۔ ظ۔ ع۔ غ۔ ق خاص عربی حروف ہیں۔ اب اگر کوئی غیر عرب عربی زبان سیکھ کر عربی بولتے یا قرآن پڑھتے وقت ان حرفوں کو صحیح مخرج سے ادا کرے تو کیا یہ بھانڈوں کی سی نقالی ہوگی؟

تجربہ کار لوگوں کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ایک خالص ایرانی

اور ایک خالص ہندوستانی یا پاکستانی فارسی داں آپس میں فارسی میں گفتگو کرتے ہیں تو وہ ایرانی اس ہندوستانی یا پاکستانی کے لہجے کی وجہ سے اس کی فارسی سمجھ نہیں پاتا۔ لیکن جو ہندوستانی یا پاکستانی ایرانی لہجے میں بولنے کی کوشش کرتا ہے ایرانی اس کی فارسی گفتگو جلد سمجھ پاتا ہے۔ لہجے کی کامیاب تقلید کمال کی بات ہے۔ اور اگر ایرانیوں کی زبان میں اعلیٰ شاعری کرنا کمال ہے تو ایرانیوں کے لہجے میں فارسی تقریر کرنا کمال کیوں نہیں ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ دوسروں کی بات کتنی ہی اچھی اور صحیح کیوں نہ ہو غالب اس کو برا اور غلط ضرور کہیں گے اور صحیح کو غلط کہنے پر اڑ جائیں گے۔

چشم عیب ساز یا چشم عیب بیں

تیغ تیز۔ مؤید برہان کے صفحہ بیس میں "چشم عیب ساز" ہے۔ صاحبو واسطے خدا کے! چشم کی صفت عیب بیں ہے یا عیب ساز۔ آنکھ کا کام عیب دیکھنا ہے یا عیب بنانا۔ جواب کا طالب غالب۔

غالب کا استفتا نمبر ۱۴ ۔ چشم کی صفت عیب بیں صحیح یا عیب ساز۔

مفتیوں کا جواب ۔ عیب ساز غلط محض اور جو آنکھ کو عیب ساز کہے احمق بلکہ اندھا ہے۔

شمشیر تیز تر ۔ مؤید برہان کے صفحہ بیس میں تحریر کے اندر جو دیدۂ عیب ساز کا لفظ آیا ہے وہ میری تحریر نہیں ہے بلکہ آغا محمد حسین تبریزی کی برہان قاطع کی عبارت ہے۔ دیباچہ برہان میں وہ فرماتے ہیں کہ "اہل انصاف سے گذارش ہے کہ جب لفظوں میں سے کسی لفظ کے معنوں میں کوئی نقص ملاحظہ فرمائیں تو زبان اعتراض کو

کام خاموشی میں رکھیں اور دیدۂ عیب ساز میں سُرمۂ پردہ پوشی لگالیں کیونکہ یہ فقیر جامع الفاظ اور ارباب لغت کا تابع ہے فرہنگ کا واضع نہیں۔

بلغا اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہاں "دیدۂ عیب ساز" کا جو مفہوم ہے وہ دیدۂ عیب بیں میں نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ دیدۂ عیب ساز وہ آنکھ ہے جو اچھی اور بے عیب چیزمیں وہ بُرائی اور عیب دیکھتی ہے جو اس میں نہیں ہے اور اس چیز کو عیب دار اور غیر معتبر بتاتی ہے۔ شیخ سعدی فرماتے ہیں۔

کسی بہ دیدۂ انکار اگر نگاہ کند نشان صورت یوسف دہد بناخوبی

یعنی اگر کوئی چشم انکار سے دیکھے تو یوسف علیہ السلام کی صورت کو بھی بدصورت بتائے گا۔ لہٰذا عیب بنانا بھی آنکھ کا کام ہوتا ہے۔ حکیم تبریزی یعنی جامع برہان کا مقصد یہ ہے کہ چونکہ برہان قاطع میں جو الفاظ و معانی ہیں وہ ان کی اپنی تحقیقات کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ دوسری لغت کی کتابوں سے ماخوذ ہیں اس لیے سوائے دیدۂ عیب ساز کے اور کسی کو الفاظ و معانی کی غلطی نظر نہ آئے گی۔ اس بنا پر جامع برہان نے کہا کہ جب کسی لفظ یا معنی میں کوئی نقص دیکھیں تو زبان اعتراض کو دہان خاموشی میں رکھیں اور دیدۂ عیب ساز میں سرمہ پردہ پوشی لگالیں اور جناب معترض (یعنی جناب غالب) نے جامع برہان کے اس التماس کو قبول نہ فرمایا۔ پس انھوں نے جو کچھ دیکھا دیدۂ عیب ساز سے دیکھا جیسا کہ بعض اعتراضوں کے جواب سے واضح ہے۔

قاضی عبدالودود صاحب۔ تمہید میں (یعنی فتوی طلب سوالوں کی تمہید میں) غالب نے اس سوال کا جواب بھی بتادیا ہے جو انھیں نہیں چاہیے تھا۔

چشم عیب ساز احمد کے الفاظ نہیں برہان کے الفاظ ہیں۔ عیب ساز میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی ۔ یہ عیب بیں کے معنی میں نہیں ۔ عیب آفریں کا مرادف ہے ۔

ل ۔ غالب صاحب کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ لکھنے والے نے چشم عیب ساز لکھا تھا یا دیدۂ غلط ساز اور یہ کس نے لکھا تھا۔ جامع برہان نے یا احمد علی نے؟ بہر حال مجھے چشم کا کام عیب بنانا غلط معلوم ہو رہا تھا۔ مگر غالب کی نگاہوں کا کرشمہ دیکھ کر ماننا پڑا کہ چشم عیب ساز سو فیصدی صحیح ہے۔ دوسروں کو تو جانے دیجئے۔ جب غالب کی چشم عیب ساز نے فیضی، بیدل، ابوالفضل اور غنی جیسے قادر الکلام فارسی شاعروں اور فارسی دانوں کو دیکھا تو ان کی فارسی کو عیب دار اور خود ان کو معیوب فارسی نویس بنا کر رکھ دیا۔ یہ آنکھ کی عیب سازی ہے کہ نہیں۔ برہان قاطع ایک مشہور اور اہل علم میں مقبول اور فارسی دانوں کی رہنما فرہنگ تھی۔ لیکن غالب کی چشم عیب ساز نے اسے اس قدر معیوب بنا دیا کہ وہ غالب کے معتقدین بالخصوص نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، مولانا الطاف حسین حالی، نواب ضیاء الدین نیر اور مولوی سعادت علی وغیرہ کی نگاہوں میں دو کوڑی کی بھی فرہنگ نہیں۔ کیا یہ غالب کی نگاہ عیب ساز کی عیب سازی نہیں۔ فرہنگ مستند ہو یا غیر مستند، ہر حال میں فرہنگ فرہنگ ہے۔ مگر غالب کی چشم عیب ساز نے کچھ ایسا عیب سازی کا کمال دکھایا کہ غالب صاحب کو غیاث اللغات "حیض کا لتہ" نظر آئی۔ لہٰذا یہ چشم عیب ساز ہے جو فرہنگ کو حیض کا لتہ بناتی ہے۔ مفتی حضرات نے غالب کے سوال کو دیکھا تھا غالب کی آنکھ کو نہیں دیکھا تھا۔

احمد علی نے موید برہان میں لکھا تھا۔ غم تباہی گفتار فارسی خورد ۔
اس فقرے میں کوئی عیب نہ تھا۔ لیکن غالب کی چشم عیب ساز نے جو اسے
بے عیب دیکھا تو اپنی عیب سازی کے ہنر سے کام لے کر اسے یوں بنا دیا "غم گفتار
فارسی زبان خورد۔ بے عیب فقرے کو عیب دار بنا کر اس پر اعتراض بھی
جڑ دیا کہ "غم گفتار فارسی زبان خورد۔ کے کیا معنی؟ غم مرتب ہوتا ہے ہلاکت
پر، فوت پر، گفتار کا غم کیا ہے؟ اور پھر گفتار بھی اور زبان بھی۔ یہاں
مولوی کی فارسی دانی اور سخن رانی کی ٹھیک نکل گئی"

جامع برہان محمد حسین کی دور رس اور دور بیں نگاہ کی داد دینی چاہیے
کہ انھوں نے دوسو سال قبل دیکھ لیا تھا کہ دوسو سال بعد ہندوستان میں
ایک ایسا شخص پیدا ہوگا جس کی چشم عیب ساز کا کام اچھے اچھوں کا عیب
نکالنا ہوگا اور جب کوئی عیب نہ پائے گی تو عیب بنائے گی اور ہنگامہ برپا
کرے گی۔ لہٰذا جب وہ برہان قاطع کو دیکھے گی تو عیب بنا بنا کر اعتراض وارد
کرے گی۔ اس وجہ سے صاحب برہان نے اس چشم عیب ساز کے رکھنے والے
سے عیب پوشی کی گذارش کی مگر گذارش قبول نہ ہوئی۔ اور ہوتی بھی کیوں؟
چشم عیب ساز جو ٹھہری۔ چشم عیب ساز کا کام عیب بنانا ہے کہ عیب چھپانا۔

آبچیں

برہان قاطع۔ آبچیں کپڑے کے اس ٹکڑے کو کہتے ہیں جس سے
مُردے کا بدن غسل کے بعد پونچھتے ہیں۔

قاطع برہان۔ مُردے کا بدن پونچھنے کی قید بیجا ہے۔ آبچیں اس کپڑے کو کہتے ہیں جس سے ہاتھ دھونے کے بعد پونچھتے ہیں اور عُرفِ عام میں رومال کہتے ہیں۔

موید برہان۔ صاحبِ فرہنگ سامانی اور خان آرزو بھی مُردے کا بدن پونچھنے کی قید نہیں مانتے۔ وہ بھی رومال لکھتے ہیں۔ لہٰذا یہ اعتراض غالب کا اپنا نہیں ہے (یعنی غالب نے سرقہ کیا ہے)۔

تیغ تیز۔ موید برہان کے صفحہ بارہ میں مولوی لکھتے ہیں کہ صاحبِ فرہنگ سامانی اور خان آرزو بھی مانع تخصیص آبچیں ہیں اور عموماً رومال کو لکھتے ہیں۔ پھر نتیجہ یہ نکالتے ہیں کہ یہ اعتراض ان دونوں شخص کا ہے اور غالب سارق ہے اس اعتراض کا۔ سبحان اللہ! مضمون کا سرقہ سُنا تھا، سرقۂ اعتراض نہ سُنا تھا۔ اتفاق رائے کا نام سرقہ رکھنا کتنی بڑی ناانصافی ہے۔ جامع برہان کی رائے کا اور فرہنگ نویسوں کی رائے سے متفق ہونا استناد اور میری رائے اور سامانی اور خان آرزو کی رائے سے اتفاق مجھ پر باعث الزام سرقہ۔

غالب کا استفتا نمبر ۵۔ فرہنگ نویس حال کی رائے اگر فرہنگ نویس ماضی کی رائے سے مطابق ہو، خواہی بحسب اتفاق خواہی از روئے مشاہدہ! یہ سرقہ ہے یا تطابق رائے؟

مفتیوں کا جواب۔ تطابق رائے ہے، سرقہ سے کیا علاقہ؟

شمشیر تیز تر۔ مشاہدہ کے بعد اگر سامانی کے اعتراض کا مضمون غالب

کے دماغ میں رہ گیا اور اول معترض کا نام لئے بغیر اس اعتراض کو وارد کرنا یا اپنا لینا بہرحال سرقہ ہے۔ برہان قاطع کے طابعوں نے ان اعتراضوں کو کتاب کے حاشیہ پر چھاپا ہے۔ اور غالب نے ان کو معترض کا نام لئے بغیر قاطع برہان، درفش کاویانی اور تیغ تیز میں لکھا ہے اور ان کو اپنا ظاہر کیا ہے بے شک یہ سرقہ ہے اور پایۂ ثبوت کو پہنچا ہوا سرقہ ہے۔

قاضی عبدالودود صاحب۔ (منقیتوں کا) جواب غلط ہے۔ اعتراض کا سرقہ ہو سکتا ہے اگر غالب نے دوسرے کا اعتراض دیکھا تھا اور انھوں نے اصلی معترض کا ذکر بھی بالارادہ نہیں کیا تو سرقے میں کیا شبہہ ہے۔ ساسانی کا بیان آجیں سے متعلق ممکن ہے غالب کی نظر سے نہ گزرا لیکن محشی برہان کے اعتراض جو انھوں نے اپنی جانب سے پیش کئے ہیں اس کا کیا جواب ہو سکتا ہے برہان میں اکیاسی حاشئے ہیں اور ان میں بیشتر غیر عربی الفاظ کے متعلق ہیں۔ لیکن غالب قاطع برہان میں محشی کے ایک اعتراض کو غلط قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "مطبع کے منتظمین نے جا بجا حاشئے لکھے ہیں لیکن سب کے سب عربی الفاظ سے متعلق ہیں" کسی مخالف نے یہ لکھا ہے کہ حواشی لغات فارسی سے متعلق بھی ہیں اور غالب کے کچھ اعتراض حواشی میں بھی ہیں۔ درفش کاویانی میں "ہمہ" کو "اکثر" بنا دیا۔ ان کا قول ترمیم کے بعد بھی غلط رہا ہے۔ قاطع برہان کے متعدد اعتراضات حواشی برہان سے ماخوذ تھے اور اس کا اعتراف غالب نہیں کیا تھا بلکہ یہ لکھ کر کہ حواشی کا تعلق صرف لغات عربی سے ہے کنایتہً اس سے انکار بھی کیا تھا کہ لغات فارسی پر ان کے جو اعتراض ہیں وہ حواشی سے

لئے گئے ہیں۔ درفش کاویانی میں غالب نے دوسری روش اختیار کی ہے۔
جا بجا فخریہ اس کا ذکر کرتے ہیں کہ سات فضلائے کلکتہ جو برہان کے محشی ہیں میرے
ہمنوا ہیں۔ غالب کو اس کی بھی خبر نہیں کہ یہ حواشی رو بک کے لکھے ہوئے ہیں۔
اور مصححین مطبع طبی جن میں حکیم عبدالمجید کے سوا کسی کے عالم ہونے کا ثبوت
موجود نہیں ان سے سروکار نہیں رکھتے (تفاصیل محقق)

ل۔ غالب کے اُردو اور فارسی کلام میں مضامین کا توارد اس حد تک
پایا گیا ہے کہ غالب پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ فارسی شعرا اور میر تقی میر کے کلام
سے مضامین کا سرقہ کرتے تھے۔ غالب نے اس الزام کا جواب یہ دیا کہ فارسی شعرا
کے مضامین میں نے نہیں چُرائے بلکہ فارسی شعرا نے میرے ہی مضامین نہاں خانۂ
ازل سے چرائے تھے۔ اس طرح غالب نے بطرز دیگر سرقے کا الزام مان لیا اور
ان کا یہ کہنا کہ فضلائے کلکتہ جو برہان کے محشی ہیں میرے ہمنوا ہیں گویا بطرز دیگر
انھوں نے تسلیم کر لیا کہ انھوں نے ان محشیوں کی نوائیں اڑالی ہیں۔ کیونکہ غالب نے
ان کے حواشی دیکھے تھے، انھوں نے غالب کی قاطع برہان نہیں دیکھی تھی۔

اب یہ سوال کہ ایک فرہنگ نویس کی رائے کے دوسرے فرہنگ نویس کی
رائے سے مطابق ہونے کا مطلب تطابق رائے ہے تو غالب سرے سے فرہنگ نویس ہی
نہیں ہیں اور ان کی قاطع برہان چند اعتراضات کا مجموعہ ہے نہ کہ فرہنگ۔

شش ضرب نتیجہ، خوب

برہان قاطع۔ شش ضرب نتیجہ، خوب کنایہ ہے گوہر و زرے اور مشک،

شکر، عسل اور مختلف قسم کے میووں سے بھی۔ ششش نتیجہ، خوب بھی لکھا نظر آیا ہے۔

قاطع برہان۔ یہ جملہ، مرکب یعنی ششش ضرب نتیجہ، خوب لفظ ہے یا مصطلح۔ بہرحال جو معنے بتائے گئے ہیں۔ وہ معنے کیونکر سمجھے جا سکتے ہیں۔ خواجہ بجران الدین (یعنی برہان) گوہر، زر، مشک، شکر، عسل اور قسم قسم کے میوے بتاتا ہے۔ ان لغات اور مصطلحات کو پڑھنے اور یاد رکھنے کا مطلب یہ تھا کہ تحریر میں کام آئے اور ناظرین اس تحریر کو دیکھ کر لکھنے والے کے دل کی بات معلوم کرلیں۔ چنانچہ ایک آدمی نے اپنے دوست کو لکھا کہ ششش ضرب نتیجہ، خوب مجھے بھیج دو۔ پڑھنے والا سمجھ نہ پایا کہ اس کا دوست کیا چاہتا ہے۔ اس نے ایک ایک سے اس کا مطلب پوچھا۔ سب نے جواب دیا کہ ہمیں معلوم نہیں۔ چنانچہ الفاظ کے سفینے میں اس کا پتہ نہ ملا۔ البتہ برہان قاطع میں اس کا پتہ ملا۔ اب وہ سوچنے لگا کہ مانگنے والے کو کیا بھیجوں۔ گوہر یا زر یا مشک یا شکر یا عسل یا ایک ٹوکری مختلف قسم کے پھل۔ اُمید کہ برہان کے ماننے والے دوسری فرہنگوں اور شعرا کے کلام سے مجھے سمجھا دیں گے کہ اس کا مطلب کیا لوں اور اگر نہ بتا سکیں تو آقا بجران الدین (یعنی جامع برہان محمد حسین) کے حمق کے اظہار میں میرے ہمزباں بنیں۔

غالب کا استفتا نمبر ۶ ”ششش ضرب نتیجہ، خوب“ شکر، عسل، گوہر، زر، مشک اور اقسام میوہ کو کہہ سکتے ہیں یا نہیں؟

مُفتیوں کا جواب۔ معاذ اللہ، لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ کون کہہ سکتا

ہے۔ مگر دیوانہ کہے۔ یعنی ان چھ چیزوں کو ششش ضرب نتیجہ/خوب نہ لکھیں گے اور کوئی چھ باتوں کو لکھیں تو لکھیں۔

انتباہ۔ یہ اعتراض قاطع برہان کی پہلی اشاعت میں شامل نہ تھا۔ دوسری اشاعت یعنی درفش کاویانی میں شامل کیا گیا اور موید برہان لکھتے وقت احمد علی کے پیش نظر صرف قاطع برہان تھی کیونکہ درفش کاویانی اس وقت وجود میں نہیں آئی تھی۔ لہٰذا بہ لفظ غالب اور احمد علی میں ما بہ النزاع نہ تھا۔ چنانچہ احمد علی نے اس کا جواب حسب عادت بالتفصیل دینا ضروری نہ سمجھا۔ لیکن غالب کے اس کہنے پر کہ "دوسری فرہنگوں سے مجھے سمجھا دیں کہ اس کا مطلب کیا لوں" احمد علی نے شمشیر تیز تر میں لکھا ہے کہ "ان دو کتابوں کی حقیقت موید الفضلا اور مدار الافاضل سے معلوم ہو سکتی ہے۔"

قاضی عبدالودود صاحب۔ یہ اعتراض پہلی بار درفش کاویانی میں کیا گیا ہے۔ احمد اور غالب میں ما بہ النزاع نہیں۔ جامع برہان نے دوسری فرہنگوں سے لیا ہے اور ششش ضرب نتیجہ/خوب یا ششش نتیجہ/خوب فرہنگوں میں ظاہرا انوری کے ان دو شعروں کی وجہ سے شامل کیا گیا ہے۔

زبہر جشن تو دایم بہ ششش نتیجہ/خوب ... ز فر بخش تو آبستن است ششش مسکن
صدف بہ گوہر و نافہ بہ مشک و نے بہ شکر ... شجر بہ میوہ و خارا بزر زاد و خار بہ من

ل۔ غالب صاحب نے جامع برہان کے بتائے ہوئے معنی کا مذاق اڑانے کی نیت سے ایک شخص کی حیرانی و پریشانی کا (ملا عبدالصمد جیسا گڑھا ہوا افسانہ) سنایا اور اس کے بعد فرمایا کہ جامع برہان کے معتقدین یا تو

مجھے سمجھا دیں کہ وہ شخص اپنے دوست کو ان چیزوں میں سے کون سی چیز بھیجے یا پھر میرے ساتھ جامع برہان کی حماقت سرائی کریں۔

پہلی بات تو یہ کہ جامع برہان نے ششش ضرب نتیجۂ خوب کے لفظی معنی نہیں بتائے ہیں بلکہ صاف صاف لکھا ہے کہ مذکورہ چیزوں سے کنایہ ہے۔ غالب کا یہ پوچھنا کہ ان چیزوں میں کون سی چیز گوہر یا زر یا مشک یا شکر یا عسل یا پھل تعجب خیز ہے۔ غالب نے لفظ "اور" کو لفظ "یا" سے بدل دیا۔ علاوہ اس کے ششش کا لفظ موجود ہے۔ ان سب چیزوں کو مجموعی طور پر ششش نتیجۂ خوب کہا گیا ہے۔ لہٰذا "یہ" اور "وہ" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چھوں کے چھوں سمجھنا چاہئے۔ لیکن اگر کسی نے نہ سمجھنے کی قسم کھا رکھی ہو تو علاج کیا؟

غالب نے یہ بھی لکھا ہے کہ سوائے برہان قاطع کے اور کسی فرہنگ میں یہ لفظ نہیں ہے۔ احمد علی نے جواب دیا کہ ششش ضرب نتیجۂ خوب کی حقیقت موید الفضلا اور مدار الافاضل سے معلوم ہو سکتی ہے۔ خود جامع برہان نے کہا ہے کہ میں ارباب لغات کا تابع ہوں واضع نہیں۔ لہٰذا انھوں نے یہ لفظ دوسری فرہنگوں ہی سے لیا ہے۔ اس لئے غالب کا یہ کہنا کہ کسی اور فرہنگ میں نہیں ہے بے پر کی اڑانا ہے۔

قاضی عبدالودود صاحب لکھتے ہیں کہ ششش ضرب نتیجۂ خوب یا ششش نتیجۂ خوب انوری کے منقولہ دو شعروں کی وجہ سے شامل کیا گیا ہے۔ لیکن انوری کے شعروں میں بحذف "ضرب" ہے اور برہان میں بحذف و باضافۂ "ضرب" دونوں طرح ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ اور بھی کہیں استعمال ہوا ہے۔

غالب نے جامع برہان کا مذاق تو اُڑایا اور انھیں احمق کہنے کی دعوت بھی دی اور ان کے مفتیوں نے انھیں دیوانہ بتایا مگر خود غالب یا ان کے مفتی اس کے معنی نہ بتا سکے۔ مفتی بیچارے تو معنی اسی وقت بتا سکتے تھے جب غالب انھیں بتا دیتے۔ مگر غالب تو خود ہی اس لفظ سے آشنا نہ تھے۔ مفتی بیچارے نے عزت بچانے کے لئے لکھ دیا کہ "کچھ اور چیزوں کو لکھیں گے" مطلب یہ ہوا کہ برہان نے جو معنی بتائے ہیں انھیں چھوڑ کر جو بھی معنی بتائے جائیں گے ہم مان لینے کو تیار ہیں مگر برہان کی بات ماننے کو تیار نہیں۔

جس چیز کا علم بدیہی طور پر نہ ہو اس پر بحث کرنا اپنا ہی بھرم کھلوانا ہے

چشم مخالفاں بیاژن بہ تیر

انتباہ۔ "آژدن" کی بحث میں موید برہان میں احمد علی نے یہ مصرعہ نقل کیا تھا۔

تیغ تیز۔ اس فصل میں یہ مصرع اُستاد کا جو حضرت نے لکھا ہے اس کا وزن آپ سے پوچھتا ہوں جس طرح حکم ہو اسی طرح پڑھوں۔ جانتا ہوں کاپی نگار کی شامت آئے گی اور غلطی اس سے منسوب ہو جائے گی۔ لیکن مجھے مدرس صاحب سے استفادہ منظور ہے۔ مصرع یہ ہے اور مدرس صاحب اس کو استاد فرخی علیہ الرحمۃ کا بتاتے ہیں۔ ع

چشم مخالفاں بیاژن بہ تیر

غالب کا استفتا نمبر ۲۔ یہ مصرع وزن شعر میں درست ہے یا

ناموزوں؟

مُفتیوں کا جواب ـ مصرعہ ہو تو کچھ لکھوں۔ فقرہ ہے۔ اس کا وزن سے کیا علاقہ؟

شمشیر تیز تر ـ وزن مصرع اُستاد۔ مفتعلن مفاعلن فاعلان۔ اس وزن میں تقطیع فرمایئے اور پڑھئے۔ یہاں کاپی نگار کی شامت نہیں ہے بلکہ اس مصرع کی شامت ہے کہ ناموزونی سے متہم کیا گیا۔ موید برہان میں یہ مصرع لفظ ”آژدن“ کی سند میں نوادر المصادر سے نقل کیا گیا ہے۔ موید برہان سے اس کو منسوب کرنے کا کیا مطلب۔ آخر دہلی میں نوادر المصادر کا نسخہ موجود ہوگا۔ اگر یقین نہ ہو تو بسم اللہ نوادر المصادر ملاحظہ فرمائیں اُستاد فرخی کا یہ مصرع دوسرے مصرع کے ساتھ موجود ہے اسی طرح چھپا ہے۔ شعر

چشم مخالفاں بیا زن بہ تیر   ہمچو کفِ دلی بزر آز دن

مفتعلن مفاعلن فاعلان   مفتعلن مفاعلن فاعلن

بحر سریع ہے۔ اصل ہے مستفعلن مستفعلن مفعولات۔ دوبار۔ اس شعر کا عروض مسطوی موقوف و ضرب مطول مکشوف ہے اور حشو مخبون و صدر و ابتدا مسطوی تقطیع ہے۔

چشم مخا مفتعلن لفا بیا مفاعلن زن بہ تیر فاعلان

ہمچو کفے مفتعلن دل بزر مفاعلن آزدن فاعلن

اس کی مزاحف بحریں ملاحظہ ہوں

بحر سریع مسطوی موقوف

دل چہ کند سیر و تماشائے باغ   تا بتوام از ہمہ دارم فراغ

مفتعلن مفتعلن فاعلان دو بار

مسطوی مکسوف

رُخ بنما اے قمرِ خانگی   تا نہ کشد عقل بدیوانگی

مفتعلن مفتعلن فاعلن دو بار

مقطوع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم   ہست کلید درِ گنجِ حکیم

مفعولن مفعولن فاعلات   مفتعلن مفتعلن فاعلان

اسلم

گر بکشی در نکشی مارا   نیست غم ار سر نکشی یارا

مفتعلن مفتعلن فعلن دو بار

بحر سریع مجنون مسطوی مکسوف

نگارِ من بکارِ من درنگر   ز جرمِ بے شمارِ من درگذر

مفاعلن مفاعلن فاعلن دو بار

مجنون مسطوی مکسوف یعنی عروض ضرب

از عشق تو من در جہاں سمرم   خوں شد ازیں دردِ نہاں جگرم

مستفعلن مستفعلن فعلن دو بار

اُستاد کے اس شعر پر اعتراض کرنے سے معلوم ہوا کہ جناب غالب عروض کا علم جو فن شاعری کے لوازمات میں سے ہے بدرجہ اتم رکھتے ہیں۔

نوٹ۔ احمد علی نے اس بحر پر بڑی طویل بحث کی ہے۔ میں نے بہت مختصر کر دیا تاکہ طبیعت نہ اُکتا جائے۔

قاضی عبدالودود صاحب۔ غالب نے اعتراض سے پہلے نوادر المصادر کو جو ایک مطبوعہ کتاب تھی دیکھ لینا ضروری تصور نہ کیا۔ غالب اگر عروض فارسی سے واقف ہوتے اور انھوں نے شعراے ایران کے کلام کا ایک عروضی کے نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا ہوتا تو اس مصرع کو ناموزوں نہ کہتے (قاضی صاحب کی طویل بحث کا مختص)

ل۔ احمد علی نے جس تفصیل اور دلائل کے ساتھ بحث کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ کاپی نگار کی شامت آئی تھی اور نہ اس شعر کی۔ بلکہ خود غالب اور ان کے مفتی صاحبان کی شامت آئی تھی کہ اعتراض کر بیٹھے۔ مستفتی اور مفتی دونوں کی جہالت کھُل گئی۔ خیر غالب صاحب مدرس صاحب سے کچھ استفادہ کرنا چاہتے تھے اور مدرّس صاحب نے اس انداز سے درس دیا جیسے ایک مدرس ایک طالب علم کو درس دیتا ہے۔ لہٰذا غالب کا یہ کہنا کہ" مدرس کا عہدہ ہاتھ آنا حسب اتفاق ہے نہ از روے استحاق" غلط ثابت ہوا۔

آہنگ

قاطع برہان۔ (جامع برہان قاطع نے) آہنگ کے معانی بتانے کے بعد جو اکثر بے سند لکھے ہیں اسے کشیدن کا ماضی قرار دیا ہے اور برعایت توضیح اس نے "یعنی کشید" کے لفظ کا اضافہ کیا ہے۔ پھر لفظ آہنگ کی تشریح کے بعد اخیر فصل میں

آہنگیدن کا لفظ لکھا ہے اور کہا کہ یہ آہنگ کا مصدر ہے جس کے معنی کشیدن کے ہیں۔ ماضی بنانے کا قاعدہ تو یہ ہے کہ مصدر کے آخر کا "ن" حذف کر دیتے ہیں اور جامع برہان خود کہتا ہے کہ آہنگیدن مصدر ہے۔ تو پھر ہر حال میں ماضی آہنگید ہو گا نہ کہ آہنگ۔

موید برہان۔ برہان قاطع میں آہنگ کے سب معنی فرہنگ جہانگیری سے نقل کئے گئے ہیں اور فرہنگ جہانگیری میں سب معنی سند کے ساتھ لکھے ہیں۔ آہنگ کے آٹھ معنی ہیں۔

(۱) موزونی آواز و ساز سیف افزنگی۔ شعر

ہر شبے زاویۂ مدح گہر بار تو باد　　روشن از شمع رخِ مطربِ ناہید آہنگ

(۲) قصد۔ شیخ سعدی کہتے ہیں۔

چو آہنگ رفتن کند جان پاک　　چہ بر تخت مُردن چہ بر روے خاک

(۳) طاق، ایوان اور اسی قسم کی چیزوں کی خمیدگی۔ رفیع الدین لبنانی

جلالت را بفلک بر بصدر بہ نشیند　　شکستہ گردد طاق سپہر را آہنگ

(۴) چبوترہ، حوض اور اس قسم کی چیزوں کے "کنارا" کو کہتے ہیں شعر

ز بینوائی جامے رسیدہ ام کہ مرا　　مسافتیست ز آہنگ صفہ تا پردہ

(۵) طراز روش و صفت۔ حکاک کہتا ہے۔

چہ بہ گردم بتو اے شوخ بد مہر　　کہ محزونم بدیں آہنگ داری

(۶) صف مردم و جانوراں۔ حکیم ازرقی کہتا ہے۔

زمیں پیکر از یک دیگر بگسلاند　　بروزے بنودے تو آہنگ لشکر

(۷) کشندہ اور آہنگیدن کے معنی کشیدن

(۸) طویلہ اور آختہ خانہ کو کہتے ہیں

کشیدن کا ماضی آہنگ یعنی کشید اگر جامع برہان نے لکھا ہے تو بے شک غلطی کی ہے۔ انھوں نے "کشندہ" کو جو فرہنگ جہانگیری میں ساتویں معنی میں لکھا ہے کشیدہ بایلے تحتانی پڑھا اور بھٹک گئے۔ فرہنگ جہانگیری کے مطابق صیغۂ امر جیساکہ آہنگ ہے حسب موقعہ اسم مصدری اور اسم فاعل اور اسم مفعول کے معنی دیتا ہے نہ کہ ماضی کے معنی۔ راستہ اور صف معنی غلط ہیں اور طویلہ معنی بھی محل تامل ہے۔

تیغ تیز۔ مولوی جہانگیر نگری نے موید برہان کے ۸۳ اور ۸۴ صفحے کو سیاہی سے لیپ دیا ہے۔ بارہ معنی آہنگ کے لکھے ہیں اور ہر معنی کی سند ایک شعر۔ اس سے معلوم ہوا کہ مولوی نے سب فرہنگوں کو دیکھ کر دس بارہ شعر نقل کئے ہیں۔ یہ تو سب کچھ ہوا لیکن میرے اس فقرے کا جواب کہاں ہے کہ بہرصورت ماضی آہنگید ہوگا نہ کہ آہنگ۔

غالب کا استفتا نمبر ۸۔ آہنگیدن کا صیغۂ ماضی آہنگید ہوگا یا فقط آہنگ۔

مُفتیوں کا جواب۔ آہنگید ہوسکتا ہے، نہ آہنگ۔

شمشیر تیز تر۔ موید برہان میں جواب موجود ہے۔ لکھا ہے کہ ماضیٔ کشیدن یعنی کشید اگر جامع برہان نے لکھا ہے تو بے شک غلطی کی ہے۔ انھوں نے کشندہ کو بیاے تحتانی پڑھا اور بھٹک گئے۔ آہنگ صیغۂ امر ہے

اور امر حسب موقع مصدری، اسم فاعل اور اسم مفعول کا فائدہ دیتا ہے نہ کہ ماضی ہوتا ہے۔ پس غالب کا یہ کہنا کہ "میرے سوال کا جواب کہاں؟ کیا معنی رکھتا ہے"۔

قاضی عبدالودود صاحب۔ سوال فضول ہے۔ کوئی شخص آہنگ کو ماضی نہیں کہہ سکتا۔ برہان میں یا تو سہو جامع ہے یا غلطی کاتب۔ احمد نے اس کا اعتراف کر لیا ہے اور یہ معاملہ فریقین میں مابہ النزاع نہیں۔

ل۔ لفظ آہنگ کے سلسلے میں غالب نے برہان پر دو اعتراض وارد کیے تھے ایک یہ کہ آہنگ کے اکثر معنی بے سند لکھے ہیں۔ دوسرا یہ کہ آہنگ ماضی کیونکر ہوا جبکہ جامع برہان خود کہتا ہے کہ آہنگ کا مصدر آہنگیدن ہے۔ ماضی تو ہر حال میں آہنگید ہونا چاہیے نہ کہ آہنگ۔

اوّل اعتراض کے جواب میں احمد علی نے ہر معنی کی سند میں شعرائے عجم کے اشعار پیش کئے ہیں۔ مگر غالب بھی عجیب انسان واقع ہوئے تھے۔ سند نہ دو تو اعتراض کرتے ہیں کہ سند نہیں دی اور سند دینے پر مذاق اڑاتے ہیں کہ "مثال اس کی یہ کہ ایک گندھی عطر فروش محفل میں آیا اور تنکوں پر روئی لپیٹ کر ہر ایک تنکے کی روئی کو ایک شیشی میں بھگویا اور اہل محفل کو سنگھایا۔ یہ گلاب کا ہے اور یہ سہاگ کا ہے اور یہ موتیا کا ہے۔ اسی طرح مولوی کہتا ہے کہ یہ شعر فلاں کا ہے اور یہ شعر فلاں کا ہے (تیغ تیز)

دوسرے اعتراض کے سلسلے میں احمد علی نے یہ کہہ کر غالب کے اعتراض کو مان لیا کہ جامع برہان نے غلطی کی ہے اور وہ فرہنگ جہانگیری کے ساتویں معنی کشندہ کو کشیدہ بایائے تحتانی پڑھ گئے اور بہک گئے۔ جامع برہان کی غلطی مان

لینے کے باوجود غالب پوچھتے ہیں میرے سوال کا جواب کہاں ؟ غالب کے غلط اعتراض کو غلط کہو تو جھگڑا اور صحیح اعتراض کو صحیح کہو تو جھگڑا۔ اعتراض کو صحیح مان لینے پر سوال اور استفتا کی ضرورت کیا تھی۔

مگر جامع برہان کا آہنگ کو ماضی بتانا اور وہ بھی کشیدن کا اور پھر آہنگ کا مصدر آہنگیدن بتانا عجیب یادہ گوئی ہے۔ ان کی فارسی دانی کی صلاحیت جیسی بھی ہو مگر سمجھنے کی صلاحیت تو بہت کم تھی۔ اگر احمد علی کا یہ کہنا کہ جامع برہان نے کشندہ کو کشیدہ با یائے تحتانی پڑھ لیا اور بہک گئے۔ صحیح ہے تو جامع برہان نے بڑی جہالت کا ثبوت دیا۔ وہ صرف ناقل ہی نہ تھے بلکہ کم سمجھ ناقل تھے۔

پالوایہ

برہان قاطع۔ پالوایہ بروزن چارخایہ پرستوک باشد۔

قاطع برہان۔ مگر بروزن چارپایہ نہیں ہوسکتا تھا۔ آخر بیچارہ کرتا بھی کیا۔ صرف نقل تو مارنی تھی۔ اور ہاں ایک فرہنگ میں پالون اور پالوانہ دونوں لکھا ہے اور معنی ایک کالے رنگ کی چڑیا بتائے ہیں جو غیر پرستوک ہے۔

موید برہان۔ لفظ "پالوایہ" کی تشریح کے بعد ہی نون سے بھی لکھا ہے یعنی پالوانہ بروزن کارخانہ ایک کالی چھوٹی چڑیا ہے جو ہمیشہ ہوا میں اڑتی رہتی ہے اور جب بیٹھ جاتی ہے تو اُٹھ نہیں سکتی۔ اس کو بادخورک بھی کہتے ہیں اور جانہ وزمانہ کے قافیہ میں بھی لایا گیا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کرابابیل ہے۔ شرفنامہ میں پالوایہ بالام موقوف لکھا ہے اور معنی ایک چھوٹی چڑیا بتائے

ہیں جس کو پرستو، فراشتک اور خرشتو بھی کہتے ہیں عربی میں خطّاف کہتے ہیں۔ مجمع الفرائس میں پالوانہ بروزن شادمانہ لکھا ہے۔ اُس کے معنی بتائے ہیں ایک چھوٹی چڑیا جو ہمیشہ ہوا میں رہتی ہے اور جب بیٹھتی ہے تو اُٹھ نہیں سکتی۔ کہتے ہیں کہ اُس کی غذا ہوا ہے۔ اس کی مثال شمس فخری کے یہاں ملے گی۔ شعر

شہنشاہا تو عنقائی کہ برتست   حسودِ درگہِ تو پالوانہ

"تحفہ" میں پالوایہ بیائے حطی لکھا ہے اور کہا ہے کہ پیلوایہ بھی کہتے ہیں۔ لیکن شمس فخری نے اسے زمانہ اور پیمانہ کا قافیہ کیا ہے۔ خان آرزو کے رسالے میں پالوایہ اور پالوانہ دونوں ہیں۔ خان آرزو نے فرہنگ قوسی اور دوسری فرہنگوں کے حوالے سے پالوانہ بروزن کاشانہ ابابیل کے معنی میں لکھا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ بیائے عربی تصحیف ہے اور بمعنی ابابیل صحیح ہے پالوایہ بایائے تحتانی صحیح اور بنون مشکوک ہے۔

تیغ تیز۔ (مولوی) صفحہ ۱۷۱ میں پالوانہ اور پالوایہ کے باب میں بہت کچھ بکے مگر وہ جو دکنی نے لکھا ہے کہ پالوایہ بروزن چارخایہ پرستوک باشد" اور فقیر غالب نے اس کے جواب میں لکھا ہے کہ "کیا بروزن چارپایہ نہیں ہو سکتا تھا کہ بروزن چار خایہ لکھا" اس کا کیا جواب ؟ اگر مولوی جی منصف ہوتے تو یہاں اتنا لکھ دیتے کہ یہ صاحب برہان کا حمق ہے۔

غالب کا استفتا نمبر ۹۔ پالوایہ ایک لغت ہے۔ فرہنگ نویس کو اس کا ہموزن چارپایہ لکھنا چاہئے یا چارخایہ۔

مفتیوں کا جواب ۔ وزن دونوں صحیح ہیں۔ لیکن چارپایہ لکھنے والا آدمی ہے اور چارخایہ لکھنے والا چارپایہ

انتباہ۔ احمد علی نے خاموشی اختیار کی۔

قاضی عبدالودود صاحب ۔ بے شک غالب کا اعتراض صحیح ہے۔ احمد نے اس کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے۔ مگر غالب خود فحش گوئی سے محترز نہیں ہے۔

ل ۔ غالب کے دو اعتراض تھے اول یہ کہ بروزن چارپایہ لکھنا چاہئے نہ کہ بروزن چارخایہ۔ دوسرا یہ کہ ایک فرہنگ میں پالوان اور پالوانہ بھی لکھا ہے جو ایک چڑیا ہے غیر پرستوک۔

اول اعتراض کو فن لغت سے کوئی خاص تعلق نہیں اور چونکہ چارپایہ اور چارخایہ جیسا کہ غالب کے مفتی یادریدہ غالب کے جواب سے واضح ہے کہ دونوں وزن صحیح ہیں اس لئے احمد علی نے اس کا جواب دینا یا اس سے بحث کرنا ضروری نہ سمجھا۔ حقیقتاً یہ اعتراض کوئی اہم اعتراض نہیں ہے۔ لیکن صحیح اعتراض ہے۔ کیونکہ فرہنگ فقط وسیع العلم اور منتہی لوگوں کے لئے نہیں لکھی جاتی بلکہ کم علم اور مبتدی لوگوں کے لئے بھی لکھی جاتی ہے اس لئے ہموزن لفظ مشہور اور کثیرالاستعمال لفظ ہونا چاہئے۔ اس لحاظ سے چارپایہ اتنا مشہور اور کثیرالاستعمال لفظ ہے کہ سو فیصدی لوگ اس کا تلفظ جانتے ہیں۔ مگر چارخایہ کا تلفظ نوّے فیصدی لوگ نہیں جانتے۔ لہٰذا چارخایہ کو چارُخایہ، چارِخایہ اور چارَخایہ بھی پڑھ سکتے ہیں۔ اس لئے پالوایہ بروزن چارپایہ لکھنا بہت بہتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ احمد علی اس اعتراض پر چپ رہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ انھوں نے اس اعتراض کو صحیح مان لیا۔ اس پر بھی غالب کہتے

ہیں کہ "اگر مولوی جی منصف ہوتے تو اتنا لکھ دیتے کہ یہ جامع برہان کا حمق ہے۔"
یہ مطالبہ تو عجیب مطالبہ ہے کہ صرف غلطی نہ مانو بلکہ جامع برہان کو گالی بھی دو۔

پالوایہ، پالوان اور پالوانہ کے متعلق احمد علی کی بحثیں پڑھنے کے بعد غالب نے اس جھگڑے میں پڑنا مناسب نہ جانا کہ پالوایہ پرستوک ہے یا غیر پرستوک۔ لیکن ہار نہ ماننے کی غرض سے سارا زور ہموزن لفظ پر دیا اور استفتا کیا۔

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ بروزن چارخایہ وہ کہے گا جو چارپایہ ہوگا۔ مگر اس شعر کے مطابق

کند ہمجنس با ہمجنس پرواز   کبوتر با کبوتر باز با باز

یعنی چارپائے ہی کو چارپایہ سوجھے گا۔

گرازاں

تیغ تیز۔ جامع برہان "گرازاں" کو جو بکاف فارسی مضموم ہے بکاف عربی مکسور بروزن صفاہاں (یعنی کرازاں) لکھتا ہے۔ ہنسی آتی ہے کہ یہ لکھ کر لکھتا ہے "درجہانگیری بکاف فارسی مضموم آیا ہے۔" واہ جی واہ! اپنے مطاع کے خلاف! ان خرافات کا جواب فقیر غالب نے درفش کاویانی کے صفحہ سو میں جُدا جُدا لکھا ہے۔

غالب کا استفتا نمبر ۱۔ گرازاں بمعنی خراماں بکاف فارسی مضموم ہے یا کرازاں بکاف عربی مکسور بروزن صفاہاں؟

مفتیوں کا جواب۔ گرازاں بمعنی خراماں بکاف فارسی مضموم صحیح اور

بکاف عربی مکسور غلط محض۔

شمشیر تیز تر۔ گراز اں بکاف فارسی بروزن خراساں ہے۔ موید الفضلا میں بکاف عربی بہ وزن خراساں بھی آیا ہے۔

قاضی عبدالودود صاحب۔ یہ اعتراض پہلی بار درفش کاویانی میں ہوا اور فریقین میں مابہ النزاع نہیں۔ اعتراض صحیح ہے۔

ل۔ یہ اعتراض قاطع برہان میں نہیں ہے۔ اس لئے احمد علی نے اس پر کوئی خاص توجہ نہ دی۔ لیکن جب شمشیر تیز تر میں اس پر قلم اُٹھایا تو یوں اُچٹتا سا جواب دینے کی بجائے محققانہ دو ٹوک جواب دینا چاہیے تھا۔ ورنہ جب اس سوال سے ان کا کوئی تعلق ہی نہ تھا تو بالکل خاموش رہتے۔ یہ مذبذب جواب کیا۔

کروہ و فرسخ و فرسنگ

تیغ تیز۔ جامع برہان لکھتا ہے کہ کروہ بضم اول وثانی بواو مجہول رسیدہ و بہاز دہ ثلث وسہ یک فرسخ را گویند و آں نہ ہزار گز ست و آں را بعربی کراع خوانند۔ اب اس مقام میں مولوی احمد علی سے فقیر کا سوال ہے کہ لغت میں اور کتب طبی میں پاچہ گاؤ و گوسفند کو کراع بروزن صراح کہتے ہیں۔ جمع اس کی اکارع۔ آپ کیا فرماتے ہیں؟ یقین ہے کہ یہاں بھی مولوی جی دکنی کے قول کی تصدیق کریں۔ کتب لغت و کتب طب میں نہ پایا جائے نہ سہی، لغات والے بے خبر، اطبا احمق، شاید جس تبریز میں جامع برہان پیدا ہوا ہے اس تبریز میں یوں ہی کہتے ہوں گے۔

غالب کا استفتا نمبر ۱۱۔ کروہ و فرسخ و فرسنگ فارسی میں معدار

مسافت زمین کو کہتے ہیں۔ عربی میں کراع، بروزن صراح مقدار مسافت زمین کو کہتے ہیں یا پاچہ، گاؤ و گوسپند کو؟

مفتیوں کا جواب ۔ صراح میں بمعنی پاچہ، گاو و گوسپند لکھا ہے۔ بمعنی مسافت غلط محض۔

شمشیر تیز تر ۔ اس لفظ (یعنی کراع) پر اعتراض درفش کاویانی اور تیغ تیز دونوں میں کیا ہے یہ اعتراض اہل مطبع کی طرف سے مطبوعہ برہان قاطع کے حاشیہ پر موجود ہے۔ پس غالب نے وہاں سے سرقہ نہیں کیا تو کیا۔

قاضی عبدالودود صاحب ۔ یہ اعتراض پہلی بار درفش کاویانی میں ہوا اور فریقین میں مابہ النزاع نہیں۔ یہ اعتراض حاشیہ، برہان پر موجود ہے۔

ل ۔ اگر اعتراض مسروقہ ہے تو کوئی بات نہیں۔ غالب سرقہ، اعتراض کو تطابق رائے اور سرقہ، مضمون کو توارد کہتے ہیں اور جس طرح غالب کے پیشرو ایرانی شاعروں نے نہانخانہ، ازل سے غالب کے مضامین چرا لئے ہیں اسی طرح ان کے پیشرو معترضین نے نہانخانہ، ازل سے ان کے اعتراض بھی چرا لئے ہوں گے۔

گلہری

قاطع برہان ۔ یہ جانور چوہے کی شکل کا ہے اور دیوار دیوار کودتا پھرتا ہے۔ اس کا نام گلہری بکاف فارسی مکسور ہے اور یہ فارس میں نہیں ہوتی۔ فارسی میں اس کا کوئی خاص نام نہیں ہے۔ دکنی پر ناز کرتا ہوں کہ وہ اسے بکاف عربی مفتوح الفاظ فارسی کے تحت لکھتا ہے اور ہموزن ابہری بتاتا ہے۔ ہندوستان

میں اس کو گلہری بکاف فارسی مکسور کہتے ہیں نہ بکاف عربی مفتوح - یہ وہی مثل ہے کہ فالودہ دیکھا نہ انار۔"

مؤید برہان - برہان میں گلہری بفتح اول وثانی ہے - خان آرزو بوزن ابہری کہتے ہیں - برہان میں لکھا ہے کہ یہ دوڑنے والا چوہا ہے اور ہندوستان میں بہت ہے اور بکاف فارسی بھی بولتے ہیں - مؤلف کا کہنا ہے کہ یہ لفظ ہندی الاصل ہے - اول پر کسرہ اور دوم پر فتح اور کاف فارسی ہے - اسے فارسی میں موش خرما، موش پرندہ اور موش پراں کہتے ہیں - اسے فارسی لفظ سمجھنا، بکاف عربی بولنا اور اس طرح اعراب لگانا حد درجہ غیر محققانہ بات ہے - لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ یہ لفظ ہندی الاصل ہے مگر متاخرین شعرائے فارسی نے اس لفظ کو اپنے کلام میں استعمال کیا ہے اور فارسیوں کا اس ہندی لفظ کی املا غلط لکھنا زبان سے ناآشنائی کی بنا پر ہے - یحییٰ کاشانی نے گلہری اپنی بیت میں استعمال کیا ہے - ہوسکتا ہے کہ یہ لفظ فارسی میں ہو - یا پھر انھوں نے ہندی لفظ استعمال کیا ہے بیت

ہرچہ افتد بدست آں طرار   بدو دستش خورد گلہری دار

تیغ تیز - گلہری بوزن اکہری کو بوزن ابتری لکھا ہے اور پھر بجائے کاف فارسی کاف عربی -

غالب کا استفتا نمبر ۱۲ - گلہری بکاف فارسی مکسور بر وزن اکہری صحیح یا کلہری بکاف عربی مفتوح بر وزن ابتری ؟

مفتیوں کا جواب - گلہری بکاف فارسی مکسور صحیح -

انتباہ - چونکہ احمد علی نے مؤید برہان میں صراحت کے ساتھ جواب دے دیا ہے

اور غالب نے تیغ تیز اور استفتا میں کوئی نئی بات نہیں کہی اس لئے احمد علی نے مزید کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔

قاضی عبدالودود صاحب۔ ہندوستانی لفظ بیشک گلہری ہے (یعنی بکاف فارسی مکسور) احمد بھی یہی کہتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ان کا یہ قول ہے کہ غلط کردن فارسیاں در حرف ہندی از ناآشنائی زبان است۔ فارسی میں کاف عربی و فارسی بکثرت ایک ہی مرکز سے لکھے جاتے ہیں۔ برہان یہ سمجھا کہ کاف عربی ہے۔ یہ غلطی ایسی نہ تھی کہ اس کے متعلق سوال کیا جاتا۔

ل۔ غالب کہتے ہیں کہ " جامع برہان گلہری کو بکاف عربی فارسی لفظوں میں لکھتا ہے اور اس کا ہموزن ابہری بتاتا ہے۔ یعنی گلہری۔ لیکن بروزن جو بھی ہو فارسی لفظ نہیں ہے۔" غالب کے اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ جامع برہان نے اس لفظ کو فارسی بتایا ہے۔ لہٰذا اس کا تلفظ بھی انھوں نے وہی بتایا جو فارسی میں ہے۔ اس لئے اصل سوال یہ ہے کہ یہ لفظ فارسی ہے یا نہیں اور فارسی میں اس کا تلفظ بکاف عربی مفتوح ہے یا نہیں۔ یہاں یہ سوال قطعی پیدا" نہیں ہوتا کہ ہندی میں اس کا تلفظ کیا ہے۔ بہت سے عربی و فارسی الفاظ اُردو میں مستعمل ہیں مگر ان کی حرکت یا املا بدلی ہوئی ہے۔ مثلاً قمیض بجائے قمیص، صاحب بروزن مطلب بجائے صاحب بروزن غالب۔ خود فارسی میں اسب بجائے اسپ، پیل بجائے فیل، تب بجائے تپ لکھا جاتا ہے۔

جامع برہان نے اس ہندی لفظ کو فارسی لفظ یا فارسی فرہنگ میں اس لئے لکھا کہ یہ فارسی میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ یحییٰ کاشانی کی بیت سے ثابت ہے اور

چونکہ کاف عربی و کاف فارسی اکثر ایک ہی مرکز سے لکھا جاتا ہے جیسے کہ قاضی عبدالودود صاحب نے لکھا ہے اور خود میری نظر سے بھی کئی پرانی ایرانی فارسی کتابیں گذری ہیں جن میں ہر جگہ کاف فارسی ایک ہی مرکز سے لکھا ہے۔ اس لئے جامع برہان نے اسے کاف عربی سمجھا۔ لیکن احمد علی کے بیان کے مطابق جامع برہان نے لکھا ہے کہ اسے بکاف فارسی بھی بولتے ہیں۔ اس لئے یہاں یہ سوال ہی نہیں کہ ہندی میں بکاف عربی بولتے ہیں یا بکاف فارسی۔ اب سوال یہ ہے کہ اہل فارس اول پر فتحہ پڑھتے ہیں یا کسرہ۔ خان آرزو تو ہندوستانی تھے۔ اس لئے وہ ضرور جانتے تھے کہ بکاف فارسی مکسور ہے۔ مگر انھوں نے فارسی کے اعتبار سے بکاف عربی مفتوح بروزن ابھری لکھا ہے۔ لیکن غالب قاطع برہان میں لکھتے ہیں کہ جامع برہان نے اس لفظ کو بوزن ابھری لکھا ہے اور پھر تیغ تیز میں لکھتے ہیں کہ بوزن ابتری لکھا ہے۔ بہرحال خان آرزو اور جامع برہان دونوں فارسی زبان کے اعتبار سے کاف عربی مفتوح بتاتے ہیں۔ مفتی نے جواب دیتے وقت صرف ہندی تلفظ کا خیال رکھا۔ فارسی میں بکاف عربی مفتوح بولتے ہیں یا نہیں اس پر کوئی روشنی نہیں ڈالی۔ مگر یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ یحییٰ کاشانی نے بکاف عربی مفتوح استعمال کیا ہے یا بکاف فارسی مکسور۔

چُکری

بُرہان قاطع۔ چکری بضم اوّل بوزن مُقری نوعے از ریواس باشد و بہ ہندوستان دُختر را گویند۔

قاطع برہان - شاید دکن میں جو جامع برہان کا مسکن ہے دختر کو چُکری بولتے ہوں گے - ورنہ ہندوستان میں بجیم مختلط التلفظ اور واو مجہول کے ساتھ چھوکری بولتے ہیں اور یہ بھی ناقل پر تہمت ہے کہ مغل کے لہجے میں چکری ہے - مغل کے لہجے میں چوکری ہے نہ کہ چکری - کہا جاتا ہے کہ مغل ہائے مخلوط کو ہے بھاگا اور واو کو دکنی کھا گیا - (اہل مطبع نے برہان کے صفحہ ۲۶۳ پر لکھا ہے کہ چُکری دکن کے فرہنگ نگار کی طبع فرتوت کی پیداوار ہے) -

مؤید بُرہان - مغل کے لہجے میں اور بھی الفاظ ہیں جن سے واو حذف ہو جاتا ہے - مثلاً سوڈول بمعنی خوبصورت (خوش وضع و خوش قطع) اس کی دلیل قاطع ہے - "سو" خوبی کا مفہوم دیتا ہے - اسی طرح سوگھڑ بمعنی نیک طبع اور زیرک (سلیقہ مند) ہے - یہ کوگھڑ کی ضد ہے - ایک مثل ہے -

عطر کی رتی بھلی، بھلا نہ منوں تیل
سوگھڑ کا جھگڑا بھلا، کوگھڑ کا بھلا نہ میل

نعمت خاں عالی نے سگر بوزن ہنر استعمال کیا ہے - شعر

ایں عالیؔ بیچارہ بہ ہند آمدہ است
نازنیں، شوخ ظریفے سگرے می خواہد

لفظ "جل" لازمی طور پر بہ تشدید (یعنی جَلّ) ہے - لیکن فارسی میں بہ تخفیف بھی پڑھتے ہیں (یعنی جَل)

غالب کا استفتا نمبر ۱۳ - ہندوستان میں دخترِ نارسیدہ کو چھوکری کہتے ہیں - اہل ولایت چوکری کہیں گے - بحذف ہائے مضمرہ - چکری بحذف واو

غلط یا صحیح؟

مُفتیوں کا جواب - چکری جو اہلِ ولایت سے بھی زیادہ بدلہجہ ہوگا، وہ شاید کہے۔

قاضی عبدالودود صاحب - چکری کے بارہ برہان لکھتا ہے کہ "بوزن مُقری از ریواس باشد و بہ ہندوستان دُختر را گویند" غالب نے اعتراض کیا تھا کہ "در لہجہ مغلیت چوکری می گویند نہ چکری" احمد نے جواب دیا کہ "واو نیز در بعض الفاظ ساقط شود مثلاً سوگھڑ۔ عالی سگر بروزن ہنر آوردہ - ع نازنیں سوخ ظریفے سگرے می خواہد

غالب نے تیغ تیزمیں دعویٰ کیا ہے کہ "جو علما و شعرا ایران سے آئے لہجہ ان کا ہندی نہیں ہوا، املا اہلِ ہند کی املا کے موافق رہی" یہ زبردستی ہے۔ بہت سے لفظوں کا املا بھی بدلا ہے۔ اُردو کے ادبی استعمال سے قبل صحیح املا معلوم بھی بمشکل ہو سکتا تھا۔ برہمن ہی کو لیجئے۔ ہندوستان کی کس زبان میں اصلاً اس طرح تھا۔

ل - برہان قاطع فارسی الفاظ کی فرہنگ ہے۔ ہندی الفاظ کی نہیں۔ اس لئے صرف ان غلطیوں کی گرفت کرنی چاہئے تھی جو فارسی الفاظ سے متعلق ہوں۔ ہندی الفاظ ضمناً آئے ہیں۔ چکری کے ہندی معنی بھی ضمناً بتائے گئے ہیں۔ لہٰذا ہندی الفاظ کے معنی یا تلفظ یا لہجہ معلوم کرنے کے لئے کوئی ولایتی یا ایرانی یا ہندوستانی ہندی الفاظ کو برہان قاطع یا دوسری فارسی فرہنگوں میں تلاش نہ کرے گا۔ چھوکری کو چوکری یا چکری اور پیانو کو پیاو کہنا ولایتوں کا

لہجہ ہے۔ اس لہجے کو فن لغت سے کوئی تعلق نہیں۔ البتہ اہل زبان کا اختلاف تلفظ فن لغت سے تعلق رکھتا ہے۔ یعنی اگر اہل زبان ایک لفظ کے دو تلفظ کرتے ہوں تو یہ بتانا ضروری ہوتا ہے کہ ان دو تلفظوں میں صحیح کون ہے یا دونوں صحیح ہیں۔ بدیسیوں کا لہجہ نہ قابل توجہ ہوتا ہے نہ قابل قبول اور نہ قابل بحث۔ جب بھی کسی لفظ کے تلفظ یا لہجہ سے بحث ہوگی تو اہل زبان کے تلفظ یا لہجے سے بحث ہوگی۔ چھوکری کا تلفظ جب بھی بتایا جائے گا تو چھوکری ہی بتایا جائے گا۔ چوکری یا چکری ہرگز نہ بتایا جائے گا۔ لہٰذا چوکری اور چکری کا لہجہ خارج از بحث ہے اور اگر گرفت کرنی ہی ہو تو صرف اشارہ کرنا کافی ہے۔ اتنے زور شور سے نہیں کرنی چاہیے جتنے زور شور سے کی گئی۔ چکری اور یا وٗ جیسے غیر زبان والوں کے لہجے کی معمولی غلطیوں کو اتنی اہمیت دی گئی کہ ان پر فتوئی بھی طلب کرنا فرض سمجھا گیا۔ اگر مان لیا جائے کہ چکری نہیں ہونا چاہیے بلکہ چوکری ہونا چاہیے تو کیا بدیسیوں کو ہندی سکھاتے وقت بتایا جائے گا کہ چھوکری نہ بولو بلکہ چوکری بولو۔ چوکری ہو یا چکری دونوں ہی تلفظ غلط ہیں۔ جب چوکری بھی غلط تلفظ ہے تو اس کو منوانے پر اتنا زور دینا ضروری کیوں سمجھا گیا۔ بہرحال یہ زور وشور احمد علی کے دلائل کی کاٹ نہ ہو سکا اور ان کے مفتی صاحب کا جواب تو ماشاءاللہ! فرماتے ہیں کہ "شاید وہ چکری کہے" یہ شاید کیا؟ واللہ اعلم بالصواب کا نعم البدل؟ غالب سے پوچھا جا سکتا ہے کہ اس چوکری اور چکری کی بحث سے کون سا علمی یا تحقیقی فائدہ حاصل ہوا؟ بات دراصل یہ ہے کہ غالب جب اپنے گرجدار دعوٰی کے باوجود برہان قاطع کی زیادہ سے زیادہ سنگین غلطیاں نہ نکال سکے تو اپنی لاج

رکھنے کے لئے خردہ گیری پر اُتر آئے اور چکری اور پاؤ جیسی فن لغت سے غیر متعلق ولایتی لہجے کی غلطیوں پر طول طویل بحث چھیڑ دی۔ مگر چکری کی بجائے چوکری بولنا ایسی غلطی ہے جیسے غالب کا "وہ" کو "وو" بولنا اور "غالیہ مو" اور "بو" کے قافیے میں "کو" (کھونا سے) "کھو" اور (ہونا سے) "ہو" لانا۔

تم سب تو یہ کہتے ہو بت غالیہ مو آئے
یک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وو آئے

پاؤ

قاطع برہان۔ یا خُدا یہ (جامع برہان) کس ویرانے کا اُلّو ہے اور کس بیابان کا غول ہے کہ کہتا ہے کہ "پاؤ" ہندی میں "پا" کو کہتے ہیں جس کی عربی رجل ہے۔ ہندی میں پا کو پا نو بروزن گا نو کہتے ہیں نہ کہ پاؤ بروزن گاؤ۔ پاؤ بروزن گاؤ ربع کا ترجمہ ہے۔

موید برہان۔ جامع برہان نے لکھا ہے کہ پاؤ بواؤ دھونے اور پاک کرنے کے معنی میں ہے۔ ہندی میں "پا" کو کہتے ہیں۔ فرہنگ جہانگیری میں بھی لکھا ہے کہ فارسی میں پاؤ دھونے اور پاک کرنے کے معنی میں ہے اور ہندی میں پا کو کہتے ہیں۔ پانو بروزن گانو کو بروزن گاؤ بولنا اس وجہ سے ہے کہ فارسی زبان میں کوئی لفظ بوزن گانو نہیں ہے اور جب ایرانی اس قسم کے ہندی الفاظ کا تلفظ کرتے ہیں تو وہ اپنی زبان کے الفاظ کے مطابق کرتے ہیں۔ مثلاً گاؤ، آؤ وغیرہ۔ اور چونکہ غیر زبان میں مہارت نہیں رکھتے اس لئے اکثر تلفظ کی غلطی کرتے ہیں۔ مثلاً ابو نصر

فراہی نے اپنی ایک بیت میں "زدن" کا ترجمہ "ماری" کیا ہے۔ بیت ہے۔

ضرب و جلد ست و عضو و ہر دو زدن۔ ترکی اور ماق و ہندی ماری۔

بعض ہندی الفاظ ایسے ہیں جو نون غنہ کے ساتھ بھی بولے جاتے ہیں اور بغیر نون غنہ کے بھی بولے جاتے ہیں اور دونوں صحیح ہیں۔ مثلاً چانول اور چاول، بونچھنا اور پوچھنا وغیرہ۔ لہٰذا پانو اور پاؤ دونوں پیر کے معنی میں صحیح ہیں۔ کتاب، خالق باری، میں بھی جس کو غالب نے لفظ گلہری کے سلسلے میں امیر خسرو سے منسوب کیا ہے پاؤ ہی لکھا ہے۔ شعر

تمنا و ہم، آرزو چاؤ کہئے	ید و دست و ہات و قدم پاؤ کہئے
چراغست دیا فتیلہ است باتی	بود جد دادا، نبیرہ است ناتی

لیکن اب پاو اور باتی متروک ہیں۔

تیغ تیز — یہ جو مولوی جی پاؤ بروزن گاؤ بمعنی رجل باستناد خالق باری جائز رکھتے ہیں اس قدر نہیں سمجھتے کہ کچھ کم سات سو برس ہوئے امیر خسرو علیہ الرحمۃ کو، اس عہد میں یوں کہتے ہوں گے اور میں نے خالق باری کو منسوب بہ امیر خسرو اپنی طرف سے نہیں لکھا، قول بعض لکھا ہے۔ بہر حال شاہجہاں کے عہد میں کہ قطب شاہ بھی اس کا معاصر تھا۔ دلی اور دکن میں کبھی پانو بے نون نہ کہتے ہوں گے۔ یہ ایک حماقت ہے دکنی کی۔ جیسا گلہری بوزن اکہری کو بوزن ابتری لکھا ہے اور پھر بجائے کاف فارسی کاف عربی۔ چانول اور چاول کی نظیر غلط۔ ہندی لفظ ہے، ثقات اور شرفا مع النون بولتے ہیں۔ بنئے بقال بے نون بولتے ہیں۔ خدا کا شکر بجا لاتا ہوں کہ انھیں صفحوں میں مولوی نے بیرشید بدو بائے فارسی کو لغو اور پوچ جانا اور

دکنی کا عیب ان کو سوجھا - الٰہی اس کے معنی کس سے پوچھوں؟
پانو بوزن گانو را پاؤ بوزن گاؤ گفتن ازانست کہ در زبان فارسی ہیچ لفظے
بوزن گانو نیامدہ -

میں کہتا ہوں گانو کے ہموزن پیدا نہ ہونے سے پانو کا پاؤ ہونا کیونکر
لازم آتا ہے - فارسی میں رجل کو پائے کہتے ہیں اور در صورت تخفیف تحتانی کو
حذف کر کے پا کہتے ہیں - اہل ایران کی جوتی کو کیا غرض پڑی ہے کہ پانو کو پاؤ کہیں -
اہل ایران پر تہمت لگانی، جھوٹ بولنا، لغو بولنا اور دکنی کی خطائیں سٹانی، اگرچہ
خود مصدر خطا ہو جائیں - یہ تحریر ریشخند اور تمسخر و استہزا ہے - کالج کے طالبعلموں
کے سوا کہ وہ حضرت کے مطیع اور محکوم ہیں ہندی اور ولایتی سب اس پر ہنسیں گے -

غالب کا استفتا نمبر ۱۴ - پا اور پاے باضافۂ تحتانی جس کو عربی
میں رجل کہتے ہیں ہندی میں اس کا نام پانو مع النون ہے یا پاؤ بے نون -

مفتیوں کا جواب - پانو کو پاؤ نہ کہے گا مگر مجنوں -

شمشیر تیز تر - میر عضدالدولہ شیرازی کی تقلید میں حکیم تبریزی یعنی جامع
برہان کا قول ہے کہ پاؤ بواؤ فارسی میں دھونے اور پاک کرنے کے معنی میں
ہے - ہندی میں اسے پاؤ کہتے ہیں جس کی عربی رجل ہے - معترض نے کہا تھا کہ
پاکو ہندی میں پانو کہتے ہیں جسے گانو کا قافیہ کیا جا سکتا ہے نہ کہ پاؤ جو گاؤ کا
قافیہ ہے - جواب دینے والے نے لکھا تھا کہ صاحب جہانگیری نے لکھا ہے کہ پاؤ
بواؤ فارسی میں دھونے اور پاک کرنے کے معنی میں ہے اور ہندی میں پا کو کہتے
ہیں - میں نے لکھا تھا کہ پانو بوزن گانو کو پاؤ بوزن گاؤ بولنے کی وجہ یہ ہے کہ

فارسی زبان میں کوئی لفظ بوزن گانو مستعمل نہیں ہے اور ایرانی پہ مجبوری ایسے ہندی الفاظ کا تلفظ اپنی ہی زبان کے مطابق کرتے ہیں۔ مثلاً گاؤ، آؤ وغیرہ۔ اور ایرانی چونکہ غیر زبان میں مہارت نہیں رکھتے اس لیے وہ اکثر تلفظ کی غلطی کرتے ہیں اور بعض ہندی الفاظ ایسے ہیں جو نون غنہ کے ساتھ بھی بولے جاتے ہیں اور بغیر نون غنہ کے بھی بولے جاتے ہیں مثلاً چانول اور چاول، پونچھنا اور پوچھنا وغیرہ۔ پس پانو اور پاؤ دونوں صحیح ہیں۔ کتاب "خالق باری" میں بھی جس کو غالب نے امیر خسرو سے منسوب کیا ہے پاؤ ہی لکھا ہے۔

ید و دست و ہات و قدم پاؤ کہیے	تمنا وہم، آرزو چاؤ کہیے
بود جد دادا، نبیرہ است ناتی	چراغست دیا، فتیلہ است باتی

لیکن اب پاؤ اور باتی متروک ہیں۔

مجیب کے اس جواب کے باوجود معترض نے تیغ تیز میں اس اعتراض کو پھر لکھا ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ ولایتی اور ہندوستانی خواص میری تحریر پر ہرگز نہیں ہنسیں گے۔ کیونکہ یہ کلیہ ہے کہ اگر کوئی شخص غیر زبان کا لفظ بولتا ہے اگر انھیں حرکات و سکنات کے ساتھ اس کی اپنی زبان میں لفظ موجود ہے تو وہ اس لفظ کا تلفظ بدلے بغیر وہ لفظ بولتا ہے اور اگر ہم تلفظ لفظ موجود نہیں ہے تو اس لفظ کو اپنی زبان کے لفظ کے تلفظ کے مطابق بولتا ہے۔ لہٰذا جبکہ یہ مسلم ہے کہ فارسی زبان میں کوئی لفظ بوزن گانو نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ اہلِ فارس جب پانو کا تلفظ بوزن گانو نہ کر سکیں گے تو ناچار اپنی زبان کے لفظ گاؤ کے مطابق اس کا تلفظ کریں گے۔ غالب کہتے ہیں کہ "فارسی میں رجل کو پائے

کہتے ہیں اور درصورت تخفیف تحتانی کو حذف کرکے پا کہتے ہیں۔ اہل ایران کی جوتی کو کیا غرض پڑی ہے کہ پانو کو پاؤ کہیں۔ اہل ایران پر تہمت لگانی، جھوٹ بولنا، لغو بولنا اور دکنی کی خطائیں مثانی اگرچہ خود مصدر خطا ہو جائیں۔ اس بات کو بھی جانتے ہیں۔ خود جامع برہان نے لکھا ہے۔ فارسی میں رجل کے لیے پا کا لفظ موجود ہونے سے یہ ضروری نہیں کہ اہل ایران ہندی لفظ پانو میں تصرف کرکے پاؤ نہ کہیں۔ اور مفتیوں کی خدمت میں عرض ہے کہ جب کتاب خالق باری میں جس کو مستفتی نے حضرت امیر خسرو سے منسوب کیا ہے۔ پاؤ چاؤ کے قافیہ میں آیا ہے تو اس جملے کا کیا مطلب کہ پاؤ نہ کہے گا مگر مجنوں۔ (اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت امیر خسرو علیہ الرحمۃ مجنوں تھے)۔ ایسی بات زبان پر لانا یا لکھنا اپنی حد سے بڑھنا ہے۔

قاضی عبدالودود صاحب۔ پاؤ کے بارہ میں احمد نے خالق باری کا یہ مصرعہ ؎ ید و دست و ہات و قدم پاؤ کہیے
(بہ قافیۂ چاؤ) پیش کیا تھا۔ غالب اسے تیغ تیز میں تسلیم کئے بغیر کہ یہ امیر خسرو کا ہے یہ لکھتے ہیں کہ پہلے پاؤ بولتے ہوں گے۔ شاہجہاں کے عہد میں یہ زبان نہ تھی۔ اس عہد کی ہندوستانی زبان کے متعلق غالب کے معلومات کچھ نہ تھے۔ تحقیق کئے بغیر ایک بات لکھ دی۔

ل۔ پاؤ اور پانو کی بحث میں غالب کی بوکھلاہٹ عیاں ہے۔ فارسی میں پاؤ کے معنی دھونے اور پاک کرنے کے ہیں۔ لیکن جامع برہان نے ضمناً یہ بھی بتایا کہ ہندوستان میں پا کو پاؤ (یعنی پانو) کہتے ہیں۔ پانو کو پاؤ بتانا ایسی غلطی نہ

تھی کہ اودھم مچایا جائے اور جامع برہان کو ویرانے کا اُلّو اور بیابان کا غول کہا جائے۔ اوّل تو غالب نے یہ ماننے سے انکار ہی کر دیا تھا کہ پانو کا تلفظ پاؤ بھی تھا۔ لیکن جب احمد علی کے دلائل اور خالق باری سے پیش کردہ سند سے مجبور ہوئے تو کہنے لگے کہ پاؤ امیر خسرو کے وقت میں کہتے ہوں گے۔ شاہجہاں کے وقت میں نہ کہتے ہوں گے۔ یہ "ہوں گے" کا لفظ بتاتا ہے کہ غالب کی بات مدلل نہیں بلکہ قیاس پر مبنی ہے۔ لیکن قیاس کی بھی تو کوئی بنیاد ہونی چاہیے۔ عجیب تماشہ ہے کہ غالب خود بھی کوئی دلیل پیش نہیں کرتے اور دوسروں کی بھی دلیل کو نہیں مانتے۔ جامع برہان نے اپنی طرف سے پاؤ نہیں لکھا۔ بلکہ فرہنگ جہانگیری سے نقل کیا۔ فرہنگ جہانگیری مغل بادشاہ جہانگیر کے وقت میں مرتب ہوئی تھی۔ اس لئے یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ امیر خسرو کے علاوہ جہانگیر کے وقت میں بھی پاؤ بولتے رہیں گے۔ خواص نہیں تو عوام ہی سہی۔ جہانگیر کے بعد ہی شاہجہاں کا دور شروع ہوتا ہے۔ یہ کس دلیل پر دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ شاہجہاں کے وقت میں پاؤ کا لفظ یک قلم متروک ہو چکا تھا۔ احمد علی نے چانول اور چاول، پونچھنا اور پوچھنا کی مثالیں دے کر ثابت کیا کہ پاؤ بولا جاتا تھا۔ غالب نے چانول اور چاول کی مثال کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ شرفا چانول بولتے ہیں اور بنئے بقّال چاول کہتے ہیں۔ مگر یہ نہیں بتایا کہ پونچھنا کون کہتا ہے اور پوچھنا کون بولتا ہے۔ بہرحال احمد علی بھی کہتے ہیں کہ پاؤ اب متروک ہے۔

اس دلیل کے جواب میں کہ جن ہندی الفاظ کا ہندی تلفظ فارسی زبان میں موجود نہیں ایرانی ان الفاظ کا تلفظ اپنی زبان کے الفاظ کے تلفّظ کے مطابق ادا کرتے ہیں غالب کہتے ہیں کہ ایرانیوں کی جوتی کو کیا غرض پڑی ہے کہ پاؤ کہیں جبکہ ان کی فارسی میں

پائے اور پا کا لفظ موجود ہے۔ یہ انداز گفتگو زنانہ بدتہذیبی کا نمونہ ہے۔ غالب کو معلوم ہونا چاہیے کہ جو ایرانی ایران میں رہتے ہیں ان کو تو خیر غیر زبان بولنے کی ضرورت نہیں پڑتی لیکن جو ایرانی تجارتی یا کسی دوسرے سلسلے میں ہندوستان و پاکستان میں رہتے ہیں ان کو وہاں کے لوگوں سے برابر ملنے جلنے اور بولنے چالنے کی ضرورت پڑتی ہے لہٰذا ان کی جوتی کو غرض پڑے یا نہ پڑے لیکن ضرورت کے تحت ان کے مُنھ کو ہندی بولنے کی ضرورت پڑتی ہے اور جبکہ ایرانیوں کی اپنی زبان موجود ہے تو ایران میں فرانسیسی اور انگریزی زبانیں کیوں پڑھائی جاتی ہیں۔ فارسی زبان میں فرانسیسی الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ احمد علی کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ جن ہندی الفاظ کو ایرانی ہندی مخرج سے نہیں بول سکتے انھیں فارسی مخرج سے بولتے ہیں۔ میں نے خود ایک ایرانی اور ایک مصری کو انگریزی بولتے سُنا ہے وہ "ٹ" کو "ت" کے مخرج سے ادا کرتے تھے۔ کابلیوں کو اُردو بولتے اکثر سُنا ہے۔ وہ اکثر ہندی الفاظ کو اپنے مخرج سے ادا کرتے ہیں۔ وہ روپیہ کو روپئی بولتے ہیں۔

غالب کی ایک اُردو غزل کی ردیف "پانو" ہے۔ اس غزل کو واو کی ردیف میں شامل کیا گیا ہے۔ مگر پانو اور گانو کو عام طور پر پاؤں اور گاؤں لکھا جاتا ہے۔ بلکہ اس وزن کے جتنے الفاظ ہیں ان میں واو کے بعد نون غنہ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ پانو صحیح یا پاؤں۔ اگر اس لفظ کو ٹکڑے کر کے تلفظ کے مطابق پڑھا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ صحیح کون اور غلط کون۔ ٹکڑے کر کے پڑھیے۔ پاں۔ وَ یا پا۔ ؤں۔ ظاہر ہے کہ پا۔ ؤں پڑھتے ہیں۔ اگر نون غنہ واو کے قبل ہونا چاہیے تو کھاؤں۔ لاؤں، کھائیں۔ لائیں، چھاؤں، داؤں اور چاہوں کو کھانو، لانو، کھانیے، لانیے۔ چھانو، دانو اور چاہنو لکھنا چاہیے۔

پپریشد

قاطع برہان - پریشد پریشیدن کا مضارع ہے اور پریشیدن اصل مصدر نہیں ہے۔ اسے بضرورت یا تفنن کے لئے اسم جامد "پریشان" سے بنالیا گیا ہے۔ مضارع بنانے کے لئے ضروری تھا کہ پہلے مصدر بنایا جائے (لہٰذا پریشان سے مصدر پریشیدن بنایا گیا۔ اس کے بعد پریشد مضارع بنایا گیا)۔ اس کے بعد (پریشد میں) بائے زائدہ کا اضافہ کیا گیا۔ جب جاکر یہ خانہ خراب لفظ وجود میں آیا۔ (لہٰذا پپریشد میں اول "پ" غلط ہے)۔

جامع برہان نے پریشد لکھا۔ پھر پپریشد لکھا اور بائے فارسی مع الراکی بحث میں پراش، پراشید، پراشیدن، پراشیدہ، پریش، پریشد، پریشیدن، پریشیدہ لکھا اور پپریشد سے لے کر پریشیدہ تک جتنے الفاظ ہیں جو اس کی پریشانی کا نتیجہ ہیں سب کو متحد المعنی لکھا ہے۔

موید برہان - ایسے آسان مواقع پر تامّل و توقف تعجب کا باعث ہے۔ جب خود غالب کے نزدیک پریشیدن کا لفظ ضرورت کے تحت یا تفنن کیلئے لفظ "پریشان" سے بنایا گیا ہے اور کثیر الاستعمال بھی نہیں تو پھر اس کی دوسری صورتوں پر اعتراض کیوں کرتے ہیں۔ مجمع الفرس میں پریشیدن کے معنی بدحال اور پریشان کرنا اور رہونا اور بےخود ہونا لکھا ہے۔ شرفنامہ میں پراشیدن کے یہی معنی لکھے ہیں۔ شاکر بخاری کا شعر ہے۔

مجلس پراشیدہ ہمہ، میوہ خراشیدہ ہمہ زرہا بپاشیدہ ہمہ، نقل گراں کردہ بلہ

سعدی کہتے ہیں۔

پراشیدہ عقل و پراگندہ ہوش
ز قولِ نصیحت گر آگندہ گوش

موید الفضلا، مدار الافاضل، جہانگیری، نوادر المصادر اور رشیدی کے جامعین اور خان آرزو کہتے ہیں کہ پریشیدن اور پراشیدن دو الگ الگ الفاظ نہیں ہیں۔ بلکہ پریشیدن پراشیدن کا امالہ ہے اور صاحب بہارِ عجم نے نوادر المصادر میں پراشیدن، پریشیدن اور پرشیدن لکھا ہے اور پریشن (بنون) اور پراش اور پریش (بغیر نون) کو اس کا مخفف لکھا ہے۔ اس طرح صیغۂ امر کو پریشان کنندہ کے معنی میں لکھا ہے۔ مثلاً خاطر پریش اور صحیح بات یہ ہے کہ پریشن کا لفظ پریش میں نون کا اضافہ ہے۔ جیسے پاداشن و گزارشن۔ اسی طرح فرہنگِ رشیدی، جواہر الحروف اور ہفت قلزم میں بھی پریشن بوزن کشیدن جو پریشان کا مخفف ہے اور معنی اس کے افشاندن و پریشان کردن بھی ہیں۔

تیغ تیز۔ خدا کا شکر ہے کہ مولوی نے پپریشد کو بدو باے فارسی تعود یوچ جانا اور دکنی کا عیب ان کو سوجھا۔

غالب کا استفتا نمبر ۱۵۔ پریشیدن مصدر جعلی ہے۔ بنایا ہوا لفظ "پریشان" سے۔ خیر بائے زائدہ اس کے قبل لاکر پپریشیدن کہو، پپریشیدن بہر دو بائے فارسی بھی انھیں معنیوں میں کہیں آیا ہے یا نہیں۔

مفتیوں کا جواب۔ کہیں نہیں آیا۔ اس میں ذہن کو پریشان کرنا کیا ضرور؟

قاضی عبدالودود صاحب۔ احمد کو پپریشد کی صحت پر اصرار نہیں ہے۔

اس لئے سوال فضول ہے۔

ل۔ بقول غالب احمد علی نے پریشید بدو بائے فارسی کو لغو و پوچ جانا۔ اور احمد علی نے مختلف فرہنگوں کے جوابوں سے جو معنے بتائے ہیں وہ پریشیدن کے بتائے ہیں پریشیدن کے نہیں۔ غالب نے تیغ تیز میں ان کے بتائے ہوئے معنوں کی کوئی تردید نہیں کی بلکہ تیغ تیز میں اس لفظ سے کوئی بحث بھی نہیں کی۔ ایسی صورت میں اس سوال کی ضرورت کیا ہے کہ پریشیدن ان معنوں میں کہیں آیا ہے یا نہیں؟

خانہ سیل ریز

برہان قاطع ۔ خانۂ سیل ریز شراب انگوری سے کنایہ ہے۔

قاطع برہان ۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ شراب کا نام خانہ (یعنی گھر) قرار دینا اور پھر اس کی صفت سیل ریز لانا۔ شراب تو شراب، خود خانہ (یعنی گھر) کی صفت سیل ریز نہیں ہو سکتی۔ کسی گھر کے بارہ میں نہیں سُنا کہ اس سے سیلاب بہتا ہے۔ سیلاب پہاڑ سے بہتا ہے نہ کہ گھر سے۔ مگر ہاں! برہان الدین صاحب (یعنی جامع برہان) نے ملک دکن میں اپنا گھر پہاڑ پر بنایا ہوگا اور اس گھر سے سیلاب ٹپکتا ہوگا۔

انتباہ ۔ قاطع برہان میں یہ اعتراض نہ تھا۔ درفش کاویانی میں اضافہ کیا گیا۔

غالب کا استفتا نمبر ۱۶ ۔ خانۂ سیل ریز شراب انگوری کو کہہ سکتے ہیں یا نہیں؟

مفتیوں کا جواب ۔ سیل خانہ ریز شراب کی صفت ہو سکتی ہے۔ انگور کی قید

بیجا اور خانۂ سیلریز مہمل اور غلط اور خبط۔

شمشیر تیز تر۔ درفش کاویانی میں اس اعتراض کا اضافہ کیا گیا ہے اور حق بات کہی گئی ہے۔ مگر مدار الافاضل میں لکھا ہے کہ خانۂ سیلریز کنایہ ہے۔ شراب خانہ اور دُنیا سے۔

قاضی عبدالودود صاحب۔ یہ اعتراض فریقین میں ما بہ النزاع نہیں۔ شمشیر تیز تر میں احمد نے اس اعتراض کو صحیح مانا ہے۔

ل۔ خانۂ سیلریز شراب انگوری کو نہیں کہہ سکتے۔ مگر جس طرح شراب انگوری کو دخترِ انگور کہتے ہیں۔ اسی طرح انگور کو خانہ سیلریز اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ اس کے اندر رس رہتا ہے۔ اب یہ سوال کہ انگور کی صفت سیلریز ہو سکتی ہے یا نہیں۔ سیلریز سے مراد اس قدر رس کہ چھلکنے لگے۔ یعنی اس کی کثرت۔ ہم اُردو میں کثرت سے جفا کرنے والے معشوق کی صفت ”جفا فروش“ لاتے ہیں۔ حالانکہ نہ کوئی جفا بیچتا ہے اور نہ کوئی خریدتا ہے۔ جس جام میں اتنی شراب ہو کہ چھلک پڑتی ہو اس جام کو خانۂ سیلریز کہہ سکتے ہیں۔ مدار الافاضل میں جو لکھا ہے کہ خانۂ سیلریز شراب خانہ یا دُنیا سے کنایہ ہے صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اس سے مراد وہ شراب خانہ جس میں کثرت سے شراب ہو اور خُم کی خُم لنڈھائی جاتی ہو۔ دُنیا کو چونکہ عشرت کدہ بھی کہتے ہیں اور اس عشرتکدہ میں شراب کی کثرت ہے اور کثرت سے شراب پی جاتی ہے اس لئے دُنیا کو بھی خانۂ سیلریز کنایتہً کہہ سکتے ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا صحیح نہیں کہ خانہ کی صفت سیلریز نہیں ہو سکتی۔ غالب محض اعتراض کرنے کی غرض سے خانۂ سیلریز کے بالکل لغوی معنے لئے ہیں۔ غالب بھی تو کہتے ہیں۔

باد رآیا مجھے پانی کا ہوا ہو جانا

اگر "ہوا" کے لغوی معنی "ہوا" ہی لئے جائیں تو اعتراض ہو سکتا ہے کہ پانی بخار بنتا ہے نہ کہ ہوا۔ مفتی صاحب کہتے ہیں کہ سیل خانہ ریز شراب کی صفت ہو سکتی ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ کسی گھر کے بارہ میں نہیں سنا کہ اس سے سیلاب بہتا ہے۔ لیکن کسی شراب کے بارہ میں بھی تو نہیں سنا گیا کہ اس سے گھر بہتا ہے۔

موید برہان، تیغ تیز اور شمشیر تیز تر کا گہرا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب اور احمد علی کے تنازعات میں غالب کی کامیابی خال خال اور احمد علی کی کامیابی بہت بڑھی ہے۔ تیغ تیز پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے موید برہان کو ٹھیک سے پڑھا بھی نہیں۔ غالب نے احمد علی کی صرف چند تردیدوں کی تردید کی ہے اور بعض جگہ خود احمد علی پر اعتراض کئے ہیں۔ لیکن کہیں آدھی بات کی تردید کی ہے، کہیں اصل سوال سے ہٹ کر اعتراض کیا ہے، کہیں غلط بیانی سے کام لیا ہے، کہیں اعتراضوں کو خواہ مخواہ دہرایا ہے اور کہیں ان کے اعتراضوں کو مان لینے پر بھی اپنی معترضانہ بحث جاری رکھی ہے۔ ان کے کئی استفتا بھی فضول ہیں۔ غالب کی ان خامیوں کی وجہ یہ ہے کہ وہ جس وقت تیغ تیز کے لئے موید برہان کا مطالعہ کر رہے تھے اس وقت ان کی عمر ستر برس کے لگ بھگ تھی۔ علاوہ اس کے امراض اور اضمحلال قویٰ نے بُرا حال کر رکھا تھا۔ غدر کے بعد کا زمانہ ان کے لئے بڑی پریشانی کا زمانہ تھا۔ اس صورت حال کی موجودگی میں جم کر محققانہ مطالعہ کرنا اور ہر بات کو وقت نظر سے پرکھنا ممکن نہ تھا۔ تیغ تیز کے آخر میں لکھتے ہیں کہ "اگرچہ ابھی پرسشیں بہت باقی ہیں لیکن بڑھاپا اور امراض اور ضعف مفرط نہیں

لکھنے دیتا۔ صبح سے شام تک پلنگ پر پڑا رہتا ہوں۔ لیٹے لیٹے مسودہ کیا اور احباب کو دے دیا۔ انھوں نے صاف کر لیا۔ اب میری تحریر تمام ہوئی۔ احباب صاف کر لیں تو مطبع میں حوالے کروں اور بعد انطباع جیسا کہ دیباچہ میں وعدہ کرتا ہوں عمل میں لاؤں۔ یہ جو کچھ بہ سبیل سوالات لکھا ہے مولوی صاحب سے اس کا جواب جُدا جُدا مانگتا ہوں۔"

غالب نے جیسی اپنی حالت بتائی اس حالت میں موید برہان جیسی کتاب کا جواب لکھنا آسان نہ تھا۔ لیکن چپ رہ جانے کا مطلب ان کے خیال میں یہ تھا کہ انھوں نے ہار مان لی یا دوسروں کی فارسی دانی تسلیم کر لی۔ اس لئے اس پریشان کن حالت میں بھی ان سے چُپ نہ رہا گیا۔

غالب نے تیغ تیز کے خاتمہ پر بڑی رقت انگیز بات کہی ہے۔ مولوی احمد علی سے کہتے ہیں کہ "سنو صاحب! نفسانیت کا بُرا ہو۔ اکابر اُمّت میں باہم کیا کیا ناخوش و ناشائستہ کلام درمیان آئے ہیں۔ حکیم شفائی صفاہانی نے مولانا عرفی شیرازی کی کیا کیا مذمتیں کی ہیں۔ ایک قصیدے میں اس مرحوم کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں شعر ؎

هزار قطعهٔ نم کرده در بغل رفتی
ز ناکسان جهاں تا به میرزا خانی

اور یقین ہے کہ عرفی و شفائی کے زمانے میں اس قدر تقدیم و تاخیر ہو جتنی برہان و غالب کے عہد میں تھی علمائے ماوراء النہر اور علمائے مشہد میں ایسے مکاتبات کی آمد و رفت درمیان رہی کہ فریقین کی توہین و تفرین سے مملو ہیں۔ بلکہ خود شاہ ایران اور سلاطین روم کے درمیان وہ نامے جاری ہوئے ہیں جن میں

سراسر مغلّظ گالیاں مرقوم ہیں۔ غرض اس اظہار سے یہ ہے کہ جہاں عمائد اہلِ اسلام وسلاطین اہلِ اسلام کی وہ ناسزا تحریریں صفحۂ روزگار پر یادگار رہیں گی وہاں تمہارے ہمارے بدکہاد صفحۂ دہر پہ نمودار رہیں گے۔ نہیں نہیں! صرف اللہ کا نام رہ جلئے گا اور کچھ نہیں ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام۔

یہ انسانی زندگی کا کتنا بڑا المناک سانحہ ہے کہ ارتکاب گناہ کر چکنے کے بعد احساس گناہ ہوتا ہے۔ غالب کو بھی احساس گناہ ہوا۔ لیکن ساتھ ہی دوسرا احساس بھی اُبھرا جس کے تحت احمد علی سے اپنے سوالوں کا جواب جُدا جُدا مانگا۔ اس لئے احمد علی نے بھی جو ابھی جوشیلے جوان تھے جواب دینا ضروری سمجھا اور شمشیر تیز تر لکھی۔ لیکن غالب کے آخری الفاظ کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ شمشیر تیز تر میں ایک بھی سخت لفظ استعمال نہیں کیا۔ مولوی اشرف علی خاں نے شمشیر تیز تر کا قطعہ تاریخ طبع لکھا تھا جس کا ایک شعر ہے۔

نوشتیم سالش نہ روئے برش
اسد کشتہ از ضرب احمد بود   ۱۸۶۷ء

یہ عجیب اتفاق ہے کہ شمشیر تیز تر کی اشاعت کے بہت جلد بعد غالب کا انتقال ہوگیا۔ قاضی عبدالودود صاحب اور مالک رام صاحب دونوں ہی لکھتے ہیں کہ شمشیر تیز تر کے منظر عام پر آنے سے قبل ہی غالب کا انتقال ہو چکا تھا۔ کیونکہ شمشیر تیز تر کی ہجری سال اشاعت ۱۲۸۶ھ ہے اور غالب کا ہجری سال وفات ۱۲۸۵ھ ہے۔ مگر عیسوی سال اشاعت سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی۔ شمشیر تیز تر تاریخی نام ہے۔ اس سے مادۂ تاریخ ۱۸۶۷ء نکلتا ہے۔ غالب

کا انتقال ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء میں ہوا۔ مالک رام صاحب شمشیر تیز تر کا عیسوی سال طباعت ۱۸۶۸ء لکھتے ہیں۔ اس لئے ممکن ہے کہ شمشیر تیز تر غالب کی زندگی میں چھپی مگر ان کی نظر سے گذرنے نہیں پائی تھی کہ ان کا انتقال ہو گیا۔

قاطع القاطع۔ قاطع برہان کی تردید و تنقیص میں یہ چوتھی کتاب تھی۔ ۲۶۸ صفحہ کی کتاب فارسی میں ہے۔ ۱۲۸۳ھ میں چھپی۔ اس کے مصنف مولوی امین الدین دہلوی ہیں۔ پٹیالہ میں مدرس تھے۔ علوی کے شاگرد تھے۔ تذکرہ گلستاں میں لکھا ہے کہ "علوم متعارفہ کو نہایت تدقیق کے ساتھ تحصیل کیا اور پایۂ تحقیق عرش تک پہنچایا۔ اشعار فارسی نہایت متانت سے کہتے ہیں۔ علم مجسم۔ ان کے لب کو کبھی تبسم سے خالی نہیں پایا (مآثر غالب)

قاطع القاطع لکھتے وقت مصنف دہلی میں مقیم تھے۔ بہت زیادہ فحش کلامی سے کام لیا ہے۔ اپنی فحش کلامی کے جواز میں فرماتے ہیں کہ "جواب نگاروں کو تقابل ناگزیر ہے۔ فحش گوئی میرا طریقہ نہیں۔ اس لئے لکھ رہا ہوں کہ جواب سے عہدہ برآ ہو سکوں۔ خیال آیا کہ معترض (یعنی غالب) ظرافت پسند کرتے ہیں، سادہ نگاری پسند نہیں کرتے۔ لہٰذا ناچار ظریفان وقت سے چند ظریفانہ الفاظ مانگ لئے اور زبان قلم کے سپرد کئے۔ جواب دینے والے کو ان الفاظ کے لکھنے سے مطعون نہ کریں اور یہ بھی جاننا چاہئے کہ مقتدی کو جس قدر برا کہا جائے گا امام کو بدگوئی کے خدنگ سے چھلنی بنایا جائے گا۔ کیونکہ مقتدی کی اہانت امام کی اہانت ہے

{قاطع القاطع (قاضی عبدالودود۔ نقد غالب)}

غالب کی ظرافت پسندی کا ثبوت ان کے ان جملوں سے ملے گا۔

حضرت غالب نے برہان قاطع کے اغلاط پر اعتراض لکھے ہیں کہیں کہیں از راہ شوخی طبع ظریفانہ بطریق بذلہ رقم بخ ہوئے ہیں (لطائف غیبی)

زشت گفتم لیک داد بذلہ سنجی دادہ ام
شوخی طبعی کہ دارم ایں تقاضا کردہ است
غالب

جواباً مولوی امین الدین نے شوخی طبع سے داد بذلہ سنجی دینی چاہی۔ انھوں نے ایسی فحش گالیاں دیں کہ غالب جیسے فحش گو بھی پناہ مانگنے لگے۔ غالب کو قاطع القاطع کا جواب لکھنے یا لکھوانے کی ہمت نہ پڑی۔ غالب کو شاید یہ ڈر تھا کہ جواب دینے پر خدا جانے جواب الجواب کتنا فحش ہوگا۔ غالب تیغ تیز کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ "میاں امین الدین کہ اب پٹیالہ میں ملقب بہ مدرس ہیں۔ انھوں نے قاطع القاطع چھپوایا۔ استعداد علمی میں سے بعد صرف مقاصد نحو و صرف فارسیت کی اسی قدر رعایت منظور رکھی کہ فقیر کے بعض فقروں کی ترکیبیں اپنی عبارت کے قالب میں ڈھال لیں۔ باقی سوائے عربی تشریح اور فارسی مسروقہ کے وہ مغلظ گالیاں دی ہیں جو کنجڑے بھٹیارے استعمال کرتے ہیں۔ کمال یہ کہ ان کا منطق ہندی اور حضرت کی عبارت فارسی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی جلاہے ان دنوں میں علم تحصیل کرکے مہذب ہو گئے، عمامہ باندھے ہوئے پڑے پھرتے ہیں۔ فحش نہیں بولتے، خلاف اپنی قوم کے صاحب قبلہ ان کا روزمرہ ہے۔ یارب میاں امین الدین کس بری قوم اور کس پاجی گروہ کے ہیں کہ مولوی کہلائے۔ مدرس بنے مگر الفاظ مستعملہ قوم نہ چھوڑے۔ اگر میری طرف سے ازالہ حیثیت کی نالش دائر کی جاتی تو میاں پر کیسی بنتی۔ مگر میرے کبر نفس ازالۂ حیثیت کے لفظ کو گوارا نہ کیا۔ ان کی تحریر

ان کے پاجی پن پر سجل ہے۔

بغور جائزہ لینے پر معلوم ہوتا ہے کہ بد سے بدتر گالیاں کھانے کے خوف سے کبر نفس کا خیال رکھا گیا تھا۔ ورنہ جہاں تک فحش نگاری کا تعلق ہے غالب کو بھی اس فن میں کمال حاصل تھا۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

نواب علاء الدین خاں علائی کو ایک خط میں کسی مولوی حمزہ کے بارہ میں فرماتے ہیں کہ "رسائل ابوحنیفہ کو دیکھنا اور مسائل حیض و نفاس میں غوطہ مارنا اور ہے اور عرفا کے کلام سے حقیقۃ حقہ وحدت وجود کو دلنشیں کرنا اور ہے۔" (اردوئے معلیٰ)

مرزا یوسف کو لکھتے ہیں کہ "ترحم یہ ہے تو تغافل کیا ہوگا۔ خود موجود ہوں اور حکام صدر کا ردشناس پشم نہیں اکھیڑ سکتا۔" (جہان غالب)

شہاب الدین احمد خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "یہ اشعار جو تم نے بھیجے ہیں خدا جانے کس والدالزنا نے داخل کر دیے ہیں۔ دیوان تو چھاپے کا ہے۔ متن میں اگر یہ شعر ہوں تو میرے ہیں اور اگر حاشیہ میں ہوں تو میرے نہیں۔ بالفرض اگر یہ شعر متن میں پائے جائیں تو یوں سمجھنا کہ کسی ملعون زن جنب نے اصل کلام کو چھیل کر یہ خرافات لکھ دئے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ جس مقصد کے یہ شعر ہیں اس کے باپ پر اور دادا پر اور پر دادا پر لعنت اور وہ ہفتاد پشت تک ولدالحرام۔"

غیاث اللغات حیض کا لتہ ہے۔ (خطوط غالب)

لوطیان ایران میں رسم ہے کہ چند بدمعاش جمع ہو کر ایک امرد کو کچھ دے کر باغ میں یا کسی مکان میں لے جاتے ہیں اور نوبت بنوبت اس سے اغلام کرتے ہیں۔ اسی جماعت میں سے ایک شخص اس امرد کا سر پکڑے رہتا ہے۔ سو موید برہان

کے پانچویں صفحے میں مولوی جی لوگوں کی منتیں کرتے ہیں اور بلاتے ہیں کہ آؤ اور دکنی کا سر پکڑ دو۔ (تیغ تیز)

جامع برہان قاطع مر کر بھوت بن گیا ہے اور صاحب تپ محرق یعنی مؤلف محرق قاطع برہان پر آ چڑھا۔ (لطائف غیبی)

غالب کی ان فحش نگاریوں کو دیکھتے ہوئے یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ مولوی امین الدین کے خلاف ازالہ حیثیت کی نالش نہ کرنا بربنائے کبر نفس ہے۔ لیکن وہ آخر تک اس کبر نفس پر بھی برقرار نہ رہ سکے۔ انھوں نے اپنے ہمدردوں اور خیر خواہوں کے ہری ہری سمجھانے پر ڈپٹی کمشنر بہادر دہلی کے یہاں ۵ ار دسمبر ۱۸۶۸ء میں مقدمہ دائر کر دیا۔ غالب کے وکیل نے جو عرضی داخل کی تھی اس سے مولوی امین الدین کی فحش کلامیوں کا پتہ چل سکے گا۔

غالب کے وکیل اور گواہ

وکیل۔ عزیز الدین۔

گواہان۔ (۱) منشی سعادت علی صاحب مدرس کالج دہلی

(۲) ماسٹر پیارے لال صاحب سکریٹری

(۳) مولوی نصیر الدین صاحب مدرس مدرسہ دہلی

(۴) مولوی لطیف حسین صاحب مدرس مدرسہ دہلی

(۵) منشی حکیم چند صاحب مدرس کالج دہلی۔

مولوی امین الدین کے وکیل اور گواہ

وکیل۔ انبہ سہائے

گواہان ۔ (۱) مولوی ضیاء الدین صاحب

(۲) مولوی سدید الدین خاں صاحب

(۳) حکیم حشمت اللہ خاں صاحب

(۴) محمد حمید الدین خاں صاحب عرف عبد الحلیم صاحب

(۵) مولوی ابراہیم خاں صاحب

(۶) مولوی محمد حسین صاحب

(۷) مولانا قمر الدین صاحب

عرضی

عزیز الدین وکیل اسد اللہ خاں پنشن دار سرکار عرف مرزا نوشہ معروضہ

۱۵ دسمبر ۱۸۶۸ء

بہ

ڈپٹی کمشنر بہادر دہلی

جناب عالی!

جو حال عزت و اقتدار میرے موکل کا گورنمنٹ میں ہے اس کی تصریح دفاتر سرکار اور آمد خطوط اور چٹھیاں حکام خصوصی سکریٹری گورنمنٹ پنجاب و نواب گورنر جنرل بہادر کشور ہند سے بخوبی ہو سکتی ہے ۔ مسمی امین الدین ساکن دہلی حال مدرس پٹیالہ نے ایک کتاب قاطع القاطع (بہ جواب قاطع برہان) مصنفہ موکلم تصنیف کی ۔ اس میں ایسے الفاظ ناشائستہ بلکہ دشنام مغلظہ نسبت موکلم تحریر کئے ہیں اور اس کتاب کو چھپوا کر مشتہر کیا کہ جس کی تعریف دفعہ ۴۹۹ تعزیرات

ہند میں درج ہے وقوع میں آوے۔ پس مدعا علیہ مرتکب اس جرم کا ہوا جسکی
سزا تعزیرات ہند کے ۵۰۰ اور ۵۰۱ میں قرار پائی ہے۔ لہذا اُمید وار ہوں
کہ بعد تحقیقات معروضۂ فدوی کے مدعا علیہ کو سزا مندرجۂ دفعات مذکورہ فرمائی
جاوے کہ آیندہ عزت داران سرکار کوئی مزیل حیثیت کا نہ ہوے۔ زیادہ حد اذب۔

تفصیل ان الفاظ مندرجہ و مشتہرۂ کتاب جس سے ازالہ حیثیت کا ہوا وہ
مع نمبر صفحہ

نمبر صفحہ الفاظ مزیلۂ حیثیت

۱۲ - (صاحب برہان) بایں بیچارہ چہ حرکت ناکردنی کردہ است۔
پیش حاکم وقت رفتہ زخم نہانی خویش وانماید۔

۲۳ - ایں خرعیسٰی نمد زین را بر پشت خود نہادہ است۔

۲۳ - بدشنام پردازم

۲۸ - میان خون حیض غوطہ خورد

۳۸ - گوش از بناگوش بر کنند و بسوراخش میخے زنند

۴۲ - معترض خایہ را چرا گرفت۔ مگر برائے ترکیب ناخورش گرفتہ باشد

۱۷ و ۲۴ - کلال اکبرآبادی دریں جا تمسخر بکار بردہ

۱۸ و ۴۲ - سیلی دگرانیہا را برائے او بنیاد نہند

۵۱ - فصد باید کشاد تا جنونش فرو گردد

۱۸ و ۶۱ - ایں خبطی

۳۰ و ۶۶ - از خرابۂ اکبرآباد بوے بہ دہلی رسیدہ است۔

۷۔ معترض ازیں عضو صد مے دیدہ است

علاوہ اس کے اور بہت جگہ ایسے الفاظ ہیں۔ ملاحظہ کتاب سے واضح رائے عالی ہوں گے۔

عرضی

کمترین عزیزالدین وکیل اسداللہ خاں پنشن دار

سرکار عرف مرزا نوشہ معروضہ ۱۵ دسمبر ۱۸۶۸ء

امین الدین کا بیان

امین الدین۔ نام میرا امین الدین ولد مولوی زین الدین، قوم شیخ، ساکن پٹیالہ، عمر ۵۹ برس، پیشہ مدرسی۔

بیان ہے کہ میں نے ایسا نہیں لکھا کہ جس میں ازالہ حیثیت عرفی مدعی کا ہو۔ یہ کتاب "قاطع القاطع" تصنیف میری ضرور ہے۔

سوال۔ فرد قرار داد جرم تم کو سنائے جاتے ہیں۔ تم مرتکب جرم قرار داد کے ہوئے ہو یا نہیں؟ تمہارا جواب کیا ہے؟ کیونکر صفائی کروگے؟

جواب۔ فرد جرم میں نے سنی۔ جواب یہ ہے۔ اس کتاب میں تین قول ہیں۔ ایک تو محمد حسین مصنف برہان قاطع کا، دوسرا مرزا اسداللہ خاں غالب مصنف قاطع برہان کا۔ تیسرا قول میرا۔ قاطع برہان میں رد کیا برہان قاطع کو اور میں نے تردید کری ہے قاطع برہان کی۔

صفحہ ۱۳ میں جو لکھا ہے یہ برائے مثل ہے۔ سوائے معنی تحت لفظی اور کچھ معنی میں نے نہیں خیال کئے۔ زخم نہانی مراد رنج دلی سے ہے اور دیگر شاعروں نے بھی

یہی معنی لئے ہیں۔ بہت شعر ہیں جن میں الفاظ "زخم نہانی" کو ڈالا ہے اور معنی اس کے رنج دلی کے لئے ہیں۔ سو اب یاد سے شعر پیش کروں گا۔

صفحہ ۲۳ میں جو لکھا ہے "خر عیلٰی نمد الخ" خر کے معنی نادان کے ہیں لفظ عیلٰی حرف بطور مرکب کے ڈالا گیا ہے۔ یہ عبارت جو درج ہے کہ "بدشنام پردازم" معنی یہ ہیں کہ "ساتھ گالی کے مشغول ہوتے ہیں۔" مگر آگے اس کے جو عبارت ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ میں نے درج کیا ہے کہ زبان ایسی خراب کری ہے۔

صفحہ ۲۸ میں جو لکھا ہے کہ "میان خون حیض غوطہ خورد" اس کے معنی یہ ہیں کہ کیوں گناہگار ہوتے ہو اور ..... دیتے ہو (الفاظ پڑھے نہ جا سکے) یہ الفاظ تحت فحل ہے۔ خون حیض کا لفظ عرفی اور.... (الفاظ پڑھے نہ جا سکے) (نے) لکھا ہے اور یہ معنی دیتا ہے کہ کیوں گناہگار ہوتے ہو۔

صفحہ ۳۸ میں جو لکھا ہے لفظ "سوراخ" اور لکھا ہے "گوش از بنا گوش بر کنند" اس کے معنی یہ ہیں کہ کان اکھیڑ دیا کان کے سوراخ میں میخ مارو۔ یہ الفاظ ایسے مقام پر آتے ہیں جب کوئی اعتراض کرتا ہے تو کہا کرتا ہے کہ تمہارے کان اکھیڑے جائیں گے اور تمہارے کان بند کر دئے جائیں گے۔

صفحہ ۴۲ میں جو درج ہے "کلال اکبر آبادی" کلال معنی مست کے لئے ہیں۔ دوسری جگہ لکھا ہے "سیلی دگر اینہا را برائے او بنیاد نہند" اوپر کی عبارت سے شامل کیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ شریک خوشی ہوئے۔

(اوپر کی عبارت یہ ہے۔ مضحکہائے برائے خود آوردہ رقص میونی می نمائید دختر غمزہ درکاری فرماید بزم سور و سرور را ساز دہند و بعد خندہ و بازی و

دسیلی وگرانیہا را برائے او بنیاد نہند)۔

صفحہ ۵۱ میں جو لکھا ہے "فصد باید کشاد تا جنونش فروگردد" یہ الفاظ ایسے مقام پر آتے ہیں کہ جب کوئی اعتراض بیجا کرتا ہے تو کہا جاتا ہے۔ معنی اس کے تحت لفظی ہیں صفحہ ۶۱ میں جو لکھا ہے "خبطی" اس کے معنی بھی یہی ہیں یعنی برگشتگی مزاج صفحہ ۶۶ میں جو لکھا ہے "از خرابۂ اکبر آباد بومے بدہلی رسیدہ است" "بوم کے معنی مدعی نے بھی اپنے قول میں جو اوپر درج ہیں زمین کے لئے ہیں۔ یعنی لکھا ہے کہ "کاش از بوم دکھن دگرے برخیزد" چنانچہ میں نے بھی معنی زمین کے لئے ہیں۔ معنی اس کے یہ ہوتے ہیں کہ زمین اکبر آباد سے ایک شخص آئے ہیں۔

سوال - خرابہ کا مضاف الیہ کون ہے۔

جواب - اکبر آباد بوم ہے اور "ے" بوم کے واسطے تحسین کلام کے ہے نقط صفحہ ۷۰ میں جو لکھا ہے "عضو" میں نے اس کے معنی "خواندن" کے لئے ہیں۔ انھوں نے اپنے کلام میں جو اوپر درج ہے "عضو" کے معنی آلہ تناسل کے لئے ہیں۔ میری مُراد یہ ہے کہ مدعی نے لفظ "عضو" سے کچھ صدمہ اُٹھایا، رنج دیکھا۔ "ازیں" کی ضمیر قریب پر آتی ہے بعید پر نہیں جاتی۔

صفحہ ۱۲۷ میں لکھا ہے کہ "بینی چہ گویم گوشش می برید" اوپر کی عبارت سے ملا کر اس کے معنی ہوتے ہیں کہ اگر حاکم اس تہمت کو دیکھتا تو سزا دیتا۔

صفحہ ۱۴۱ میں لکھا ہے "بضاعت خواجہ ہمیں ازار است ہر کس را نشان می دہد" "ازار" مدعی کے قول میں درج ہے۔ مگر معنی اس کے چادر کے ہیں اور یہی معنی میں نے بھی لئے ہیں۔

صفحہ ۱۴۲ میں لکھا ہے کہ لفظ "خایہ" اس کے معنی بیضۂ مرغ کے ہیں۔
میری مراد یہ ہے (کہ) معترض نے اس ہی لفظ "خایہ" کو بمعنی خصیہ کیوں لیا
مگر واسطے خورش کے بمعنی بیضۂ مرغ لیا ہو۔

صفحہ ۱۶۴ میں لکھا ہے کہ "جستن خرس را یاد کردہ است و رقص
بوزنہ را بہ اظہار آوردہ" اس کے معنی تحت لفظی ہیں۔ مطلب یہ کہ معترض کی
ایسی باتیں یاد کری ہی ہیں کہ "جستن خرس در رقص بوزنہ" کہ بیکار ہیں یاد
کری جاویں۔

صفحہ ۲۰۷ میں ہے "گوش و بینی چرا گوئیم دست خواہد برید و زبان بقفا
خواہد کشید" اس کے معنی لفظی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ معترض نے چوری الفاظ کری
ہے۔ اس کی سزا ملنی چاہئے۔

میں نے یہ کتاب صرف بحث علمی میں چھپوائی ہے۔ گواہ میرے موجود ہیں۔
یہ جواب میرے مواجہ قلمبند کیا گیا ہے۔ اس میں تمام بیان شخص با خود استشہادی صحیح
و درست مندرج ہے۔

امین الدین کے بعد جانبین سے گواہوں کے بیانات لئے گئے مگر امین الدین
والے چست اور غالب والے سُست تھے۔ اس لئے غالب کو آثار بد نظر آنے
لگے اور مقدمہ واپس لینا ہی مناسب سمجھا۔ چنانچہ غالب کے وکیل کی طرف سے
باہم رضامندی کی عرضی داخل کی گئی۔

عرضی

جناب عالی!

جو کہ مجھ مدعی کا مقدمہ بنام مولوی امین الدین بابت ازالہ عرفی حیثیت

حسب منشا دفعہ ۴۹۹ تعزیرات ہند عدالت ہے۔ چنانچہ بہ فہمائی چند گرامی رؤسائے شہر باہم رضامندی ہوئی۔ اب مجھ کو کچھ دعویٰ بابت مقدمہ نہیں۔ مقدمہ داخل دفتر ہو جاوے۔

عرضی

عزیزالدین وکیل مدعی

۲۳ مارچ ۱۸۶۸ء

از پیش گاہ اوبرین صاحب بہادر

مقدمہ خارج اور کاغذات داخل دفتر

برہان قاطع اور قاطع برہان کے متعلق رائیں

مولانا الطاف حسین حالی صاحب فرماتے ہیں کہ ایران کے ایک مشہور مصنف رضا قلی خاں (ہدایت) نے اپنی فرہنگ ناصری[1] کے شروع میں ایک باب فرہنگ جہانگیری فرہنگ رشیدی اور برہان قاطع تینوں کی غلطیوں اور لغزشوں کے بیان میں منعقد کیا ہے اور ایک باب میں صرف قاطع برہان کی غلطیاں ظاہر کی ہیں۔ مثلاً یہ کہ اندلس ایک جزیرہ ہے ایک پہاڑ کے اوپر یا غرناطہ ایک صوبہ ہے ہندوستان کا یا چکاک کے تین معنی ہیں۔ پیشانی، قبالہ نویس اور مہر کن (اور تینوں معنی غلط ہیں) یا کردغ جو ایک قریہ مضافات ہرات میں ہے اس کو برہان میں لکھا ہے کہ "قریہ ایست از قرائے عالم"۔ یہاں از راہ طنز صاحب فرہنگ ناصری نے لکھا ہے:" فی الحقیقت

---

[1] انجمن آرا ناصری

تحقیقِ دقیق فرمودہ است۔" اس نے بہت سی غلطیاں صاحب برہان کی اس باب میں ظاہر کی ہیں اور اس کے سوا اپنی تمام فرہنگ میں جابجا تخطیہ کیا ہے۔ جو اعتراض مرزا نے برہان پر وارد کئے ہیں ان کی بھی جابجا فرہنگ ناصری سے تائید ہوتی ہے۔ ازاں جملہ لفظ آبجیں، استخصر اصطخر، جمدر، باختر، رادش و زاوش، کارکیا، دیژہ وادیژہ اس طرح کے اور بہت سے الفاظ کی تحقیق فرہنگ ناصری کے بیان کے مطابق پائی جاتی ہے اس کے سوا برہان کے بیان کو جہاں مرزا نے بے معنی اور مہمل بتایا ہے رضا قلی خاں بھی اس کو مہمل بتاتا ہے۔ مثلاً انجلک کی تفسیر میں صاحب برہان لکھتا ہے کہ "ہر چند فراش خیال جاروب سنبل بر جل خرسک ریش زند از پوست آں پاک نتواند۔" مرزا اس کی نسبت لکھتے ہیں کہ "فقرہ اخیر مگر از کلام دیو است، ہرگاہ خوبی تحقیق چناں حسن عبارت چنیں باشد، مقصود اصلی کہ معلوم کردن مجہولات است، از برہان قاطع چگونہ حاصل تواں کرد۔" رضا قلی خاں از راہ طنز اس فقرے پر لکھتا ہے "دریں مقام انشائے بدیع و بیان بلیغ زادۂ طبع ایشاں دادہ، برہان ذوق سلیم و سلیقہ مستقیم صاحب برہان ہمیں عبارت است، تا ازیں سپس از وجہ آید۔" اس طرح برہان کی اکثر مہمل عبارتیں نقل کر کے اس پر ہنستا ہے اور کہتا ہے کہ "در ولایت ہند کہ نہ ترکی دانند نہ پارسی ضبط و تصحیح لغات کے تواننذ۔" ایک جگہ صاحب برہان جامع (جو ایک ایرانی ہے) کا قول برہان قاطع کے باب میں نقل کرتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ "برہان قاطع میں لغات بغیر سند اور شواہد کے ذکر کئے گئے ہیں، ان پر اعتبار نہ کرنا چاہئے" اس میں کنایات کو بھی علیحدہ لغت قرار دیتا ہے اور سُریانی و عبرانی و ترکی و

ژند یا ژند کے غیر مستعمل لغات کے بیان اور ایک ایک لغت بار بار مختلف صورتوں سے ذکر کرنے میں تطویل لاطائل کرتا ہے۔" اس کے بعد رضا قلی خاں برہان جامع کی تصدیق اور اس کے ساتھ اتفاق رائے کرتا ہے۔ چونکہ مرزا کی لائف میں یہ بیان بے مزہ معلوم ہوگا اس لئے ہم اس سے قطع نظر کرتے ہیں۔ اگرچہ مرزا نے قاطع برہان میں بعض اعتراض غلط کئے ہیں خصوصاً لفظ " افسوس" کے متعلق ایک بڑی فاحش غلطی کی ہے۔ اس کو لفظ عربی الاصل ماخوذ از "اسف" قرار دیا ہے اور غلطی کا انھوں نے آخر کار خود بھی اعتراف کیا ہے۔ اور عربی الفاظ کی تحقیق سے اپنی لاعلمی ظاہر کی ہے۔ اور ممکن ہے کہ اس کے سوا اور بھی کہیں کہیں ان سے غلطی ہوئی ہو۔ لیکن انصاف سے دیکھا جائے تو قاطع برہان کے دیکھنے سے مرزا کی سلامتی طبع اور ذوق صحیح کا کافی ثبوت ملتا ہے۔ جو رائے کہ انھوں نے محض اپنے وجدان سلیم کی ہدایت سے برہان کی نسبت قائم کی تھی وہی رائے ایران کے محققوں نے اس کی نسبت ظاہر کی ہے اور جو غلطیاں اور خبطیاں مرزا نے برہان قاطع میں بتائی ہیں وہ اور ان کے سوا بے شمار غلطیاں صاحب فرہنگ ناصری نے اس میں نشان دی ہیں۔ اس سے زیادہ ایک ہندوستانی محقق کی سلامتئ طبع کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ (یادگار غالب)

جناب غلام رسول مہر صاحب لکھتے ہیں کہ برہان کے متعلق (رضا قلی خاں) ہدایت نے فرہنگ ناصری کے مقدمے میں جو کچھ لکھا ہے اتمام بحث کے لئے اس کا حوالہ دینا مناسب ہوگا۔ وہ فرماتے ہیں کہ "چہل و پنجاہ سال ازیں پیش فرمانروائے ہندوستان جمعے از فضلائے ایران و سیحان و زردشتیان را

ترتیب و جمع کردہ .... بہ تصحیح برہان مامور ساختہ و بعد رجوع کتب معتبرۂ مختلف لغات برہان تصحیح تنقیح یافتہ" پھر فرماتے ہیں کہ برہان .... میں جو لغات ہیں خالی از خواہد ہیں، "براں اعتبار نشاید و ہر یک از کنایات را لغت علیحدہ شمردہ، لغات غیر مستعمل درس بانی و عربی و ترکی و زند و پازند و کمررات لغت وتبدیلات تطویل لاطائل درمیان آوردہ و فقیر تصدیق می کنم کہ حق بامعترض است"[1] اسکے بعد اس ہنگامے کے لئے کون سی وجہ جواز باقی رہ جاتی ہے جو .... غالب کی قاطع کے خلاف ہندوستان کے دعوٰی داروں نے برپا کیا تھا۔ (ماخوذ از مضمون قاضی عبدالودود (نقد غالب)۔

قاضی عبدالودود صاحب ۔ مہر صاحب کے مذکورہ بالا بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ہدایت اس معارضے سے جو ہند میں برہان کے بارہ میں ہوا واقف تھا یا نہیں اور غالب و حامیان برہان کی کتابیں اس کی نظر سے گذری تھیں یا نہیں اس کے متعلق قطعی طور پر کچھ کہنا ممکن نہیں۔لیکن یہ بات بے خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ اس میں (یعنی فرہنگ ناصری میں) ایک لفظ بھی ایسا نہیں جس سے یہ مترشح ہوتا ہو کہ وہ اس معارضے سے کسی قسم کی آگاہی رکھتا ہے۔ہدایت نے جن اعتراضات کی تصدیق کی ہے وہ غالب کے نہیں، صاحب جامع کے اعتراضات ہیں جو نہایت مجمل واقع ہوئے ہیں اور یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کہ صاحب جامع غالب کے اعتراضات سے واقف ہے۔اس لئے کہ اس کی (یعنی برہان جامع کی) اشاعت قاطع برہان سے کئی سال پہلے ہوئی تھی ۔ غالب کے اعتراضات کا ذکر ان دونوں

---

[1] معترض سے مراد صاحب برہان جامع نہ کہ صاحب قاطع برہان غالب ۔ گ ے برہان جامع ایک دوسری فرہنگ ہے۔

میں نہیں۔ لیکن بیشتر مابہ النزاع لغات موجود ہیں اور ان دونوں کے بالاستیعاب
مطالعہ سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ صاحب جامع اگر مختلف فیہ
امور میں کم از کم نوّے فیصدی برہان کا ہمنوا ہے تو ہدایت کم از کم اسّی فیصدی
میں اس سے اتفاق رکھتا ہے اور برہان اور غالب کے جھگڑے کا فیصلہ ان
دونوں کتابوں پر چھوڑا جائے تو غالب کو بری طرح شکست ہوگی (غالب
بحیثیت محقق مضمون قاضی عبدالودود در نقد غالب از مختارالدین) قاضی
عبدالودود صاحب مزید لکھتے ہیں کہ غالب کا دعوئی ہے کہ اگر تھوڑے سے لغات سے
قطع نظر کی جائے تو برہان محض مہملات کا ایک مجموعہ رہ جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ
وہ اس کے بھی مدعی ہیں کہ مجھے اس کے جملہ اغلاط سے واقفیت ہے اور قاطع میں
سب کا ذکر نہیں کرتا تو صرف اس لئے کہ اغلاط بہت ہیں۔ اس سلسلے میں صرف یہ
کہوں گا کہ برہان ۱۲ × ۹ انچ کے ۸۸۰ صفحات پر مشتمل ہے اور مقدمہ و ملحقات
اس کے علاوہ ہیں۔ قاطع برہان کی اشاعت ۲ (یعنی درفش کاویانی) کا وہ حصہ جس میں
برہان پر اعتراضات ہیں ۹ × ۵½ انچ کے ۱۲۰ صفحوں (۱۹ سطریں فی صفحہ) میں
ہے۔ برہان کے جن لغات پر معترض ہیں وہ ان لغات کا جو برہان میں ہیں پچاسواں
حصہ بھی نہ ہوں گے اور اگر قاطع برہان سے وہ اصولی اعتراض جن کی خواہ مخواہ
تکرار ہوئی ہے اور وہ عبارات جن کی غرض محض استہزا ہے نکال دئے جائیں
تو شاید پچاس صفحے سے زیادہ نہ بچیں۔ برہان خود محقق ہونے کا دعوئی نہیں
کرتا اور یہ انکسار نہیں، حقیقت ہے۔ لیکن اس کی کتاب اتنی لچر بھی نہیں جتنی غالب
اور ان کے معتقدین کا خیال ہے۔ اس سلسلے میں شیرانی کے ایک خط کا اقتباس توجہ طلب

ہے۔ یہ خط میرے (یعنی قاضی صاحب کے) نام ہے اور اقتباس ذیل "غالب" (مصنفہ غلام رسول مہر) میں شائع ہو چکا ہے۔

"غالب کو فن لغت اور اس کی روایات سے کچھ دلچسپی نہیں معلوم ہوتی ورنہ ایک ایسے شخص کو جو ان سے دو صدی قبل گذر چکا ہے اور جس کا دعویٰ ہے کہ میری حیثیت ایک مدون کی ہے نہ موجد کی اپنی طباعی اور ذہانت کا نشانہ نہ بناتے۔ جو اغلاط مرزا صاحب نے برہان کے سر تھوپے ہیں وہی غلطیاں تمام فرہنگ نگار جو برہان کے پیش رو ہیں کر رہے ہیں اور یہ فرہنگ نگار ایک دو نہیں، دو درجن سے زیادہ ہیں جو دسویں، نویں اور آٹھویں صدی ہجری میں گذرے ہیں اور اپنی عمروں کا ایک بڑا حصہ صرف کر کے یہ لغات تیار کئے ہیں۔ اب ایک ناقل اور مرتب پر مرزا صاحب کا غصہ نکالنا محض بیکار معلوم ہوتا۔ برہان قاطع کی قدر اس وقت معلوم ہوتی ہے جب خود ایرانیوں کو اس کا حوالہ دیتے دیکھتے ہیں۔"

زمانہ حال کے ایرانی محققین (قزوینی، بہار، عباس اقبال، نفیس وغیرہ) میں شاید کوئی ہو جو بے تکلف برہان کا حوالہ نہ دیتا ہو۔ معاصر غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا اس کا قلمی نسخہ اب تک موجود ہے اور ایران میں دساتیری الفاظ کا رواج اس کی بدولت ہوا۔ شیرانی کے قول کے بموجب ایرانی تو برہان کی قدر کرتے ہیں لیکن بعض ہندی اور پاکستانی مداحان غالب یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ایرانی غالب کے ان اعتراضات کی جو انھوں نے برہان پر کئے ہیں تصدیق کرتے ہیں (مضمون قاضی عبدالودود۔ غالب بحیثیت محقق۔ نقد غالب مرتبہ مختار الدین)

شیخ محمد اکرام صاحب لکھتے ہیں کہ ۱۹۵۲ء میں سفر ایران کے دوران ہم نے دیکھا کہ اب بھی برہان قاطع کی وہاں بڑی قدر ہے۔ اس کے نئے نئے اڈیشن شائع ہو رہے ہیں اور غالب کی قاطع سے ایران میں کوئی واقف نہیں۔ (حیات غالب)

مولانا حالی اور غلام رسول مہر صاحب چونکہ غالبیے ہیں اس لئے صرف انھیں باتوں کو رنگ و روغن کے ساتھ پیش کیا ہے جو غالب کی موافقت میں ہیں۔ علاوہ اس کے کچھ گڈ مڈ کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب کا بیان نقادانہ، محققانہ اور وسیع و دقیق مطالعوں کا نتیجہ ہے۔ ان کا مضمون "غالب بحیثیت محقق" جو مختار الدین آرزو کی مرتبہ کتاب "نقد غالب" میں شامل ہے پڑھیے تو حقیقت کا پتہ چلے۔ اکرام صاحب نے خود ایران میں رہ کر برہان قاطع کی قدر ایران میں دیکھی ہے۔ اگر برہان اتنی لچر فرہنگ ہے کہ اس کا اعتبار نہیں کرنا چاہئے تو ایران میں اس کے نئے نئے اڈیشن کیوں شائع ہو رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ صاحب برہان جامع نے کسی خاص موقعہ پر کسی خاص لفظ یا الفاظ کے بارہ میں کہا ہوگا کہ "براں اعتبار نشاید" لیکن غالب پرستوں نے غالب پرستی کے تحت اس کو پوری کی پوری برہان پر منطبق کر دیا۔ برہان قاطع میں غلطیاں ضرور ہیں اور بعض غلطیاں سنگین بھی ہیں۔ مگر کون سی فرہنگ ایسی ہے جو غلطیوں سے تمام تر پاک ہے۔ ہر فرہنگ میں غلطیاں موجود ہیں لیکن کسی میں زیادہ کسی میں کم اور کسی میں بہت کم۔ موید برہان مصنفہ مولوی احمد علی پڑھیے تو غالب کی قاطع برہان کے اعتراضات کا حال کھلے۔

اب ذرا برہان قاطع کے بارہ میں ایرانی اہل علم و نظر کے خیالات ملاحظہ ہوں۔ رضا قلی خاں ہدایت اپنی فرہنگ انجمن آرائے ناصری کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ نسختی از

آں (یعنی برہان قاطع) نیز نزد فقیر موجود و مشہود است۔ صاحب برہان جامع (یعنی محمد کریم بن مہدی قلی تبریزی) نوشتہ کہ برہان قاطع لغات را خالی از شواہد ذکر کردہ و برآں اعتبار نشاید و ہر یک از کنایات را لغت علٰحدہ شمردہ و لغات غیر مستعمل از سریانی و عبرانی و ترکی و زند و پازند و مکررات لغت و تطویلات لاطائل درآوردہ و فقیر تصدیق می کنم کہ حق با معترض است، چہ نگارش بے نظم جوارش بے طعم است و کلام بے وزن طعام بے ملح۔

برہان جامع میری نظر سے نہیں گذری۔ لغات نامہ مولفہ علی اکبر دہخدا میں لکھا ہے کہ برہان جامع تدوین محمد کریم بن مہدی قلی تبریزی است۔ وی در در مقدمہ گوید:"... چوں احتیاج بلغت فارسی بسیار است و تحصیل لغات مبسوط باکثر ناس غیر مقدور و دشوار و لغتہائے مختصر ناتمام و مایۂ انتظار ست و مع ہذا برہان (قاطع) کہ جامع ترین کتب ایں فن است باآں بسط و تطویل ایں عیب را دارد کہ خالی از شواہد است و ہر یک از کنایات لغت علٰحدہ نوشتہ و مشتمل است بر لغت ہائے غیر مستعمل و نامانوس از یونانی و سریانی و زند و پازند و ترک کہ اصلا مستعمل نیست و ہمہ موجب تطویل لاطائل و فرہنگ جہانگیری نیز باآں طول و تفصیل بسیارے از لغت ہا ترکی و آنچہ نوشتہ معانی آنہا را تمام ننوشتہ مثلاً لغتی کہ پنج معنی دارد سہ و چہارش نوشتہ۔ لہٰذا بتوفیق سبحانی ہمت نمودہ مجموع لغات مستعملہ برہان را ملخص و مختصر و قدری از شواہد فرہنگ جہانگیری در حاشیہ و کنایات ہر لفظ را ذیل آں درج نمودہ و حشو و زواید را ترک کردہ۔ بحمد اللہ کتابی شد مفید و مختصر و جامع و سہل المأخذ و مقبول الکل و نافع۔

صاحب برہان جامع کے منقولہ بیانات کی روشنی میں دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ فقرہ "خالی از شواہد" کے بعد "اعتبار براں نشاید" کا فقرہ نہیں ہے۔ رضا قلی خاں اپنے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ "محمد حسین ابن خلف التبریزی کہ شورش دیدہ و شنیدہ نگر دیدہ برہان تخلص داشتہ۔ شواہد فرہنگہائے راکہ مقوی و مصدق معنی لغت است ترک کردہ۔" لفظ "ترک کردہ" سے ثابت ہوتا ہے کہ صاحب برہان قاطع نے شواہد دیکھے ہیں مگر ان کو ترک کر دیا ہے۔ لہٰذا "اعتبار براں نشاید" کا فقرہ کوئی وزن نہیں رکھتا۔ دوسری زبانوں کی فرہنگوں میں بھی شعرا کے کلام سے شواہد و اسناد کے بغیر الفاظ کے معنی لکھے ہیں۔ چیمبرس اور آکسفورڈ انگریزی زبان کی دو مشہور و مقبول اور معتبر فرہنگیں ہیں۔ مگر ان میں معانی کے ساتھ ساتھ شواہد کہاں ہیں۔ اصل چیز معانی کی تحقیقات ہیں۔ شواہد پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔

دوسری بات یہ کہ صاحب برہان جامع نے صاف صاف لفظوں میں کہدیا ہے کہ برہان جامع برہان قاطع کا وہ نیا نسخہ ہے جس سے اصل کتاب کے حشو و زوائد کو چھانٹ دیا گیا ہے اور حاشیہ میں فرہنگ جہانگیری سے اخذ کر کے کچھ شواہد درج کر دیے گئے ہیں۔ اب اگر صاحب برہان جامع کی نظر میں برہان قاطع قابل اعتبار نہیں تو اس کو ملخص و مختصر کر کے کیوں پیش کیا۔ اس سے بالکل واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ صاحب برہان جامع کا اصل اعتراض تطویل پر ہے اور اگر اعتبار نشاید کہا بھی ہوگا تو ان معدودے چند غیر زبانوں کے الفاظ کے بارہ میں کہا ہوگا جو فارس میں غیر مستعمل اور نامانوس ہیں۔

موجودہ دور کے جلیل القدر فاضل علامہ علی اکبر دہخدا متوفی ۱۳۳۴ھ ہجری

شمسی کی فرہنگ لغات نامہ مطبوعہ دانش گاہ تہران میں برہان قاطع سے متعلق مفصل بحث موجود ہے۔ اس طویل بحث سے چند اقتباسات درج کئے جاتے ہیں جن کے پڑھنے سے اندازہ لگ سکے گا کہ بہت سارے نقائص و اغلاط کے باوجود ایرانی اہل علم و نظر کی نظر میں برہان قاطع کی اہمیت کس قدر ہے۔

"کتاب برہان (قاطع) در میان کتب فرہنگ دارای مزایا و خصائص چند است و ہمچنیں مورد اعتراضات و انتقادات عدیدہ است۔ نخست در ہندوستان و سپس در ایران شہرت و آوازہ عظیم حاصل نمود و غزارت محتویات و کثرت مواد آن را محل توجہ محققین و فضلا قرار داد۔ بعض از دانشمندان از طرف بہ معائب و اغلاط آں متوجہ شدند۔"

"اقبالی کہ مردم ایران و ہندوستان بکتاب برہان قاطع نمودہ اند از آنجا معلوم است کہ آں کتاب بحد وفور در ایران استنساخ شدہ دیگر کتابہائے مصنفین مانند جہانگیری و سروری وغیرہ تحت الشعاع قرار داد و کمتر کتاب خانہ در ایران و فرنگستان و ہندوستان یافت می شود کہ نسخ متعدد خطی از برہان (قاطع) درآں موجود نباشد۔"

"نظر بجامعیت و شہرت برہان قاطع ہمہ فرہنگہائے فارسی کہ پس از آں تالیف شدہ اند ایں کتاب را ماخذ عمدۂ داد و مطالب آں را نقل کردہ اند۔ از آں جملہ فرہنگہائے ذیل می تواں نام برد۔

از فرہنگہائے فارسی بفارسی۔ انجمن آرائے ناصری تالیف رضا قلی خاں ہدایت، فرہنگ آنند راج تالیف محمود پادشاہ متخلص بہ شاد، فرود سار (یا فرہنگ

نفیسی) تالیف دکتر علی اکبر نفیسی (ناظم الاطبا)، لغات نامہ تالیف علی اکبر دہخدا

از فرہنگہاے فارسی بزبان دیگر- فرہنگ فارسی لاتینی فورس و فرہنگ فارسی و عربی بانگلیسی جانسن و فرہنگ فارسی بانگلیسی استینگاس و فرہنگ فارسی بفرانسہ ومزن و لغت فارسی بترکی یا فرہنگ ضیار۔"

سید احمد عاصم عنتابی از فاضلان عثمانی در اوایل قرن سیزدہم ہجری برہان قاطع را بترکی ترجمہ و مراجعہ بفرہنگہاے معتبر برخی از اغلاط آں را اصلاح کرد و مقداری لغت برآں افزود و آنرا بنام "تبیان نافع" انتشار داد۔"

"مرحوم محمد علی تربیت کتاب شناس معروف کہ نسخ فارسی بسیار دیدہ و جمع کردہ بود و کتاب "دانشمندان آذربیجان" در ضمن شرح احوال مولف (برہان قاطع) مجملی دریں باب اشارہ کردہ گفتہ است" برہان قاطع جامع ترین فرہنگہای فارسی است و مولف آں بعضے کلمات اجنبی وغیر فارسی را نیز کہ در نظم و نثر فارسی معمول بود و ہست ہمہ را جمع آوری کردہ و دریں مجموعہ مندرج ساختہ است ولی مانند سائر فرہنگہا محتاج تنقیح و تصحیح است و لذا بعضے از ادباے نامی مانند غالب دہلوی وغیرا و درخصوص حواشی و تعلیقات عدیدہ بعناوین مختلف مثل قاطع برہان و دافع ہذیان و محرق قاطع و تیغ تیز و تیغ تیز تر وغیر آنہا مشتمل براد و انتقاد یکدیگر نوشتہ و نشر کردہ اند (لغات نامہ علی اکبر دہخدا)"

"مرحوم محمد علی تربیت مزید لکھتے ہیں کہ از روی انصاف بسیاری ازیں اعتراضات بر صاحب برہان وارد است و اشتباہات و سہوہاے عظیم و متعدد مرتکب شدہ و لے چوں ما امروز در مقام بحث انتقادی نیستیم بلکہ مقصود ما ذکر جمیل

وے (یعنی صاحب برہان قاطع) و تقدیم سپاس نسبت بخدمت بزرگی کہ انجام کردہ میباشد از باب تتمیم فائدہ فقط بذکر چند نمونہ و شاہد از آں اشتباہات مطابق یادداشتہاے بعض اسانید محترم مانند آقامی فروزاں فرو آقاے ہمائی در ختم ایں مقال اکتفامی کنیم تا معلوم شود کہ ایرادات و اعتراضات بر ایں کتاب چگونہ و از چہ مقالہ ای است۔"

محمد علی تربیت کے اس بیان پر ڈاکٹر محمد معین پروفیسر دانشکدہ تہران لغات نامہ کے ذیلی حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ در انواع ایں معائب ہمہ فرہنگ نویسان۔ کمابیش۔ شرکت دارند حتی لغت فرس اسدی (ر۔ک سلسلۂ مقالات بقلم علامہ علی اکبر دہخدا در مجلہ یغما سال سوم شمارہ ہشتم بہ بعد عنوان "چند نکتہ در تصحیح لغت فرس اسدی")

"محمد علی تربیت صاحب چھ اقسام کے نقائص دکھانے کے بعد لکھتے ہیں کہ بزرگترین نقصہ ای کہ در کتاب موجود است حذف شواہد است کہ برخلاف سائر فرہنگ نویسان متقدم کہ بعد از اشعار و ابیات شعرا استشہاد کردہ اند وی (یعنی صاحب برہان قاطع) براے ہیچ لغتے ذکر شاہد و مثال نمودہ است۔ گرچہ ظاہر امر دلالت می کند کہ وی در ابتدا شواہد درست داشتہ است وے بعد از بیم آنکہ کتاب وے حجیم و ضخیم گردد آنہارا حذف کردہ است چنانکہ خود در مقدمہ می گوید۔"

محمد علی موصوف مثال کے طور پر اغلاط کے چند نمونے پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ایں بود نمونہ و مثالے چند از انواع اغلاط و سہوہاے کہ صاحب برہان قاطع را روے دادہ و از یں مقولہ در کتاب او بفراوانی یافت می شود ولی چوں مقصود ما ازیں مقال ذکر خیر از صاحب آں فرہنگ است کہ بزرگترین فرہنگہاے لغت فارسی شمردہ می شود و در صدد انتقاد یا تصحیح اغلاط او نیستیم ہمیں مختصر اکتفا می رود و نباید

توقع داشت کہ کتاب برہان قاطع فرہنگے باشد درعرض یا شبیہ بکتابہائے لغت کہ امروزہ علمائے فیلولوژی باسبک وروش جدید می نویسند۔ باید دانست در سی صد سال قبل مردے ایرانی در یکے از بلاہندوستان داشتن معلومات معمول آں عصر و با وسائل و اسباب محدود نگاشتہ و بقدر امکان از لغات و کلمات مختلفہ کہ در زبان فارسی رواج داشتہ است دراں جمع کردہ وکتاب وے از مرتبۂ معلومات وادب متداول عصر و زمان او پائین ترنیست۔"

ایرانی لغت نویسوں "محققوں" ناقدوں اور اہل الرائے کے اقوال وبیانات نظر کے سامنے ہیں۔ دیکھئے انھوں نے برہان قاطع پر قلم اُٹھایا تو بالکل علمی خدمات اور اور تحقیقات کے جذبے سے اُٹھایا۔ یہی وجہ ہے کہ معائب کے ساتھ ساتھ کھلے دل سے برہان قاطع کے محاسن اور اہمیت کو بھی ظاہر کیا ہے اور صاحب برہان کا جہاں بھی ذکر کیا تو عزت و عظمت کے ساتھ۔ برخلاف ان کے غالب نے اچھے دل و دماغ کا ثبوت نہیں دیا۔

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ رشکِ فارسی

گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سُنا کہ یوں

30 4

غالب کی اُردو شاعری

غالب کی اُردو شاعری کو دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ دورِ اوّل ناکامی اور نامقبولیت کا اور دَورِ ثانی کامیابی اور مقبولیت کا دَور ہے جو کبھی ختم نہ ہوگا۔ غالب کے دَورِ اوّل کا کلام کچھ اس ڈھب کا ہوتا تھا کہ غالب مہمل گو مشہور ہو گئے تھے اور نو بنو طریقوں سے ان کا مذاق اُڑایا جاتا تھا۔ مفتی صدرالدین آزردہ جو غالب کے دوستوں اور خیر خواہوں میں تھے۔ غالب کا کلام سُن کر منہ بناتے تھے۔ بعض لوگ کہتے تھے آج شعر کہا ہے کل معنی پہنائیں گے۔ آغا جان عیش غالب کے معاصر تھے۔ انھوں نے اجمیری دروازے کے مشاعرے میں غالب کی موجودگی میں یہ قطعہ پڑھ دیا۔[1]

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اِک کہے اور دوسرا سمجھے

کلامِ میرؔ سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے
مگر اِن کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خُدا سمجھے

مولوی عبدالقادر رامپوری نے بھی ایک دفعہ بڑے دلچسپ انداز میں غالب کے کلام کا مذاق اُڑایا۔ انھوں نے غالب کا نیاز حاصل کرکے کہا کہ قبلہ! آپ کا ایک شعر سمجھ میں نہیں آتا۔ غالب نے پوچھا کون سا شعر؟ کہا۔

پہلے تو روغن گُل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہو کل بھینس کے انڈے سے نکال

---

[1] مطالعۂ غالب۔

یہ شعر سُن کر غالب متحیر ہوئے اور کہا یہ شعر تو میرا نہیں ہے۔ مولوی عبدالقادر صاحب بولے کہ نہیں حضور! یہ شعر آپ ہی کا ہے۔ آپ کے دیوان میں موجود ہے۔ اب غالب سمجھ پائے کہ یہ حضرت اس انداز میں اعتراض کر رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تمھارے دیوان میں اس قسم کے مہمل اشعار ہیں۔ (یادگار غالب)

یہ تو ہیں غالب کے اشعار کے متعلق غیروں کے خیالات لیکن خود غالب نے اپنے ایک شعر میں اپنے کلام کے بارہ میں جو خیال ظاہر کیا ہے اس کی سرحد معترضین کے خیالوں کی سرحد سے جا ملتی ہے۔ کہتے ہیں۔

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

غور فرمائیے کہ مدعا عنقا ہے۔ اب اگر لاکھ کوششوں کے بعد بھی تقریر کا مدعا سمجھ میں نہ آئے تو ایسی تقریر کو مہمل سمجھنا بیجا نہیں۔ عنقا ایک موہوم (یا معدوم) چڑیا ہے جس کا کوئی وجود نہیں۔ لیکن غالب نے یقیناً اپنے کلام کو مہمل نہیں کہا ہے۔ ان کا مطلب ہے کہ ان کا کلام اس قدر بعید الفہم ہوتا ہوتا ہے کہ اس کا سمجھ لینا قریب قریب نا ممکن ہے۔ منقولہ بالا شعر جس غزل کا ہے۔ اس کا مطلع ملاحظہ کیجئے۔ فرماتے ہیں۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

خود غالب نے اس شعر کا جو مطلب بیان کیا ہے اگر تمام مستعملہ الفاظ کے لغوی و اصطلاحی معنی پیش نظر رکھے جائیں تو وہ مطلب تشفی بخش نہیں ہوتا۔ یہ

بات بے تامل کہی جاسکتی ہے کہ جو بات غالب کہنا چاہتے تھے کہہ نہ پائے۔
شارحین کلام اس شعر کو معنی پہنانے کے لئے بعض الفاظ مثلاً شوخیٔ تحریر کا وہ مفہوم
لیتے ہیں جو ان کا مفروضہ ہے۔ اگر الفاظ کے معنی کچھ اور ہوں اور لئے جائیں کچھ اور
تو مجذوب کا بڑ بھی بے معنی نہیں۔ اس شعر کے معنی بتاتے ہوئے خود غالب نے شوخیٔ
تحریر کا مطلب گول کر دیا اور "نقش کس کی شوخیٔ تحریر کا فریادی ہے کہ صورت
تصویر ہے" کہہ کر نکل گئے۔ یہ واضح نہیں کیا کہ "شوخیٔ تحریر" کیا بلا ہے۔ یاد آتا ہے
کہ کسی نے لکھا ہے کہ فقط قافیہ کی ضرورت پوری کرنے کے لئے "تحریر" کا لفظ ٹھونس
دیا ہے۔ نظم طباطبائی نے بہت کچھ معنی بتانے کے بعد شعر کو مہمل بتایا ہے۔ مگر جوش ملیانی
کو افسوس ہے کہ اس شعر کو مہمل کیوں کہا جاتا ہے۔

صرف اسی ایک شعر پر منحصر نہیں، غالب کے دور اول کے اکثر اشعار اس شعر
سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔ غور کرنے کی بات ہے کہ غالب کے دور اول کا کلام کس ڈھب
کا ہوتا تھا اور کیوں ایسا ہوتا تھا کہ لوگ انھیں مہمل گو کہہ کر ان کا مذاق اُڑاتے تھے۔
ابتدائے ریختہ گوئی میں غالب بیدل عظیم آبادی سے بہت متاثر تھے۔ مرزا بیدل ایک
عظیم الشان ہندی نژاد فارسی شاعر تھے۔ غالب بیدل کی نکتہ پردازی سے اس قدر
مرعوب اور ان کی "بہار ایجادی" سے اس قدر مسحور ہوئے کہ ان کی اندھا دھند تقلید
شروع کر دی۔ کہتے ہیں۔

اسدؔ ہر جا سخن نے طرح باغِ تازہ ڈالی ہے
مجھے رنگِ بہار ایجادیٔ بیدل پسند آیا

آہنگ اسدؔ میں نہیں جز نغمۂ دل   عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

لیکن بیدل کی تقلید کرتے وقت غالب کو اتنا بھی ہوش نہ رہا کہ وہ کس زبان میں شاعری کر رہے ہیں اور اس زبان کا مزاج اور تیور کیسا ہے۔ بیدل کی اندھا دھند تقلید کے زیر اثر غالب کو "سخن سادہ" مرغوب نہ تھا۔ وہ پیچیدہ بیانی کے دلدادہ تھے۔ کہتے ہیں۔

سخن سادہ دلم را نہ فریبد غالب
نکتۂ چند ز پیچیدہ بیانی بمن آر

لیکن پیچیدہ بیانی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ یہ کیا پیچیدہ بیانی ہے کہ پورے شعر میں صرف ایک لفظ ہندی کا ہے جو اُردو کی بنیادی زبان ہے۔ غالب کے حریفانِ سخن یعنی ذوق، مومن وغیرہ جبکہ اُردو زبان کو صاف وسلیس، لطیف و شگفتہ اور بامحاورہ بنا رہے تھے غالب پیچیدہ بیانی اور نامانوس اور بوجھل تراکیب فارسی سے اپنی بھی اور اُردو زبان کی بھی مٹی پلید کر رہے تھے۔ وہ ایسی دقیانوسی زبان میں اشعار کہتے تھے جن کو نہ تو فارسی کے اشعار کہا جا سکتا تھا اور نہ اُردو کے۔ مثل مشہور ہے۔ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ یہ اُردو زبان کے اشعار کیونکر ہیں۔

بشغلِ انتظارِ مہوشاں در خلوتِ شبہا
سرِ تارِ نظر ہے رشتۂ تسبیحِ کوکب ہا

کرے گر فکر تعمیرِ خرابیہائے دل گردوں
نہ نکلے خشت مثلِ استخواں بیرون قالب ہا

عبادتِ ہائے طعن آلودِ یاراں زہرِ قاتل ہے
رفوئے زخم کرتی ہے بنوکِ نیشِ عقرب ہا

کرے ہے حسنِ خوباں پر دے میں مشاطگی پیدا
کہ تہ بندی خط سبزۂ خط در تہِ لب ہا

فنا کو عشق ہے بے مقصداں حیرت پرستاں ہے
نہیں رفتارِ عمرِ تیز رو پابندِ مطلب ہا

اسد کو بت پرستی سے غرض درد آشنائی ہے
نہاں ہیں نالۂ ناقوس میں درپردہ یارب ہا

عرضِ نیازِ شوخیٔ دنداں برائے خندہ ہے   دعویٔ جمعیتِ احباب جائے خندہ ہے
ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل   یک جہاں زانو تامل در قفائے خندہ ہے
کلفتِ افسردگی کو عیشِ بے تابی حرام   ورنہ زنداں در دلِ افسردہ برائے خندہ ہے
سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں   دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

شب کو تھی کیفیتِ محمل بیادِ روئے یار   ہر نظر داغِ مے، خالی لبِ پیمانہ تھا
داغِ مہرِ ضبط بیجا مستیٔ سعیٔ پسند   دود مجمر لالہ ساں در دتہِ پیمانہ تھا
وصل میں بخت رسائے سنبلستاں گل کیا   رنگِ شب تہ بندیٔ دودِ چراغ خانہ تھا
دو، کہ آج اس کے ماتم میں سیہ پوشی ہوئی   وہ دلِ سوزاں کہ کل تک شمعِ ماتم خانہ تھا

اے اسدؔ رویا جو دشتِ غم میں میں حسرت زدہ
آئینہ خانہ ہجومِ اشک سے ویرانہ تھا

اس میں کوئی شک نہیں کہ بیدل کی تقلید میں جو اشعار ہوتے تھے وہ بہت مرعوب کن ہوتے تھے۔ لیکن اس قسم کے اشعار میں تین عیبوں میں سے کم سے کم ایک ضرور ہوتا تھا۔ یا تو شعر کا مطلب بطنِ شاعر میں رہتا تھا یا اس قدر بعید الفہم کہ لاکھ سر کھپانے پر بھی مطلب ٹھیک سمجھ میں نہیں آتا تھا یا شعر تو بہت بھاری بھر کم مگر مفہوم اس قدر معمولی ہوتا تھا کہ دماغ کھپا کر معنی سمجھنے والے کے منہ سے لاحول نکل پڑتا تھا کہ بیکار دماغ کھپایا۔ غالب کی شاعری کا یہ دور ان کی ناکامی اور نامقبولیت کا دور ہے۔ ان کے مقابلے میں ان سے بہت کمتر درجے کے شاعر مقبول ہو رہے تھے۔ ذوق و مومن کا طوطی بول رہا تھا۔ ذوق بادشاہ کا استاد اور ملک الشعرا بنے ہوئے تھے۔

اس دور میں غالب لوگوں کے طعنوں کی وجہ سے بہت کبیدہ خاطر رہا کرتے تھے اور وہ اپنی تسلّی کے لئے کہا کرتے تھے۔

نہ ستائش کی تمنّا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

جس وجہ سے غالب کی یہ نامقبولیت تھی آخر وہ غالب کی سمجھ میں آئی۔ غالب نے بعد کو بیدل کی تقلید ترک کر دی۔

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا اسداللہ خاں قیامت ہے

یعنی غالب کو محسوس ہوا کہ طرز بیدل میں اُردو شعر کہنا مشکل ہے۔ لہٰذا انھوں نے بیدل کی تقلید چھوڑ دی۔ لیکن میرے خیال میں ترک کی اصل وجہ یہ نہیں کہ بیدل کی تقلید غالب کے بس کی بات نہ تھی۔ ان کے کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ بیدل کی تقلید ایسی مشکل ہے کہ میں تقلید میں ناکام ہو رہا ہوں بلکہ یہ مطلب ہے کہ کام بہت دشوار ہے۔ لہٰذا بیدل کی تقلید ترک کرنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ غالب کو محسوس ہو گیا کہ بیدل کی تقلید اور طرز بیدل میں ان کا جو اُردو کلام ہوتا تھا وہ ایسے دقیانوسی جامۂ الفاظ و بیان میں ملبوس ہوتا تھا کہ ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیے جانے کے قابل ہوتا تھا۔ لیکن غالب اب اپنی شاعرانہ صلاحیت، فنکارانہ استعداد اور خُداداد ذہانت کو ایسے کام میں صرف کرنا نہیں چاہتے تھے کہ زمانہ جس کو رد کر دے گا اور اس کے ساتھ ساتھ خود غالب کو بھی رد کر دے گا۔ یہ سمجھ ان کو اپنے معاصرین کی مقبولیت دیکھ کر آئی۔ اس سمجھ کا آنا تھا کہ انھوں نے بیدل کی تقلید ترک کر دی اور میر اور مومن کا اثر قبول کر کے ایک مخصوص رنگ میں جو ان کا

انفرادی رنگ سے شعر کہنے کی کامیاب کوشش کرنے لگے۔ اس مبارک کوشش کے ساتھ غالب کی کامیابی اور مقبولیت کا دور شروع ہوتا ہے۔ غالب میرؔ کو اُستاد مانتے ہی تھے لیکن جہاں تک طرزِ غزل کا تعلق ہے مومنؔ کے اس شعر نے

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

غالب کے دل و دماغ میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ غالب اس شعر سے بیحد متاثر ہو کر کہا کرتے تھے کہ مومن خاں میرا پورا دیوان لے لے اور مجھے یہ شعر دیدے۔ مومن خاں نے نہ تو یہ شعر دیا اور نہ غالب کا دیوان لیا لیکن اس شعر نے غالب کے رنگِ سخن کو بدل دیا۔ اب غالب کا کلام بھی صاف و سادہ اور سلیس ہونے لگا۔ چنانچہ مومن کا مذکورہ شعر سُن کر جو حال غالب کا ہوا غالب کا ایک صاف و شستہ شعر سُن کر ان کے ازلی معترض صدرالدین آزردہ کا وہی حال ہوا۔

ایک واقعہ سُنیئے۔ مولانا حالی یادگارِ غالب میں لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ احباب کی نشست تھی۔ آزردہ بھی موجود تھے۔ ایک صاحب نے یہ شعر سُنایا۔

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

اس شعر کو سُن کر آزردہ ایک دم پھڑک اُٹھے۔ خوب خوب داد دی۔ متحیر ہو کر پوچھا۔ شعر کس کا ہے۔ سُنانے والے نے بتایا کہ مرزا غالب کا۔ غالب کا نام سُن کر آزردہ جھینپ گئے اور کہا کہ "اس میں مرزا کی تعریف کیا ہے، یہ تو خاص ہماری طرز کا شعر ہے۔"

بہرحال غالب کی دورِ ثانی کی غزلیات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ

جو غالب سخن سادہ کی بجائے پیچیدہ بیانی کو اپنا مایۂ ناز سمجھتے تھے اور اس میں کمال دکھانا اپنا کمال سمجھتے تھے وہی غالب سیدھی سادی زبان میں معرکۃ الآرا غزلیں بھی کہہ سکتے تھے اور اپنی غالبانہ شان اور فکری بلندیوں کو ہاتھ سے جانے بھی نہیں دیتے تھے۔ ان شعروں کو نمونۂ کلام کے طور پر ملاحظہ فرمائیے۔

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

حضرتِ ناصح گر آویں دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھاویں گے کیا

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

درد منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

تقدیر باندازۂ ہمت ہے ازل سے
ہے آنکھ میں وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی، ابھی تر نہ ہوا تھا

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پر خار دیکھ کر

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

لو وہ بھی کہہ رہے ہیں کہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں — خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا — رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید — مسجد ہو، مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

وفا کیسی، کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا — تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالب — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

جلوہ سازِ آتشِ دوزخ ہمارا دل سہی — فتنۂ شورِ قیامت کس کے آب و گل میں ہے

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی — دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

موت کا ایک دن معین ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی — موت آتی ہے پر نہیں آتی

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں — کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل — جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو وہ لہو کیا ہے

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے — بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

یہ امر واقعہ ہے کہ آج غالب اپنے صاف و شستہ اردو کلام کی وجہ سے زندۂ جاوید اور مقبول عام شاعر ہیں۔ دنیا میں ایسے بھی لوگ ہوئے ہیں جو غالب کو دنیا کا سب سے بڑا شاعر مانتے ہیں۔ اردو ہفتہ وار آرزو ہند کلکتہ کے شمارہ مورخہ ۲۵ مئی ۱۹۶۰ء میں جی ایم طاہر صاحب لکھتے ہیں کہ "آج سے چالیس سال پہلے جرمنی کے مشہور شاعر و فلاسفر گوئٹے کے ایک انگریز شاگرد رابرٹ صاحب ہندوستان میں انگریزی زبان کی مشہور عالم شاعرہ بلبل ہند سروجنی نائیڈو صاحبہ سے ملے اور فرمائش کی کہ مجھے ہندوستان کے سب سے بڑے شاعر کے مزار کی زیارت کرایئے۔ نائیڈو صاحبہ

موصوف کو دہلی کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے اُستاد حضرت ابراہیم ذوق کے مزار پر لے گئیں اور فرمایا کہ ہندوستان کے سب سے بڑے شاعر ذوق کا مزار ہے۔ رابرٹ صاحب بولے "مگر میں نے سُنا تھا کہ ہندوستان کا سب سے بڑا شاعر غالب ہے" اس پر نائیڈو صاحبہ بولیں "افسوس ہے کہ آپ مجھے غلط سمجھے۔ اگر آپ یہ کہتے کہ مجھے دُنیا کے سب سے بڑے شاعر کا مزار دیکھنے کا اشتیاق ہے تو میں آپ کو غالب کے مزار پر لے چلتی"

چیکوسلوکیہ کے ڈاکٹر ژان ماریک کہتے ہیں کہ غالب یقیناً دُنیا کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ لیکن ان کو سمجھنا زیادہ مشکل ہے (غالب۔ تصویر کا دوسرا رُخ۔ تجسس اعجازی کا مضمون)

دُنیا غالب کو دُنیا کا سب سے بڑا شاعر مانتی ہے یا نہیں یہ تو نائیڈو صاحبہ اور ژان ماریک صاحب ہی بتا سکتے ہیں۔ لیکن اُردو کے تقریباً سبھی نقاد غالب کو میر تقی میر سے کمتر مانتے ہیں۔ مگر غالب کو بھی میر تقی میر سے برتر ماننے والے موجود ہیں۔ غالب کو میر تقی میر سے برتر ماننے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ غالب کا اُردو دیوان مختصر و منتخب ہے۔ لہٰذا غالب کے کلام کے مختصر بلکہ سرسری مطالعہ ہی سے غالب کی حیثیت کا پتہ چل جاتا ہے۔ لیکن میر کا دیوان بہت ضخیم ہے۔ اس میں غیر معمولی کے علاوہ معمولی وغیرہ فلسفیانہ اشعار کی بھی بہتات ہے۔ اس لئے میر کے کلام کا مختصر مطالعہ کرنے والے غلط فیصلہ کر سکتے ہیں۔ بہر حال غالب دُنیا کے سب سے بڑے شاعر ہوں یا نہ ہوں دُنیا کے عظیم ترین شاعروں میں ضرور ہیں۔

غالب کی اُردو شاعری پر ایک بڑا الزام یہ ہے کہ اس میں اوریجنل خیالات

بہت کم اور ماخوذ خیالات زیادہ ہیں۔ بالفاظ دیگر غالب پر سرقے کا الزام بھی عائد ہوا ہے۔ یعنی انھوں نے عرفی، ظہوری، نظیری، صائب، حزیں، بیدل اور میر تقی میر سے خصوصاً اور دیگر اساتذۂ عجم سے عموماً استفادہ بحد سرقہ کیا ہے۔ یہ الزام ان کے فارسی کلام پر بھی ہے۔ غالب نے اس مشہور الزام کا جواب یہ دیا ہے۔

ہزار معنیِ سرجوش نطقِ خاص من است | کز اہلِ ذوق دل و گوے از عسل بردست
ز رفتگان بیکے ار توارد م افتاد | ہدانکہ خوبیٔ آرائشِ غزل بردست

یعنی میں نے ہزاروں ارجنیل خیالات پیش کئے ہیں جنھوں نے اہل ذوق کا دل موہ لیا اور شہد پر سبقت لے گئے۔ البتہ اگر شعرائے متقدمین میں سے کسی سے توارد ہو گیا تو یہ نہ سمجھو کہ میں نے غزل کی خوبی بھی ان ہی سے لی ہے، خوبیٔ غزل تو میری اپنی چیز ہے۔ اور سنئے

گماں مبر کہ توارد یقیں شناس کہ دزد
متاعِ من ز نہانخانۂ ازل بردست

یعنی توارد کا مطلب یہ ہے کہ شعرائے متقدمین میں سے جس سے میرا مضمون لڑ گیا اس نے روز ازل ہی نہانخانۂ ازل سے میری دولت چرا لی تھی۔ لہٰذا چور میں نہیں بلکہ وہی چور ہے جس سے مضمون لڑ گیا۔

غالب کے اس شاعرانہ تخیل کی داد دیے بغیر رہا نہیں جاتا۔ لیکن چوری اور سینہ زوری کی اچھی مثال ہے۔

تفریحِ طبع کے لئے چوری کا ایک دلچسپ واقعہ سناتا ہوں جو ایران میں

وقوع پذیر ہوا۔ ایک دفعہ ایک شخص ایران کے مشہور قصیدہ گو شاعر انوری کا کلام اپنا نتیجۂ فکر کہہ کر ایک مجمع کو سنا رہا تھا۔ انوری بھی مجمع میں موجود تھے انھوں نے شاعر صاحب سے پوچھا "حضرت! یہ کس کا کلام ہے؟ بولا "میرا"۔ انوری نے پوچھا "جناب کا تخلص؟" کہا "انوری" انوری بولے "شعر چور تو سنا تھا مگر شاعر چور آنکھوں سے دیکھا"۔ جب ایران میں شاعر تک کو چرا لیا جاتا ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں کہ شعرائے فارسی نے نہاں خانۂ ازل سے غالب کے مضامین چرا لیے ہوں۔

غالب پر سرقے کا الزام لگانے والوں نے غالب کے مذکورہ بالا جواب کا کیا اثر لیا اور کیا جواب دیا معلوم نہیں، مگر غالب کے انتقال کے تیس چالیس سال بعد غالب کا حسن خیال اور شیوا بیانی اس قدر مقبول ہوئی کہ ہند و پاکستان کے بیسیوں عظیم المرتبت شعرا غالب کے رنگ سخن کو اپنانے اور غالب ثانی بننے کی کوشش کرنے لگے۔ مقلدین غالب میں مولانا عبدالہادی وفا رامپوری اور ان سے زیادہ علامہ رضا علی وحشت کلکتوی مشہور ہوئے۔ ان مقلدین کے علاوہ معتقدین کا ایک عظیم گروہ پیدا ہو گیا تھا جو کلام غالب کو وحی منظوم کا درجہ دیتا تھا اور غالب کے خلاف کوئی بات سننے کو تیار نہ تھا۔ عبدالرحمٰن بجنوری "محاسن کلام غالب" میں لکھتے ہیں کہ ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ ایک وید مقدس اور دوسری دیوان غالب۔ لیکن اس درمیان میں لوگوں کا تنقیدی شعور بہت ترقی کر گیا تھا اور بال کی کھال نکالنے والے نقاد بھی پیدا ہو گئے تھے۔ چنانچہ غالب کے کلام کی تحقیق و تنقید بھی شروع ہوئی۔ ۱۹۲۸ء میں ماہنامہ نگار لکھنؤ میں آرگس کے فرضی نام سے غالب پر مقالات منظر عام پر آنے لگے۔ ان مقالات میں یہ ثابت کرنے کی کوشش

کی گئی ہے کہ غالب کے اکثر اُردو اشعار کے مضامین شعرائے فارسی سے ماخوذ
ہیں۔ چنانچہ ان کی کاوشوں کے کچھ نتائج ملاحظہ ہوں۔

(غالب) جان دی دی ہوئی اسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

(میر) خاک سے آدم کر دکھلایا یہ منت کیا تھوڑی ہے
اب سرِ خاک بھی ہو جائے تو سر سے کیا احسان گیا

(غالب) مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی — ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

(میر) وہ تخم سوختہ تھے ہم کہ سرسبزی نہ کی حاصل — ملایا خاک میں دانہ نمط حسرت سے دہقاں کو

(غالب) ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر — یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

(میر) ہستی ہے اپنے طور پہ جوں بحر جوش میں — گرداب کیسا، موج کہاں اور حباب کیا

(غالب) ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم — ملتیں سب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

(میر) ہم نہ کہتے تھے کہ مت دیر و حرم کی راہ چل — اب یہ جھگڑا حشر تک شیخ و برہمن میں رہا

(غالب) یارب زمانہ ہم کو مٹاتا ہے کس لئے — لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

(میر) حرفِ غلط تھے کیا ہم صفحے پہ زندگی کے — جو صاف یوں قضا نے ہم کو مٹا دیا ہے

(غالب) بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے — ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

(میر) ہوتا ہے یاں جہاں میں ہر روز و شب تماشا
دیکھو جو خوب تو ہے دُنیا عجب تماشا

(غالب) ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر — کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے
(میر) یاران دیر و کعبہ دونوں بلا رہے ہیں — اب دیکھیں میرؔ اپنا جانا کدھر بنے ہے
(عرفی) من کجا کشمکش رد و قبول از کجا — نیک رفتم کہ نہ کافر نہ مسلماں رفتم

(غالب) جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور — جز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے
(میر) یہ توہم کا کارخانہ ہے — یاں وہی ہے جو اعتبار کیا
(میر) سب توہم کا کارخانہ ہے — کہنے کو اعتبار سا ہے کچھ

(غالب) قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
(میر) امکان نہیں جیتے جی ہو قید سے آزاد — مرجائے تبھی چھوٹے گرفتارِ محبت
(میر) ہم سے بن مرگ کیا جدائی ہو — جان کے ساتھ ہے دلِ ناشاد

(غالب) ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود — ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب سے
جو کچھ نظر پڑے ہے حقیقت میں کچھ نہیں — عالم میں خواب دیکھا تو عالم ہے خواب کا

(غالب) ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے
(میر) ہستی اپنی حباب کی سی ہے یہ نمائش سراب کی سی ہے

(غالب) لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا
(میر) ہے آدمِ خاکی سے عالم کی جلا ورنہ آئینہ تھا تو مگر قابلِ دیدار نہ تھا

(غالب) ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی
(میر) بے خودی لے گئی کہاں مجھ کو دیر سے انتظار ہے اپنا

(غالب) جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا
(میر) غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا دل کے جانے کا نہایت غم رہا
(میر) کیا جانئے کہ عشق میں خوں ہو گیا کہ داغ
چھاتی میں اب تو دل کی جگہ ایک درد ہے

(غالب) تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو ہم کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو
(میر) کون کہتا ہے کہ غیروں کو نہ تم یاد کرو ہم فراموش ہوؤں کو بھی کبھی یاد کرو

(غالب) دل میں شوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

(میر) عشق کی سوزش نے دل میں کچھ نہ چھوڑا کیا کہیں
لگ اٹھی یہ آگ ناگاہی کہ گھر سب پھنک اٹھا

(غالب) قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالبؔ
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے
(میر) عشق ان کو ہے، جو یار کو اپنے دم رفتن کرتے نہیں غیرت سے خدا کے بھی حوالے

(غالب) حیراں ہوں، دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں
(میر) دل کو روؤں یا جگر کو میں اپنی دونوں سے آشنائی تھی

(غالب) نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا
(کمال اسمٰعیل) کاغذی جامہ بپوشید و بدرگاہ آمد زادۂ خاطر من تا بدہی داد مرا

(غالب) محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا
(عرفی) مگو کہ نغمہ سرایان عشق خاموشند کہ نغمہ نازک و اصحاب پنبہ در گوشند
(عرفی) ہر کس نہ شناسندۂ راز است و گرنہ اینہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است

(غالب) دوست غمخواری میں میری سعی فرماویں گے کیا زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آویں گے کیا

ناطق مکرانی
لذت ز زخم بسکہ دل زار من گرفت
ناخن ز دم بسینہ اگر بہ شدن گرفت

غالب
آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لادیں گے کیا

عرفی
متم آں سیر ز جاں گشتہ کہ با تیغ و کفن
تا درِ خانۂ جلّاد غزل خواں رفتم

غالب
ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

میلی
بیم از وفا مدار بدہ وعدۂ کہ من
از ذوق وعدۂ تو بفردا نمی رسم

غالب
ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

(نامعلوم) غرقۂ بحریم مارا در دیار ما مپرس
لقمۂ کام نہنگم از مزار ما مپرس

غالب
غم اگرچہ جاں گسل ہے یہ بچیں کہاں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

(عرفی) غمِ نعمتیست خوردنی امّا ز خوانِ عشق
اے اہلِ روزگار غمِ روزگار چیست

(غالب) کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شبہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

(خسرو) زہے عمرِ دراز عشق بازاں
شبِ ہجر از حسابِ عمر گیرند

(غالب) مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اِک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

(عمر خیام) مے خوردنِ من نہ از بہرِ طرب است
نے بہرِ فساد و ترکِ دین و ادب است
خواہم کہ بہ بیخودی آرم نفسے
مے خوردن و مست بودن زیں سبب است

(غالب) نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

(قمی) ہر کس کہ زخمِ کاریِ مارا نظارہ کرد
تا حشر دست و بازوئے اورا دعا کنند

(غالب) سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

(خسرو) اے گل چو آمدی ز زمیں گو چگونہ اند
آں روئیہا کہ در تہِ گردِ فنا شدند

(میر) گو گل و لالہ کہاں ہم سنبل و ہم نسترن
خاک سے یکساں ہوئے ہیں ہائے کیا کیا آشنا

(غالب) گرچہ ہے کس کس بُرائی سے ولے با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

(قزدینی) ہست صد منت بجاں از غیبت بدگو مرا
چوں بایں تقریب می آرد بیادِ او مرا

(غالب) ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے مُنھ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچّھا ہے

(فسونی تبریزی) باو چو می رسم آسودہ می شوم از دور
ندید حال مرا وقت بے قراری حیف

(غالب) نکلنا خُلد سے آدم کا سُنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہوکر ترے کوچے سے ہم نکلے

عاقل خاں رازی
نہ مرا کرد رقیب از سر کوے تو جدا
اوّل این حادثہ بر آدم و حوّا بگذشت

غالب
پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
ہم بھی ہیں تیری عنایت کی نظر ہونے تک

حزیں
گراں جاں تر ز شبنم نیست جسمِ ناتوان من
می بود با من روے گرمی آفتابش را

غالب
زبان اہل زباں پر ہے مرگ خاموشی
یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیٔ شمع

غنی
شد روشنم از شمع کہ در بزم حریفاں
خاموش شدن مرگ بود اہل زباں را

غالب
جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

حافظ
جامِ جہاں نماست ضمیر منیر دوست
اظہار احتیاج خود آنجا چہ حاجتست

غالب
وفا داری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بتخانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

عرفی — عنایت صمدی رد کفرِ ما نکند
اگر کمال پذیرد صنم پرستیٔ ما

غالب — بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

نعمت خاں — دریاب ماندہ است ز دل قطرۂ خونے
عالی بافیضی — آں قطرہ ہم از دستِ تو لبریز چکیدن

بیدل — آب گہریم و خون یاقوت
داریم بروئے خود چکیدن

غالب — ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

صائب — زیں پیش شغلِ عشق بجاناں کمی رسید
در روزگارِ عشقِ تو ایں شیوہ عام شد

غالب — زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب
کہ بن کہے ہی انھیں سب خبر ہے کیا کہیے

ملا شہدی — دارد خموش تا من حسرت کشیدہ را
گوید شنیدہ ام سخنِ ناشنیدہ را

غالب
پھر دیکھیے انداز گل افشانیٔ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

عرفی
بیار بادہ کہ جانم دمے ز نالہ برآید
ہزار زمزمہ از دل بیک پیالہ برآید

غالب
نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم ہمہ خاک
آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

بیدل
ہیچ پرواز ز خاکستر خود بالا نیست
بیدل ایں ہفت فلک بیضۂ یک فاختہ است

غالب
کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
مدّت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے

نامعلوم
آمادہ گشتہ ام دگر امشب نظارہ را
پیوند کردہ ام جگرِ پارہ پارہ را

غالب
دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

میلی
میلی ز شرم عشق بجانم کہ سوئے او
با شوق ایں چنیں نتوانم نظر کنم

غالب　　مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں
　　　　شایانِ دست و بازوے قاتل نہیں رہا

نظیری　　آں شکارم من کہ لائق ہم بکشتن نیستم
　　　　شرم می آید مرا زانکس کہ جلّادِ من است

غالب　　تم سلامت رہو ہزار برس
　　　　ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

چہار درویش　　شاہا بقاے عمر تو بادا ہزار سال
　　　　سالے ہزار ماہی و ماہے ہزار سال

منقولہ بالا شعروں کے بعد غالب کے تخلّص پہ غور فرمائیے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کو اسد اللہ الغالب کہتے ہیں۔ اتفاق سے غالب کا نام بھی اسد اللہ تھا۔ اس مناسبت سے تخلّص "غالب" کا انتخاب بہت خوب ہے۔ لیکن یہ خوبی غالب کی اپنی نہیں ہے۔ غالب کی پیدائش سے صرف پچاس سال قبل شاہ جہاں آباد میں ایک فارسی شاعر گزرا ہے۔ سال وفات ۱۱۶۳ھ ہے۔ اس کا نام اسد اللہ تھا اور وہ "غالب" تخلّص کرتا تھا۔ غالب کے وقت میں یہ شاعر گمنام رہا ہوگا۔ لیکن تذکرہ ماثر الکرام موسوم بہ سرو آزاد مصنفہ غلام علی آزاد بلگرامی میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔ تخلّص کے علاوہ غالب اور شاعر موصوف کے عقیدت مندانہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغول حق ہوں بندگیٔ بوتراب میں

شاعر موصوف کہتا ہے ؎

روز محشر غُبار تُربت من
دامنِ بوتراب می خواہد

ناقدین و محققین کی تحقیقات کے نتائج ہمارے پیش نظر ہیں۔ ان سے اندازہ لگ سکتا ہے کہ غالب کے ساتھ توارد کا تعلق کیسا اور کس حد تک ہے۔ اب تک جتنے اشعار نظر کے سامنے آئے ہیں ان سے یہ بات یقین کے درجے کو پہنچتی ہے کہ غالب نے شعرائے عجم اور میر تقی میر سے اس قدر استفادہ کیا کہ توارد کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا۔ غالب خود کہتے ہیں کہ "طبیعت ابتدا سے نادر و برگزیدہ خیالات کی جویا تھی" لفظ "جویا" قابل غور ہے۔ یگانہ چنگیزی کہتے ہیں کہ "کیا غالب فارسی لٹریچر سے بے خبر تھے کہ چرائے ہوئے مضمونوں کو توارد کی آڑ پکڑ کر غالب کا ہی نتیجۂ فکر کہا جا سکے۔ البتہ شکسپیئر اور ملٹن سے کسی مقام پر توارد ہو جائے تو توارد کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ انگریزی سے ناواقف تھے۔" (غالب شکن)

یہ حقیقت ہے کہ غالب نے شعرائے فارسی اور میر کے کلام کا مطالعہ کیا تھا اور اس قدر رٹ رٹ کر دب کر کیا تھا کہ ان کے مضامین غالب کے دماغ میں پیوست ہو کر جزو دماغ بن گئے تھے۔ لہٰذا شعرائے فارسی اور میر کے جو مضامین

لہ تقریظ دیوان فارسی۔

ان کے یہاں ملتے ہیں وہ چوری کے طریقے سے نہیں آئے۔ یہ حقیقت خود ان کے اشعار کے انداز سے واضح ہوتی ہے۔ لیکن غالب صرف استفادہ سے غالب نہیں بنے بلکہ وہ غالب کی اپنی صلاحیت تھی جس نے غالب کو غالب بنایا۔ اگر غالب صرف استفادہ اور اخذ مضامین سے غالب بنتے تو ایک غالب ہی پر منحصر کیوں، جو بھی شاعر چاہتا غالب کی فکر کا شاعر بن سکتا تھا اور تو اور خود غالب کے مقلد بھی غالب جیسے شاعر نہ بن سکے۔ غالب نے ماخوذ خیالات کو نہ صرف فارسی کا جامہ اُتار کر اُردو کا جامہ پہنا دیا بلکہ اکثر مضمون سے مضمون پیدا کیا اور خیالات جہاں سے بھی لئے ہوں لیکن انھیں ایسی خلاقانہ اور فنکارانہ شان کے ساتھ اُردو میں نظم کیا کہ اُردو زبان ایک حد تک فارسی زبان کی ہم چشم بن گئی اور یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اُردو زبان کو جو ارفع و اعلیٰ مقام حاصل ہے وہ غالب کے اسی کار خیر کی بدولت۔ لہٰذا غالب کا یہ کہنا سو فیصدی صحیح ہے۔

ہیں اور بھی دُنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

آرگس اور دیگر محققین نے جس حقیقت نما کا انکشاف کیا اگر اسے ایک حقیقت مان بھی لیا جائے، تاہم غالب کی عظمت مسلّم ہے۔ غالب کی شاعرانہ عظمت کی دلیل کے طور ان کا پورے کا پورا دیوان کیوں، دو چار غزلیں ہی کافی سے زیادہ ہیں۔

جس طرح بعض لوگ اپنے کو انتہائی درجے کا ترقی پسند، روشن دماغ

اور سائنسی مفکّر جتانے کے جنون میں خُدا اور مذہب کا مذاق اُڑاتے ہیں اور خُدا و مذہب پر ایمان رکھنے والوں کو "بیچارہ" کہہ کر اپنی رفعت عقل کے کمال کی نمائش کرنا چاہتے ہیں بالکل اسی طرح بعض خود نما لوگوں نے جن میں صغیر و کبیر دونوں شامل ہیں غالب کی شاعری کا کوئی نہ کوئی عیب نکال اور غالب پر جھنجھلانا اپنا نقادانہ کمال تصوّر کیا۔ یہ اسی جذبۂ اظہار کمال کے تحت کسی کو غالب شکن بننے کا جنون ہوا کسی کو مصلح غالب بننے کا شوق ہوا، کوئی کچھ بنا اور کوئی کچھ۔

یگانہ چنگیزی صاحب نے ناقدین اور محققین کی کچھ تحقیقات کو اس طرح ہتھیا کر کہ جیسی وہ انھیں کی تحقیقات ہیں۔ اپنی کتاب غالب شکن میں غالب کی اریجنلٹی کی خوب خوب دھجیاں اُڑائی ہیں۔ انھوں نے بار بار غالب کو چور اور ان کی چوری کا ذکر خوب مزے لے لے کر کیا ہے۔ لیکن اگر تھوڑی سی ظاہری و باطنی مماثلت کی بنا پر وہ غالب کو چور کہہ سکتے ہیں اور ان کی چوری کا ذکر خوش کُن اور پُر لطف انداز میں کر سکتے ہیں تو پھر غالب کا کوئی معتقد اگر تہیہ کر بیٹھے تو غالب شکن کے جواب میں یگانہ شکن لکھ سکتا ہے اور یگانہ صاحب کو بھی چور کے لقب سے ملقّب اور چوری کی صفت سے متّصف کر سکتا ہے۔ کیونکہ ان کے یہاں بھی ایسے اشعار مل جاتے ہیں جو دوسرے شاعروں کے شعروں سے کچھ نہ کچھ ظاہری و باطنی مماثلت رکھتے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

یگانہ

جان پیاری ہے حیاتِ جاوداں پیاری نہیں
زندگی کیا، موت کی جب گرم بازاری نہیں

غالب
ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

یگانہ
افسردہ خاطروں کی خزاں کیا بہار کیا
کُنجِ قفس میں مر رہے یا آشیانے میں

غالب
خزاں کیا، فصلِ گُل کہتے ہیں کس کو، کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

یگانہ
ناخُدا کچھ زورِ طوفاں آزمائی بھی دکھا
فکرِ ساحل چھوڑ لنگر ڈال دے منجدھار میں

ذوق
احسان ناخُدا کے اُٹھائے مری بلا
کشتی خُدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں

یگانہ
کوئی ضد تھی یا سمجھ کا پھیر تھا
من گئے وہ بات جب اُلٹی کہی

مومن
مانگا کریں گے اب سے دُعا ہجرِ یار کی
آخر تو دُشمنی ہے اثر کو دُعا کے ساتھ

یگانہ
کہتے ہیں اپنے فعل کا مختار ہے بشر
اپنی تو موت تک نہ ہوئی اختیار میں

غالب
کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

یگانہ
لہو لگائے شہیدوں میں ہو گئے داخل
ہوس تو نکلی مگر حوصلہ کہاں نکلا

غالب
ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

یگانہ
خوشا نصیب جسے فیض عشق شور انگیز
بقدر ظرف ملا ظرف سے سوا نہ ملا

غالب
گرنی تھی ہم پہ برق تجلّی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

یگانہ
وقت جس کا کٹے حسینوں میں
کوئی مردانہ کام کیا کرتا

غالب
عشق نے غالب نکمّا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

یگانہ
کیا بتاؤں کیا ہوں میں قدرت خدا ہوں میں
میری خود پرستی بھی عین حق پرستی ہے

میر
ہم آپ ہی کو اپنا مقصود جانتے ہیں
اپنے سوائے کس کو معبود جانتے ہیں

یگانہ
حُسنِ فطرت بولتا ہے پردہ اسرار میں
معنیٔ بے لفظ پنہاں ہیں زبانِ خار میں

میر
جلوہ ہے اسی کا سب گلشن میں زمانے کے
گُل پھول کو ہے اس نے پردہ سا بنا رکھا

یگانہ
عشق بازی کی انتہا معلوم
شوق سے ابتدا کرے کوئی

میر
ابتدا ہی میں مر گئے سب یار
عشق کی کوئی انتہا لایا

یگانہ
دُنیا کا چلن ترک کیا بھی نہیں جاتا
اس جادۂ باطل سے ہٹا بھی نہیں جاتا

ذوق
بہتر تو ہے یہی کہ نہ دُنیا سے دل لگے
پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

یگانہ
وائے حسرت کہ تعلق نہ ہوا دِل کو کہیں
نہ تو کعبے کا ہوا میں نہ صنم خانے کا

داد
نے خانۂ خدا ہے نہ ہے یہ بتوں کا گھر
رہتا ہے کون اس دلِ خانہ خراب میں

یگانہ
دل لگانے کی جگہ عالمِ ایجاد نہیں
خواب آنکھوں نے بہت دیکھے مگر یاد نہیں

درد
وائے نادانی کہ بعدِ مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

یگانہ
مزا گُناہ کا جب ہے کہ با وضو کرتے
بتوں کو سجدہ بھی کرتے تو قبلہ رو کرتے

داغ
پاک ہونا ہے رند کو لازم
مے کشی بے وضو کئے نہ بنی

میر
کفر کچھ چاہئے اسلام کی رونق کے لئے
حُسن زنّار ہے تسبیح سلیمانی کا

مرحوم نیاز فتحپوری صاحب کی عادت تھی کہ وہ اپنے دَور کے اساتذہ کے علاوہ غالب کے کلام کے بھی عیوب نکالا کرتے تھے۔ بلکہ کلام پر اصلاحیں بھی دیا کرتے تھے۔ ان کی وہ اصلاحیں جو بآسانی ایک آدھ لفظ کے ردو بدل سے ہو سکتی تھیں معقول ہوتی تھیں۔ لیکن جہاں انھوں نے

ایسی اصلاحیں دیں جیسی ایک اُستاد شاگرد کو دیتا ہے وہاں انھوں نے
اور بھی بگاڑ دیا۔ مثلاً سیماب کی نظم کے دو شعر ہیں۔

طلوعِ آفتابِ صبح ہے گنگا کے ساحل سے — حسیں جس طرح کوئی جھانکتا ہو چاک محمل سے
ہوائیں غسل کرنے آرہی ہیں رودِ گنگا میں — جو نزہت ہے لبِ دریا وہی نزہت ہے صحرا میں

نیاز صاحب فرماتے ہیں کہ دوسرے مصرعہ میں "وہی نزہت ہے صحرا میں"
پورے شعر کا توڑ ہے اور معلوم ہوتا ہے اسی کے ظاہر کرنے کے لئے شعر کہا گیا ہے
حالانکہ اس وقت گفتگو صرف دریا کے منظر سے ہے اور اسی پر زور دینا
چاہیئے۔ لیکن اگر شاعر کا خیال اس سلسلے میں کسی طرح صحرا کی طرف پہنچ گیا تھا
اور اس شعر میں مقصود صحرا ہی کی نزہت کا بیان تھا تو پہلا مصرعہ یوں ہونا
چاہیئے تھا۔

ہوائیں غسل کر کے آرہی ہیں رودِ گنگا سے

نیاز صاحب کا اعتراض تو بہت معقول ہے لیکن شعر کے دونوں مصرعے
ہم قافیہ اور مردف ہیں۔ یعنی گنگا اور صحرا قافیے اور "میں" ردیف۔ نیاز صاحب
نے نہ قافیے کا خیال رکھا اور نہ ردیف کا، صرف یہ دیکھا کہ شعر اصلاح طلب
ہے اور اصلاح دے بیٹھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مصرعہ اول کو جو ہونا تھا ہو گیا مگر
شعر یوں ہو گیا۔

ہوائیں غسل کر کے آرہی ہیں رودِ گنگا سے
جو نزہت ہے لبِ دریا وہی نزہت ہے صحرا میں

اب ذرا ملاحظہ کیجئے۔ صرف یہی نہیں کہ ردیف بالائے طاق ہو گئی بلکہ

"میں" کا قافیہ "سے" ہوگیا۔ میرے خیال میں "مصرعہ یوں" کرنے کی بجائے صرف اعتراض کر کے چھوڑ دینا چاہئے تھا اور معنوی لحاظ سے غور کیجئے تو کوئی معنوی نقص بھی نہیں ہے۔ نزہت بیک وقت صحرا اور لب دریا دونوں جگہ ہوسکتی ہے۔ کیونکہ ہوائیں نہ صرف غسل کرنے صحرا سے لب دریا آتی ہیں بلکہ غسل کر کے صحرا میں واپس بھی جاتی ہیں۔ اس طرح ہواؤں کے آنے اور جانے کا سلسلہ لگا رہتا ہے۔ لہٰذا جو ہوائیں غسل کر کے واپس جا چکتی ہیں ان سے صحرا میں نزہت ہوتی ہے اور جو ہوائیں غسل کر کے واپس نہیں جاتیں ان سے لب دریا میں نزہت ہوتی ہے۔

اگرچہ فقرہ "وہی نزہت ہے صحرا میں" سے واضح ہو جاتا ہے کہ ہوائیں صرف صحرا سے جاتی ہی نہیں ہیں بلکہ صحرا میں واپس بھی آتی ہیں تاہم شاعر کے بیان میں کچھ کمی رہ گئی ہے۔

اب غالب کے ایک اچھے خاصے مصرعے پر نیاز صاحب کی اصلاح ملاحظہ فرمایئے۔ غالب کا شعر ہے۔

کاؤ کاوِ سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

نیاز صاحب فرماتے ہیں کہ "لفظ کاؤ کاؤ اچھا نہیں۔ اگر اس مفہوم کو لفظ "کاوش" سے ادا کیا جاتا جو کاؤ کاؤ کا مرادف ہے تو یہ نقص دور ہو جاتا۔ مثلاً

کاوشیں اب سخت جانیہائے ہجراں کی نہ پوچھ"

تھے اور غالب اس زمانے کا سب سے بڑا نقاش تھا جس نے غزل کی روایتی خط و خال سے ہٹ کر بالکل نئے طریقے سے مشاطہ گری کی۔"
(معلومات نمبر نگار لکھنؤ)

نیاز صاحب نے مومن نمبر نگار ۱۹۲۸ء میں لکھا ہے کہ اگر میرے سامنے اُردو کے تمام شعرائے متقدمین و متاخرین کا کلام رکھ کر (باستثنائے میر) مجھ کو صرف ایک دیوان حاصل کرنے کی اجازت دی جائے تو بلا تامل کہہ دوں گا کہ مجھے کلیات مومن دے دو، باقی سب اُٹھائے جاؤ۔ نیاز صاحب کے اس قول کا یہ مطلب لیا جا رہا تھا کہ وہ مومن کو غالب سے برتر شاعر مانتے تھے۔ لہٰذا نیاز صاحب کے اس قول کے زیر اثر آج بھی متعدد لوگ مومن کو غالب سے برتر شاعر سمجھتے ہیں۔ لیکن مومن کی شاعری جنسی محبت کے مخصوص دائرے کی چیز ہے۔ لہٰذا جن لوگوں کو مومن کی شاعری غالب کی شاعری سے برتر و خوشتر نظر آتی ہے وہ لوگ ایک چھوٹے سے پُر بہار چمن کی چہار دیواری کے اندر گل و لالہ اور رنگینیٔ چمن کا نظارہ تو کر رہے ہیں لیکن چمن کے باہر دُنیا کتنی وسیع اور انسانی زندگی کتنی ہمہ گیر ہے انھیں نظر نہیں آتی۔ اس لئے وہ چمن کی رنگینی ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ سمجھنے والوں نے نیاز صاحب کے قول کا مطلب ہی نہیں سمجھا۔ یاد نہیں کس میں لیکن مجلہ نگار لکھنؤ ہی کے کسی شمارے میں نیاز صاحب لکھتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ پھر کہوں گا کہ اگر سب شاعروں کے دواوین میں سے مجھے صرف ایک کے لینے کی اجازت دی جائے تو میں مومن کا دیوان لوں گا لیکن

اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں مومن کو غالب سے بڑا شاعر مانتا ہوں۔ میں مومن کو اس لئے پسند کرتا ہوں کہ مومن کی شاعری میں وہ عشقیہ جذبات ہیں جن کا تعلق گوشت پوست سے ہے اور جس سے ہر شخص دوچار ہوتا ہے۔"

نیاز صاحب کے اس بیان سے نیاز صاحب کا مطلب بالکل صاف ہوگیا۔ لیکن ایک موقعہ پر انھوں نے اپنے مطلب کو اس سے بھی زیادہ صاف کر دیا ہے۔ مومن کا شعر ہے۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

چونکہ مشہور ہے کہ یہ شعر غالب کو اتنا پسند آیا کہ انھوں نے اپنا پورا دیوان دے کر اس شعر کو لینا چاہا اس لئے مومن کے ماننے والے سمجھتے ہیں کہ یہ شعر اتنا بلند ہے کہ غالب بھی ایسا شعر نہیں کہہ سکتے اور غالب کے پورے دیوان میں اس شعر کے برابر کوئی شعر نہیں ہے بلکہ یہ شعر غالب کے تمام شعروں پر بھاری ہے۔ لیکن نیاز صاحب اس بات کو تسلیم نہیں کرتے وہ کہتے ہیں کہ "یقیناً یہ شعر اتنا بلند اور پاکیزہ ہے کہ اس میں ترقی کی گنجائش بظاہر نظر نہیں آتی۔ لیکن غالب اس سے بہت بلند سطح پر پہنچ کر کہتا ہے۔

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

(معلومات نمبر نگار)

نیاز صاحب کے اقوال سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ مجموعی حیثیت اور رنگا رنگی کے اعتبار سے وہ غالب کو مومن سے بہت برتر شاعر مانتے تھے۔ البتہ جہاں تک جنسی عاشقانہ شاعری کا تعلق ہے وہ مومن کو زیادہ

پسند کرتے تھے۔ غالب و مومن کے بارہ میں نیاز صاحب کا نقطہ نظر بالکل صاف ہے۔ لیکن نیاز صاحب اپنی زبردست نقادانہ صلاحیت کا ثبوت دینے کے لئے بڑے کو چھوٹا اور چھوٹے کو بڑا کر دکھانے کی کوشش میں بھی لگے رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ غالب کو مومن سے برتر شاعر مانتے ہوئے بھی بعض اوقات مومن کو غالب پر فوقیت دینے کی کوشش کرتے تھے مگر ان کا ضمیر ان کو روک لیتا تھا۔

مرحوم جعفر علی اثر لکھنوی صاحب صرف میر اور انشا کو صاحب طرز مانتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق انشا ایک مخصوص دائرے میں جُدا گانہ رنگ کے مالک ہیں اور باقی جتنے شاعر (بشمول غالب) ہیں وہ میر میں سمائے ہوئے ہیں۔ اثر صاحب نے میر کے کلام سے مثالیں پیش کر کے دکھایا ہے کہ جو رنگ خاص غالب کا سمجھا جاتا ہے وہ میر سے ماخوذ ہے۔ لیکن اس کے باوجود اثر صاحب بطیب خاطر مانتے ہیں کہ "غالب کی طبیعت میں غضب کی پیدا تھی اور انھوں نے اُردو میں ایسے شعر کہے ہیں جو کسی بڑے سے بڑے فارسی شاعر کے مقابلے میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ اس لئے ان کے اس دعوٰی میں ذرا بھی مبالغہ نہیں۔

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشک فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سُنا کہ یوں"

(مطالعۂ غالب)

اور یگانہ چنگیزی صاحب جو غالب کا ذکر بڑی جھنجھلاہٹ اور

کھسیانے پن سے کرتے ہیں اور بڑی مستانہ اداؤں کے ساتھ غالب کی اریجنلس کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ بھی فرمانے لگتے ہیں کہ "ڈاکٹر عبداللطیف کا یہ قول صحیح نہیں کہ غالب کوئی بڑا شاعر نہیں۔ غالب اُردو کا بڑا شاعر ہے "اعلیٰ درجے کا غزل گو" دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں کہ "میں ان کو (یعنی غالب کو) اُردو کا مایہ ناز شاعر مانتا ہوں۔

(غالب شکن)

مرزا غالب! زندہ باد!

اے گُل چو آمدی ز زمیں گو چگونہ اند

آں روئیہا کہ در تہِ گردِ فنا شُدند

شخصیات کا تعارف

آغا جان عیش۔ حکیم آغا جان عیش دلّی میں بادشاہی اور خاندانی طبیب تھے۔ صاحبِ علم و کمال اور شگفتہ مزاج انسان تھے۔ ہمیشہ مسکرایا کرتے تھے۔ شاعری کا اچھا مذاق رکھتے تھے اور اپنے وقت میں دلّی میں مشہور شاعر تھے۔ بہت ظریف اور بذلہ سنج تھے۔ غالب کے دوستوں میں تھے۔ عیش کے بیٹے مرزا جان بلب گڑھ میں صیغہ طبابت میں سرکاری ملازم تھے۔ غالب کو فکر تھی کہ کہیں ۱۸۵۷ء کے غدر کے عتاب کے زیرِ اثر ان کی ملازمت پر آنچ نہ آجائے۔ اس لئے غالب نے اپنے ایک شاگرد منشی جواہر سنگھ کو جو بلب گڑھ میں تحصیلدار ہو گئے تھے لکھا کہ "سنو صاحب! حکیم مرزا جان خلف الصدق حکیم آغا جان عیش کے تمہارے علاقہ تحصیلداری میں بصیغہ طبابت ملازم سرکار انگریزی ہیں۔ ان کے والد ماجد میرے بچاس پچپن برس کے دوست ہیں۔ ان کو اپنا بھائی جانتا ہوں۔ اس صورت میں حکیم مرزا جان میرے بھتیجے اور تمہارے بھائی ہیں۔ لازم ہے کہ ان سے یک دل و یک رنگ رہو اور ان کے مددگار بنے رہو۔ سرکار میں یہ عہدہ بصیغہ دوام ہو۔ تم کو کوئی نئی بات پیش کرنی ہو گی۔ صرف اس امر میں کوشش رہے کہ صورت اچھی بنی رہے۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عیش نے جو قطعہ اجمیری دروازے کے مشاعرہ

میں پڑھا تھا وہ ایک دوستانہ مذاق اور دل لگی تھی۔ عیش کا انتقال ۱۸۵۷ء کے غدر کے کچھ بعد ہوا۔

ابو تمام۔ ابو تمام حبیب بن اوس طائی عربی زبان کے عظیم ترین شاعروں میں ہیں۔ وفات ۲۳۱ھ میں ہوئی۔ دیوان حماسہ ان کے کلام کا مجموعہ ہے۔

ابوالفضل۔ شیخ ابوالفضل علامی ملک الشعرا فیض کے چھوٹے بھائی تھے۔ ۹۵۸ھ میں پیدا ہوئے۔ ذہن رسا اور علو حوصلہ کی وجہ سے بہت کم سنی میں مختلف علوم و فنون میں مہارت حاصل کرلی اور اکبر بادشاہ کے وزیر اعظم بن کر اکبر کے دل و دماغ پر چھاگئے۔ انشاے ابوالفضل علامی اپنی ادبیت اور فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے گراں قدر ادب ہے۔ نصیر ہمدانی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ابوالفضل کی سادہ نویسی اور قوت ناطقہ اکبر نامہ میں دیکھنا چاہیے، اس میں ان کا جوہر قابلیت کھل کر سامنے آیا ہے۔ شاہزادہ سلیم (یعنی جہانگیر) کے اشارے سے ۱۰۱۱ھ میں قتل کر دیے گئے۔

احسان۔ یہ احسان شاید حافظ عبدالرحمٰن متخلص بہ احسان ہونگے دہلی کے رہنے والے تھے اور شاہ نصیر، نظام الدین ممنون وغیرہ کے رتبے کے شاعر تھے۔ تاریخ ادب اردو مولفہ رام بابو سکسینہ (اردو) میں لکھا ہے کہ بڑے بڑے شاعر مثلاً سودا، میر، نصیر، ممنون، احسان، فراق وغیرہ یہ سب شاہ عالم ثانی کی سرکار کے دعا گو تھے۔ احسان کو صنائع لفظی میں کمال حاصل تھا۔

احمد بخش خاں۔ نواب احمد بخش خاں بہادر غالب کے چچا نصراللہ بیگ کے سالے اور غالب کی بیوی امراؤ بیگم کے حقیقی چچا تھے۔ یہ فیروز پور جھرکہ کے والی تھے جو ان کو انگریزوں سے ملا تھا۔ انگریزوں نے نصراللہ بیگ کو حین حیات کے لیے جو جاگیر عطا کی تھی وہ انھوں نے ان کی وفات پر واپس لے لی اور نواب احمد بخش کے نام حکم صادر کیا کہ فیروز پور کی ریاست سے دس ہزار روپے سالانہ مرحوم نصراللہ بیگ کے وارثین کو دے جائیں۔ لیکن نواب احمد بخش نے ۷ جون ۱۸۰۶ء کو لارڈ لیک سے ایک خط حاصل کر لیا جس میں درج تھا کہ نصراللہ بیگ کے وارثین کو صرف پانچ ہزار روپے سالانہ ملیں گے اور وہ بھی اس طرح کہ خواجہ حاجی خاں کو دو ہزار، نصراللہ بیگ کی والدہ اور تین بہنوں کو ڈیڑھ ہزار اور غالب اور غالب کے بھائی یوسف مرزا کو ڈیڑھ ہزار سالانہ۔ اس طرح غالب کو صرف ساڑھے سات سو روپے سالانہ ملنے لگے۔ انھیں احمد بخش کے سب سے بڑے بیٹے شمس الدین احمد تھے جو ہماری زبان کے مشہور شاعر داغ دہلوی کے والد تھے۔

احمد علی گوپا موی۔ احمد علی گوپا موی اودھ کے رہنے والے تھے۔ پرنس غلام (میسور) کے یہاں میر منشی تھے۔

ارزقی۔ شرف الزماں ابوالمحاسن زین الدین ابوبکر جعفر ارزقی قرن پنجم کے اواخر کے مشاہیر شعراء میں سے ہیں۔ ان کی سکونت ہرات میں تھی۔

اسدی۔ حکیم ابو نصر اسدی فردوسی کے اُستاد تھے اور فردوسی

کے بعد انتقال کیا۔ کتاب گرشاسپ نامہ ان کی یادگار ہے۔ سلطان محمود غزنوی کے عہد میں شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ ۴۲۵ھ میں فوت ہوئے۔

اشرف علی خاں۔ مولوی احمد علی احمد جہانگیر نگری مصنف مؤید برہان نے کلکتہ میں ایک مدرسہ موسوم بہ مدرسہ احمدیہ قائم کیا تھا۔ مولوی احمد علی خود بھی اس مدرسہ میں پڑھاتے تھے۔ بہت بعد میں جب ان کا تقرر مدرسہ عالیہ کلکتہ میں ہوگیا تو وہ مدرسہ احمدیہ کے نگراں رہے۔ اسی مدرسہ احمدیہ میں مولوی اشرف علی خاں مدرس تھے۔

افضل بیگ۔ افضل بیگ غالب کی سگی ہمشیرہ چھوٹی خانم کے شوہر اکبر بیگ کے بھائی اور خواجہ حاجی کے سالے تھے۔ کلکتہ میں بادشاہ دہلی اکبر شاہ ثانی کے وکیل تھے۔ غالب کے بیان کے مطابق افضل بیگ اپنے خواہرزادوں یعنی خواجہ حاجی کے بیٹوں سے رشوت لے کر غالب کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ بات یہ تھی کہ نواب احمد بخش نے خواجہ حاجی کو غالب کے چچا نصراللہ بیگ کا رشتہ دار قرار دے کر غالب کی پنشن سے دو ہزار روپئے سالانہ پنشن دلوادی تھی۔ غالب جب کبھی اعتراض کرتے تو نواب موصوف ان کو سمجھا دیتے کہ میری عزت کا سوال ہے، لہٰذا تم کچھ نہ کہو، خواجہ حاجی کے مرنے پر دو ہزار روپیوں کی پوری رقم تمہیں لوگوں کو ملا کرے گی۔ لیکن احمد بخش نے خواجہ حاجی کے بیٹوں کو وہ رقم دینی شروع کر دی۔

اقبال۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال ۱۸۷۳ء میں سیالکوٹ (پنجاب پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ تکمیل تعلیم کے بعد بیرسٹر اور پروفیسر ہوئے۔ یورپ میں رہ کر عالم اسلام کے خلاف یوروپین ڈپلومیسی دیکھ کر پان اسلام ازم کا پرچار شروع کیا۔ اقبال کے خیال کے مطابق پان اسلام ازم ہی کے ذریعہ مشرق کو مغرب کے استبداد اور غلامی سے نجات مل سکتی تھی۔ چنانچہ ۱۹۱۵ء میں ان کی مثنوی "اسرار خودی" فارسی زبان میں شائع ہوئی۔ جس میں انھوں نے ایک نظریۂ حیات فلسفہ خودی کے نام سے پیش کیا جس سے فنافی اللہ کے علاوہ ان تمام حسین متصوفانہ اور ملایانہ معتقدات و خیالات کی تردید کی جو اہل اسلام کی سیاسی اور قومی زبوں حالی اور تنزل کا باعث ہوئے۔ ملک الشعرا بہار کہتے ہیں۔

عصر حاضر خاصۂ اقبال گشت ——— واحدے کز صد ہزاراں برگذشت
شاعراں گشتند جیشے تار و مار ——— ایں مبارز کرد کارِ صد ہزار

اقبال کی وفات ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء میں ہوئی۔

اکبر شاہ ثانی۔ ابوالنصر معین الدین اکبر شاہ ثانی خاندان مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے والد تھے۔ اپنے والد شاہ عالم ثانی کی وفات کے بعد ۱۸ نومبر ۱۸۰۶ء میں سریر آرائے سلطنت ہوئے۔ ان کا انتقال ۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء میں ہوا۔ ان کے بعد بہادر شاہ ظفر بادشاہ دہلی ہوئے۔ اکبر شاہ بھی شاعری کرتے تھے۔ اپنے والد کے تخلص "آفتاب" کی نسبت سے "شعاع" تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے ذوق کے قصیدے سے متاثر ہو کر

ذوق کو خاقانیِ ہند کا خطاب دیا اور ملک الشعرا بنایا۔

الطاف حسین حالی۔ خواجہ الطاف حسین حالی ۱۸۳۶ء میں پانی پت (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۷۴ء میں اینگلو عربک کالج میں فارسی اور عربی کے مدرّس مقرر ہوئے۔ سرسیّد احمد سے ملاقات ہوئی تو جان و دل سے ان کے گرویدہ ہوگئے۔ سرسید کی صحبت میں رہ کر ان کے اندر جو انقلاب عظیم آیا اس کی تصریح مسدّس حالی کے دیباچے میں موجود ہے۔ اس انقلاب کے زیر اثر مسدّس حالی جیسی معرکۃ الآرا نظم تصنیف کی۔ ۱۸۸۷ء میں ان کو حضور نظام دکن کی سرکار سے امداد مصنفین کے صیغے سے پچھتّر روپے ماہانہ وظیفہ ملنے لگا جو بعد کو سَو روپے ہوگیا۔ اب انھوں نے نوکری چھوڑ دی اور تصنیف و تالیف اور علم و ادب کی خدمت میں مصروف ہوگئے۔ ۱۹۰۴ء میں ان کو شمس العلما کا خطاب ملا۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو انتقال فرمایا۔ مقدمہ شعر و شاعری، دیوان حالی، مسدّس حالی، حیات جاوید، حیات سعدی اور یادگار غالب مولانا حالی کی گراں قدر تصانیف ہیں۔

امیر خُسرو۔ امیر خسرو کے والد سیف الدین محمود لاچین ترک اور اُمرائے بلخ میں تھے۔ چنگیز خاں کے فتنہ کے وقت ترک وطن کر کے ہندوستان آئے اور پٹیالی میں سکونت پذیر ہوئے۔ امیر خسرو ۶۵۱ھ/۱۱۵۳ء میں پٹیالی میں پیدا ہوئے۔ ۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء میں انتقال فرمایا۔ امیر خسرو کو تمام اصناف سخن پر یکساں اُستادانہ قدرت حاصل تھی۔ اہل ایران نے بھی انکی

فارسی دانی کو تسلیم کیا ہے۔ سعدی اور جامی نے ان کی شاعری کے بارہ
میں بہت اچھے خیالات ظاہر کئے ہیں۔ ان کے شاعرانہ اور ادیبانہ
کمالات کی بنا پر انھیں فخر ہندوستان سمجھا جاتا ہے۔ تحفۃ الصغرا،
وسط الحیات، غرۃ الکمال اور نہایت الکمال ان کے کلام کے مجموعے ہیں۔
علاوہ ان کے مفتاح الفتوح، مطلع الانوار، مثنوی شیریں و خسرو، مثنوی
مجنوں و لیلیٰ، مثنوی قرن السعدین، مثنوی نہ سپہر، مثنوی دول رانی خضر خاں
اور اعجاز خسروی ان کی تصنیفات ہیں۔ اردو شاعری کے بھی باوا آدم سمجھے
جاتے ہیں۔

امیر مینائیؔ۔ مفتی امیر احمد امیر مینائی ۱۸۲۸ء میں نصیر الدین حیدر
کے عہد میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ واجد علی شاہ کی فرمائش پر ارشاد
سلطانی اور ہدایت السلطانی لکھنے پر خلعت اور انعامات سے نوازے
گئے۔ بعد کو والیٔ رام پور نواب یوسف علی اور نواب کلبے کے دربار سے
وابستہ رہے۔ انھوں نے چھوٹی بڑی بائیس کتابیں لکھیں۔ ۱۹۰۰ء میں
حیدرآباد میں وفات پائی۔ داغ دہلوی اور جلال لکھنوی کے مقابل شاعر تھے
غالب نے رسالہ معیار الشعرا کے مالک شیو نرائن کو لکھا تھا کہ "اب کے
تمھارے معیار الشعرا میں میں نے یہ عبارت دیکھی تھی کہ امیر شاعر اپنی
غزلیں بھیجتے ہیں، ہم کو جب تک ان کا نام و نشان معلوم نہ ہوگا ہم ان کے
اشعار نہ چھاپیں گے۔ سو میں تم کو لکھتا ہوں کہ یہ میرے دوست ہیں
اور امیر احمد ان کا نام ہے اور امیر تخلص کرتے ہیں۔ لکھنؤ کے ذی عزت

باشندوں میں ہیں اور وہاں کے بادشاہوں کے روشناس اور مصاحب رہے ہیں اور اب رامپور میں نواب صاحب کے پاس ہیں۔ ان کی غزلیں تمھارے پاس بھیجتا ہوں۔ میرا نام لکھ کر ان کی غزلوں کو چھاپ دو۔"

انشاء اللہ خاں ۔ سید انشاء اللہ خاں کے والد میر ماشاء اللہ خاں دہلی میں شاہی طبیب تھے۔ بعد کو دہلی سے مُرشد آباد (مغربی بنگال) چلے گئے۔ انشاء اللہ مُرشد آباد میں پیدا ہوئے۔ شاہ عالم ثانی کے عہد میں دلّی آئے اور شاہ عالم کو اپنے لطیفوں سے اس قدر متاثر کیا کہ انشاء اللہ کے بغیر ان کا رہنا محال ہوگیا۔ دلّی کی تباہی کے بعد لکھنؤ گئے تو شاہزادہ سلیمان شکوہ پر چھاگئے۔ پھر نواب سعادت علی خاں کے دربار سے منسلک ہوئے تو اپنی ظرافت اور بذلہ سنجی سے سعادت علی خاں کو ایسا موہ لیا کہ وہ ان کے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔ لیکن جب انجنب والے واقعہ سے نواب صاحب کی نگاہ کرم پھر گئی تو انشاء اللہ کی دُنیا اُجڑ گئی اور زندگی کا آخری حصّہ بڑی دردناک حالت میں گزار کر ۱۲۳۳ھ میں دارمحن سے رخصت ہوئے۔ انشاء اللہ بہت ذہین اور خوش فکر شاعر تھے۔ مگر انھوں نے اپنی ذہانت اور صلاحیت کو مسخرہ پن کے فن میں کمال حاصل کرنے میں صرف کردیا۔ اگر علمی خدمات اور شعرگوئی میں صرف کرتے تو فضلائے علم وادب میں ممتاز شخصیت کے مالک ہوتے۔

انورالدولہ سعدالدین شفق ۔ انورالدولہ نواب محمد سعدالدین خان بہادر متخلص بہ شفق کالپی کے رئیس تھے۔ پہلے سید امجد علی قلق سے

اور بعد میں غالب سے کلام پر اصلاح لی۔ اُردوئے معلی میں ان کے نام غالب کے اٹھارہ خطوط ہیں۔ شفق کا انتقال ۱۸۸۲ء میں ہوا۔

انوری ۔ اوحدالدین علی انوری قرن ششم کے اوائل میں ابیورد یا باورد میں پیدا ہوئے۔ اپنے عہد کے سب سے مشہور اور بعضوں کے خیال کے مطابق سب سے بڑے شاعر تھے۔ ایک مشہور قطعہ میں انوری کو پیغمبر قصیدہ مانا گیا ہے۔ انوری کچھ روز تک سلطان سنجر سلجوقی کے دربار میں رہے۔ انوری کا سال رحلت ۵۴۰ھ سے ۵۸۵ھ تک کے درمیان ہے۔

آغا علی ۔ مولوی عبدالغفور خاں نسّاخ کے معاصر تھے۔ مدرسہ عالیہ محمود آباد (اُتر پردیش) میں مدرس تھے۔ انھوں نے نسّاخ کی کتاب انتخاب نقص کے ترکی بہ ترکی جواب میں ایک کتاب "تفضیح" لکھی تھی جس میں نسّاخ کے اعتراضات کی تردید کرنے کے علاوہ نسّاخ کے اُردو کلام پر اعتراض بھی کئے تھے۔ (دیکھئے میری کتاب نسّاخ سے وحشت تک)

ابو حنیفہ ۔ امام ابو حنیفہ کا نام نعمان ہے۔ اہلِ سنّت و جماعت کے ائمہ اربعہ میں سے ہیں اور حنفی فقہ کے بانی ہیں۔ ان کی ولادت کوفہ میں ہوئی۔ امام صاحب نے تمام عمر فقہ کی تحصیل میں صرف کی۔ یہ کوفہ میں میں ایک زبردست عالم اور واعظ کی حیثیت سے رہتے تھے۔ ان کی بابت عام رائے یہ ہے کہ فقہ میں زیادہ تر قیاس سے کام لیتے تھے۔ ان کی فقہ پر عمل کرنے والے حنفی کہلاتے ہیں۔ امام صاحب کا وصال ۱۵۰ھ میں ہوا۔

اسد اللہ غالب ۔ شیخ اسد اللہ غالب جونپور کے رہنے والے تھے۔

صاحب مآثر الکرام لکھتے ہیں کہ "جوان صاحب استعداد و شائستہ بود، ہمیشہ رگ خامۂ سخن ریز بہ نشتر اندیشہ می کشود"۔ اواخر ایام میں شاہجہاں آباد میں آئے اور ۹ ذیقعدہ ۱۱۶۳ھ میں اس دار فانی سے رخصت ہوئے۔ ان کے تین اشعار

سیر مہتاب دوچنداں کند آرائش حسن ۔۔۔ سایۂ زلف بہ رخسار تو زلف دگر است
دلے دیوانہ دارم کہ خاموشیست تقریرش ۔۔۔ برنگ زلف خوباں بے صدا افتاد زنجیرش
گزر از کوچہائے تنگ کو صاحب دماغاں را ۔۔۔ نمی آید بروں از خامۂ نقاش تصویرش

باقر علی باقر۔ مولوی باقر علی باقر ضلع گیا (بہار) کے ایک قصبہ پیر بگہ میں ۱۹ جون ۱۸۳۳ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۵۹ء میں آرہ میں سررشتہ افیون میں گماشتے کی حیثیت سے سرکاری ملازم ہوئے۔ تبدیل ہوکر موتیہاری اور پٹنے میں رہے۔ ۲۴ جولائی ۱۹۰۸ء کو انتقال کیا۔ اردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی میں زیادہ کہتے تھے۔ ان کا ایک دیوان بھی شائع ہوا تھا۔ اشعار باقر۔

آغوش من و شاہد صد گونہ تمنا ۔۔۔ بالیں من و سایۂ دیوار محبت
توانم داشتن در سینہ راز عشق پنہاں را ۔۔۔ چہ سازم ضبط عشق، از چشم گریانم نمی آید
جائیکہ تو باشی و من خستہ جگر ہم ۔۔۔ سرسبز شود گلشن رازے و نیازے
تمہاری دید کی حسرت میں دیکھو جان جائے گی ۔۔۔ کھلی رہ جائیں گی آنکھیں نکل جائیگا دم اپنا

بہادر شاہ ظفر۔ ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر اکبر شاہ ثانی کے سب سے بڑے صاحبزادے اور خاندان مغلیہ کے آخری تاجدار تھے۔ ۲۴ اکتوبر

۱۷۷۵ء میں لال قلعہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں انھیں گرفتار کر لیا گیا اور جلاوطن کر کے رنگون بھیج دیا گیا۔ وہیں انھوں نے اپنی وہ دردانگیز غزل کہی جس کے یہ اشعار ہیں۔

لگتا نہیں ہے دل مرا اُجڑے دیار میں | کس کی بنی ہے عالمِ ناپائدار میں
کہدو ان حسرتوں سے کہیں اور جا بسیں | اتنی جگہ کہاں ہے دلِ داغدار میں
کتنا ہے بدنصیب ظفرؔ دفن کے لئے | دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

بہادر شاہ ۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو جہان فانی سے رخصت ہوئے۔ شاعری میں ظفرؔ نے بعد دیگرے عزت اللہ عشقؔ، شاہ نصیرؔ، کاظم علی بیقرارؔ، ابراہیم ذوقؔ اور غالبؔ سے اصلاح لی۔ ظفرؔ کا دیوان بہت ضخیم ہے۔

بہار ۔ ملک الشعرا مرزا محمد تقی بہار ۱۸۸۶ء میں طوس میں پیدا ہوئے۔ لیکن وہ بہار مشہدی اور بہار خراسانی مشہور ہیں۔ بہار جدید ایران کے عظیم ترین اور پالیٹکل شاعر ہی نہ تھے بلکہ ایک ممتاز مصنّف، بلند پایہ صحافی اور پُرجوش و بے باک سیاسی لیڈر بھی تھے۔ بہار کا انتقال ۱۹۵۱ء میں ہوا۔ (تفصیل کے لئے میری کتاب تجلیات شہرستان فارسی دیکھیے)

بدر چاچ ۔ بدرالدین بدر جو بدر چاچ کے نام سے معروف ہیں ترکستان کے ایک شہر چاچ کے رہنے والے تھے۔ ایک عظیم الشان فاضل تھے۔ دہلی میں سلطان محمد تغلق کے ثنا خواں تھے۔

ٹیک چند بہار ۔ لالہ ٹیک چند بہار دہلی کے رہنے والے تھے۔ بہار ان کا تخلص تھا۔ لیکن وہ شاعر سے زیادہ فارسی لغات کے محقق تھے۔

سراج الدین علی خاں آرزو کے شاگرد تھے۔ فارسی لغات اور محاورات و مصطلحات پر ان کی نظر گہری تھی۔ نوادر المصادر اور بہار عجم ان کی اہم تصنیفات میں سے ہیں۔ بہار عجم فارسی زبان میں فارسی لغات کی اہم اور مقبول عام فرہنگ ہے۔ بہار کا انتقال ۱۱۸۰ھ میں ہوا۔

جامی — مولانا نورالدین عبدالرحمٰن جامی ۸۱۷ھ میں جام (ہرات) میں پیدا ہوئے۔ تمام عمر تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔ مولانا جامی کا شمار اہل اللہ میں ہوتا ہے۔ اخیر عمر میں مجذوب ہو گئے تھے۔ بہت ہی واجب الاحترام ہستی تھے۔ مولانا جامی صرف ایک عظیم ترین ہی شاعر نہ تھے بلکہ ان کو خاتم الشعراء مانا جاتا ہے۔ ان کی تصنیفات کی تعداد بڑی ہے۔ سلسلۃ الذہب، بہارستان جامی، نفحات الانس، شواہد النبوۃ، خرد نامہ سکندری، مثنوی لیلیٰ مجنوں، سبحۃ الابرار وغیرہ مولانا جامی کی مشہور کتابیں ہیں۔ ان کے تین دواوین ہیں۔ ۸۹۸ھ میں راہیٔ جنّت ہوئے۔

جلال اسیر — مرزا جلال الدین اسیر جو جلال اسیر کے نام سے مشہور ہیں اصفہان کے سادات میں سے تھے۔ شاہ عباس والیٔ ایران کی مصاہرت کا اعزاز رکھتے تھے۔ ہمیشہ ارباب کمال کی صحبت میں رہا کرتے تھے لیکن کثرت مے نوشی کی وجہ سے عمر کا پیمانہ عین جوانی میں ۱۰۴۹ھ میں لبریز ہو گیا۔ ابو طالب کلیم کہتے ہیں۔

میرزاے ما جلال الدیں بس است | از سخن سنجاں طلبگارِ سخن
راستیٔ طبعِ اُستادِ من است | کج نہم بر فرق دستارِ سخن

جلال لکھنوی — حکیم سید ضامن علی جلال ۱۲۵۰ھ میں لکھنؤ ہی میں

پیدا ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد رامپور گئے۔ اور نواب یوسف علی خاں
کی قدر دانی سے فیضیاب ہوئے۔ نواب کلب علی خاں والیِ رامپور ہوئے تو انھوں نے
جلال کو سو روپے ماہوار تنخواہ پر مستقل طور پر ملازم رکھ لیا۔ کلب علی خاں کی وفات
کے بعد منگرول کے نواب کی طلبی پر جلال منگرول گئے۔ مگر آب و ہوا راس نہ آئی لکھنؤ
واپس آگئے۔ ۱۹۰۹ء میں وفات پائی۔ چار دواوین کے علاوہ کئی مفید کتابیں
ان کی تصنیفات ہیں۔

جلالائے طبا طبائی۔ مرزا جلالہ طبا طبائی اصفہان کے رہنے والے
تھے۔ ۱۰۴۲ھ میں ہندوستان آئے اور شاہ جہاں بادشاہ کی سرکار سے وابستہ
ہو کر درباری مؤرخین میں شامل ہوئے۔ پانچ برس تاریخ نویسی کا کام انجام دیتے
رہے۔ اب جلالہ کے مخالفین نے ان کے خلاف سازش کرنی شروع کی اور جلالہ
کو اس کام سے محروم ہونا پڑا۔ "شش فتح کانگڑہ" جلالہ کے رشحات قلم کا نتیجہ ہے۔
اس میں شاہ جہاں کی شاندار فتح کا حال لکھا ہے اور کمال یہ کیا ہے کہ ایک واقعہ کی
تحریر میں چھ قسم کا طرز تحریر اختیار کیا ہے۔

جعفر علی خاں اثر۔ نواب جعفر علی خاں اثر ۱۸۸۵ء میں لکھنؤ میں
پیدا ہوئے۔ اثر صاحب موجودہ دور میں دبستان لکھنؤ کی آبرو تھے۔ بہت
پرگو اور قادر الکلام شاعر ہونے کے علاوہ محاورات و مصطلحات پر ان کی عالمانہ
نظر تھی۔ انھوں نے نظم و نثر میں مختلف اصناف اور موضوعات پر بہت کچھ
لکھا۔ انتقادِ شعر و ادب کے موضوع پر ان کی مطبوعہ کتابوں میں "اثر کے تنقیدی
مضامین"، "چھان بین"، "مطالعہ غالب" اور "انیس کی مرثیہ نگاری" خاص

وقعت اور اہمیت رکھتی ہیں۔ کئی سال قبل انتقال ہوا۔

جواں بخت ۔ مرزا جواں بخت آخری تاجدار دہلی ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ ظفر کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے اور نواب زینت محل کے بطن سے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد جب بہادر شاہ کو جلا وطن کرکے رنگون بھیج دیا گیا تو نواب زینت محل اور میرزا جواں بخت بادشاہ کے ساتھ تھے۔ ۱۸۸۴ء میں برما میں قید حیات سے چھوٹے۔

چودھری عبدالغفور سرور ۔ چودھری عبدالغفور سرور مارہرہ کے رہنے والے تھے اور مارہرہ کے پیر صاحب حضرت صاحب عالم کے جن کو غالب پیر و مُرشد لکھا کرتے تھے ملنے والے بلکہ ہم مشرب تھے۔ چودھری صاحب غالب کے محبوب شاگردوں میں تھے۔ عود ہندی میں سرور کے نام غالب کے پچیس خطوط ہیں۔ اس کی ترتیب میں سرور کا بھی ہاتھ تھا اور ان کا لکھا ہوا ایک دیباچہ بھی شامل ہے۔

حافظ شیرازی ۔ خواجہ شمس الدین حافظ شیراز میں پیدا ہوئے۔ خواجہ صاحب کے وقت میں ایران کی فضا شاعروں کی نوا پردازیوں سے گونج رہی تھی۔ خواجہ صاحب بھی شاعری کی طرف متوجہ ہوئے اور وہ غزل سرائی کی کہ ان کی مستی خیز ترانوں کے آگے تمام شعرائے متغزلین حتیٰ کہ شیخ سعدیؒ کی غزلیں بھی ماند پڑ گئیں۔ خواجہ صاحب کی غزلیات نہ صرف مشرقی دُنیا میں بلکہ مغربی دُنیا میں بھی بڑی مقبولیت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔ جرمن اور انگریزی زبانوں میں منتخب غزلوں کے بیسیوں ترجمے

معلومات افزا مقدمات کے ساتھ شائع ہوتے رہے ہیں اور اب تک ہو رہے ہیں۔ خواجہ صاحب کو لسان الغیب کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ خواجہ صاحب ۷۹۱ھ میں دار بقا کو رخصت ہوئے۔

حزیں ۔ شیخ محمد علی حزیں اصفہان میں پیدا ہوئے اور وہیں پروان چڑھے۔ نادر شاہ کے ہنگامے کے ایام میں ہندوستان آئے اور چودہ برس دہلی میں رہ کر بنارس میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ۱۱۸۰ھ میں بنارس میں وفات پائی۔ زبان و بیان اور معانی کے لحاظ سے حزیں کا کلام بہت بلند پایہ ہے۔ حزیں آدمی بہت بد دماغ متکبر اور متعصب تھے۔ حزیں ہندوستان کے تمام فارسی شاعروں کو حتیٰ کہ امیر خسرو کو بھی پوچ گو کہتے تھے۔ خان آرزو نے تنبیہ الغافلین میں ان کے تقریباً چار سو شعروں پر اعتراض کئے ہیں۔

حسین واعظ الکاشفی ۔ مُلّا حسین واعظ الکاشفی قرن نہم کے معروف ترین ارباب علم و دانش میں شمار ہوتے ہیں شہر سبزوار (ایران) میں پیدا ہوئے۔ بہت خوش گفتار اور وسیع العلم واعظ تھے۔ ان کی تصانیف میں جواہر التفسیر، تحفۃ الامیر، اخلاق محسنی اور انوار سہیلی گراں قدر کتابیں ہیں۔ ۹۱۰ھ میں آپ کا وصال ہوا۔

حکاک ۔ مرزا منعم متخلص بہ حکاک شیراز کے رہنے والے تھے۔ شاہجہاں کے عہد میں ہندوستان آئے اور عالمگیر کے اوائل عہد میں دُنیا سے سدھارے۔

خاقانی ۔ خاقانی نے اپنا نام ابوالعلا بدیل بتایا ہے۔ ۵۰۰ھ میں شروان میں پیدا ہوئے۔ علوم عربیہ وفنون فارسیہ کے علاوہ علم نجوم کے بھی ماہر تھے۔ شروان کے بادشاہ خاقان اکبر فخرالدین منوچہر اور منوچہر کے بیٹے خاقان کبیر جلال الدین اخستان کے دربار میں دبیری اور ملک الشعرائی کے عہدے پر فائز تھے۔ قصیدہ گوئی اور شاعری میں خاقانی کا دعویٰ تھا کہ

مالک الملک سخن خاقانیم کز گنج نطق
دخل صد خاقاں سزد یک نکتۂ غرائے من

خاقانی کو رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بڑی محبت تھی۔ وہ حضورؐ کی تعریف میں بڑی آن بان سے قصیدے لکھا کرتے تھے اور اسی وجہ سے وہ اپنے کو حسان العجم کہتے تھے اور اپنے کو شاعرالنبی حسان عرب کا جانشین اور وارث سمجھتے تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

چوں بدر مصطفیٰ نائبِ حسان توئی
فرض بود نعت او حرز ایم ساختن

خاقانی ۵۹۲ھ میں فوت ہوئے۔

خان آرزو ۔ سراج الدین علی خاں آرزو ولد شیخ حسام الدین ۱۶۱۹ء میں آگرے میں پیدا ہوئے۔ جوانی میں گوالیار میں منصب دار مقرر ہوئے۔ ۱۷۵۵ء میں لکھنؤ میں وفات پائی۔ خان آرزو کے وقت میں شیخ علی حزیں ایران سے ہندوستان آئے۔ اتفاق سے ایک موقع پر

آرزو اور حزیں میں ملاقات ہوگئی۔ آرزو حزیں کے تکبر اور لسانی تعصب سے بہت بد دل ہوئے اور حزیں کا گھمنڈ توڑنے کے لئے اپنی کتاب تنبیہ الغافلین میں حزیں کے تقریباً چار سو شعروں پر اعتراض کئے۔ وارستہ سیالکوٹی اپنے رسالہ مطلع السعدین میں آرزو کے اعتراضوں کی تردید کی ہے۔ حزیں کی مخالفت میں آرزو کا دوسرا رسالہ احقاق الحق تھا جس کی تردید میں امام بخش صہبائی نے اعلاء الحق لکھا تھا۔ خان آرزو اگرچہ فارسی کے شاعر تھے لیکن اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ ان کو ریختہ گوئی سے اس حد تک دلچسپی تھی کہ اپنے مکان پر چاند کی ہر پندرہویں کو مشاعرہ بنام "مراختہ" کرتے تھے۔ میر حسن خاں آرزو کو امیر خسرو کے بعد ہندوستان کا سب سے بڑا شاعر خیال کرتے تھے۔ میر تقی میر کہتے ہیں کہ خان آرزو کے وقت میں خان آرزو سے بڑھ کر کوئی محقق اور شیریں بیان شاعر نہ تھا۔ تمام تذکروں میں خان آرزو کی بڑی شاندار تعریفیں پائی جاتی ہیں۔

خلیفہ (صاحب انشائے خلیفہ) خلیفہ محمد شاہ متخلص بہ خلیفہ کے خطوط کا ایک مجموعہ انشائے خلیفہ کے نام سے موجود ہے جو میری نظر سے گذرا ہے۔ عبارت آرائی اور طبع زاد اشعار سے خطوط کو زیب دیتے ہیں۔ تاریخ تدوین کے سلسلے میں کہتے ہیں

در سلک نثر چوں درِ ناسفتہ سفتہ شُد
"مجموعۂ فضائل" تاریخ گفتہ شُد

یعنی ۱۰۹۰ھ سال تدوین ہے۔ یہ مجموعہ چار فصلوں پر مشتمل ہے

فصل اول مشتمل بر مکتوبات فصل دوم مشتمل بر رقعات، فصل سوم مشتمل بر مراسلات تہنیت آمیز و مکتوبات تعزیتی۔ فصل چہارم مشتمل بر آداب و القاب و خاتمہ کتاب۔

خواجہ حاجی۔ غالب کے مورث اعلیٰ ترسم خاں کے ایک بھائی رُستم خاں تھے۔ خواجہ حاجی خاں انھیں رُستم خاں کی اولاد میں تھے۔ خواجہ حاجی غالب کی سگی بہن چھوٹی خانم کے شوہر اکبر بیگ کے سگے بہنوئی تھے۔ اس طرح غالب خواجہ حاجی کے سالے کے سالے تھے۔ لیکن غالب نے اپنی پنشن کے مقدمے کے سلسلے کی درخواست میں خواجہ حاجی کو اپنے خاندان کا نوکر بتایا تھا۔ مالک رام صاحب لکھتے ہیں کہ غالب کے چچا نصراللہ بیگ کے ماتحت دو شخصوں کے علاوہ خواجہ حاجی بھی چار سو سواروں کے رسالے میں ایک افسر تھے۔ نصراللہ بیگ کی وفات پر رسالہ توڑ دیا گیا اور اس میں سے صرف پچاس سوار نواب احمد بخش والیٔ فیروز پور جھرکہ کو دے گئے تو نواب صاحب موصوف نے خواجہ حاجی ہی کو ان سواروں کا افسر بنا دیا تاکہ ان کا روزگار بنا رہے۔ احمد بخش نے خواجہ حاجی کو نصراللہ بیگ کا رشتہ دار قرار دے کر غالب کی پنشن میں انھیں بھی شریک کر دیا تھا لیکن خواجہ حاجی نصراللہ بیگ کے رشتہ دار تھے بھی تو ایسے نہیں کہ پنشن کے حق دار ہوں۔

خواجہ حسن۔ خواجہ نجم الدین حسن بن علی سجزی معروف بہ خواجہ حسن دہلوی قرن ہفتم کے ہندوستان کے مشہور شاعروں اور عارفوں میں شمار ہوتے ہیں۔ امیر خسرو کے شاگردوں میں تھے۔ سلطان محمد بن غیاث الدین

علاءالدین خلجی اور محمد تغلق شاہ کے دربار میں رہے تھے۔ انتقال ۷۲۷ھ یا ۷۳۱ھ میں ہوا۔ سعید نفیس لکھتے ہیں کہ خواجہ حسن دہلوی ہندوستان کے بہترین شاعروں میں تھے اور ان کی عارفانہ غزلیں خوب ہیں۔

خوشگو۔ بندرابن داس متخلص بہ خوشگو متھرا میں پیدا ہوئے۔ مرزا عبدالقادر بیدلؔ، محمد افضل سرخوش اور شیخ سعداللہ گلشن کی صحبت سے فیض اُٹھایا۔ شاعری میں سراج الدین علی خاں آرزو سے تلمذ تھا۔ انہوں نے سفینۂ خوشگو کے نام سے شاعروں کا ایک تذکرہ مرتب کیا تھا۔ ۱۱۷۰ھ میں عظیم آباد (پٹنہ) میں وفات پائی۔ خوشگو کا ایک مطلع ہے۔

زاہد از مستاں مصلّائے نمازی دور دار
گر برو داغِ شراب اُفتد مرا معذور دار

سعداللہ اختر نے اعتراض کیا کہ اہل زبان "داغ افتادن" نہیں بولتے دوسرا مصرعہ یوں ہونا چاہئے۔

ورنہ گر آلودۂ صہبا شود معذور دار

خوشگو نے ایک مثنوی میں اس اعتراض کا جواب دیا جس کی تین ابیات یہ ہیں۔

حضرتِ صائبؔ کہ قربانند خورشید وشش — سُرمۂ چشم صفاہانست خاک درگہش
آنکہ باشد ہر زباندان را کلامش معتمد — ہم چوں قول شرع کامد در اصول دین سند
"داغ می گلگل بطرفِ دامنم افتادہ است — ہمچو مینا میکشی برگردنم افتادہ است"

داغ۔ مرزا خاں داغ ۱۸۳۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ نواب

شمس الدین احمد خاں والیِ فیروز پور جھرکہ داغ کے والد اور غالب کے چچیرے سالے تھے۔ بہادر شاہ ظفر کے بیٹے مرزا فخرو داغ کے سوتیلے باپ تھے۔ لہٰذا داغ اپنی والدہ کے ساتھ جو مرزا فخرو کی اہلیہ بن چکی تھیں لال قلعہ میں رہتے تھے۔ شاعری میں ذوق کے شاگرد تھے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد پورے خاندان کے ساتھ رامپور چلے آئے۔ نواب یوسف علی نے انھیں نوکر رکھ لیا۔ نواب کلب علی کے بعد داغ حیدرآباد میں میر محبوب علی نظام کے اُستاد مقرر ہوئے اور بیش قرار تنخواہ اور انعامات پانے لگے۔ ۱۹۰۵ء میں انتقال ہوا۔ گلزار داغ، آفتاب داغ، مہتاب داغ اور یادگار داغ ان کے کلام کے مجموعے ہیں۔

دقیقی۔ ابو منصور محمد بن احمد دقیقی طوسی سامانی دور کے آخری عظیم شاعر تھے۔ فردوسی سے پہلے نوح بن منصور امیر سامانی کی فرمائش پر منظوم شاہنامہ لکھنا شروع کر دیا۔ لیکن وہ ابھی ایک ہی ہزار اشعار اور حضرت زرتشت کے ظہور کا واقعہ لکھ پائے تھے کہ اپنے غیر فطری مذاق کی وجہ سے اپنے خوبصورت غیرت مند غلام کے ہاتھ سے مارے گئے۔ دقیقی کی موت ۳۶۷ھ اور ۳۷۰ھ کے درمیان واقع ہوئی۔ دقیقی کے اشعار فردوسی کے ہاتھ لگے اور فردوسی نے ان اشعار کو پیش نظر رکھ کر شاہنامہ لکھ ڈالا۔ دقیقی کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ وہ فی الواقع زرتشتی تھے اور استدلال ان کے اس قطعہ سے کیا جاتا ہے۔

دقیقی چار خصلت برگزیدہ   بگیتی از ہمہ خوبی و زشتی

لب یاقوت رنگ و نالۂ چنگ　　مے خوں رنگ و دین زردہشتی

پروفیسر براؤن کہتے ہیں دقیقی نے دین زرتشتی کے قبول کا اظہار فقط اس لئے کیا ہے کہ اس دین میں شراب جائز ہے۔

ذوق۔ شیخ ابراہیم ذوق ۱۷۸۹ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ شعر گوئی میں مصروف ہوئے تو پندرہ سولہ برس کی عمر میں کافی شہرت حاصل کر لی۔ جب شاہ نصیر اور کاظم حسین بیقرار دہلی سے باہر چلے گئے، تو اکبر شاہ بادشاہ دہلی نے ذوق کو ابوظفر سراج الدین ظفر کا اُستاد بنایا۔ اُنیس برس کی عمر میں اکبر شاہ کی تعریف میں ایسا معرکۃ الآرا قصیدہ لکھا کہ بادشاہ موصوف نے انھیں خاقانی ہند کا خطاب عطا کیا اور ملک الشعرا بنا دیا۔ بہادر شاہ ظفر جب بادشاہ بنے تو ذوق کے اعزاز اور امارت میں اضافہ ہونے لگا اور باوقار لوگ ان کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہونے لگے۔ غالب اور ذوق میں حد درجہ رقابت تھی۔ غالب ذوق کے اعزاز دیکھ کر کڑھا کرتے تھے اور اور کبھی کبھی چوٹیں کر کے تسکین کر لیتے تھے۔

رشید الدین وطواط۔ رشید الدین وطواط بلخ میں پیدا ہوئے اور وہیں عربی و فارسی ادبیات میں مہارت حاصل کی۔ بعد کو علاء الدین اتسز کی قربت حاصل کی اور موصوف کے درباری انشا پرداز رہے۔ اپنے زمانے میں فارسی و عربی شعر گوئی میں شہرت حاصل کر چکے تھے۔ تمام اہلِ کمال انھیں عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ رشید الدین کا شمار ایران کے عظیم ترین شاعروں میں ہوتا ہے۔ ۵۷۳ھ میں سفر آخرت اختیار کیا۔

رضا علی وحشت۔ سید رضا علی وحشت ۱۸ نومبر ۱۸۸۱ء کو کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ اسلامیہ کالج کلکتہ یعنی موجودہ مولانا آزاد کالج کلکتہ اور برابورن کالج کلکتہ میں اُردو اور فارسی کے پروفیسر رہے۔ انگریزی حکومت کی طرف سے خان بہادر اور خاں صاحب کے خطابات ملے۔ ۱۹۵۰ء میں مشرقی پاکستان کے دارالحکومت ڈھاکہ میں مقیم ہوگئے۔ جمعہ بیس جولائی ۱۹۵۶ء کو انتقال فرمایا۔ زندگی بھر غالب کے رنگ شاعری کی تقلید کرتے رہے۔ بقول نیاز فتحپوری "وحشت اپنے تغزل کی سنجیدگی، معنی آفرینی اور دلکش فارسی ترکیبوں کے استعمال سے غالب اسکول کے نہایت کامیاب شاعر سمجھے جاتے ہیں"۔ ترانۂ وحشت ان کا مجموعہ کلام ہے۔ (تفصیل کے لئے میری کتاب نساخ سے وحشت تک دیکھئے)

رضا قلی خاں ہدایت۔ رضا قلی خاں ہدایت طبرستانی ۵ محرم ۱۲۱۵ھ میں شہر طہران میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد مازندراں میں سکونت پذیر ہوگئے۔ جوانی ہی سے شعرگوئی کی طرف مائل ہوئے۔ بادشاہ ایران فتح علی شاہ نے خان اور ملک الشعرا کے خطابات عنایت کئے اور ملک الشعرا صبا کے بعد ہدایت کو ملک الشعرائی کا منصب عطا کیا گیا۔ ناصر الدین شاہ نے ہدایت کو خوارزم میں سفیر بنا کر بھیجا۔ مثنویات ستہ ضروریہ، بحر الحقائق۔ رئیس العاشقین۔ خرم بہشت۔ ہدایت نامہ۔ مجمع الفصحا اور فرہنگ انجمن آرائے ناصری ہدایت کی تصنیفات ہیں۔ ۱۲۸۸ھ میں وفات پائی۔

رفیع الدین لنبانی۔ رفیع الدین مسعود لنبانی (نواح اصفہان)

کے رہنے والے تھے۔ عراق کے مشاہیر شعرا میں تھے۔ ۲۳۰ھ میں ملک عدم کو سدھارے۔

رودکی ۔ ابو عبداللہ جعفر بن محمد رودکی سمرقندی فارسی شاعروں کے باوا آدم سمجھے جاتے ہیں۔ ایران کے اولین عظیم شاعر ہیں۔ مختلف اصناف سخن خلاً قصیدہ، رُباعی، مثنوی، قطعہ وغیرہ میں مہارت رکھتے تھے۔ اچھے موسیقار بھی تھے۔ سلاطین سامانی کے مصاحبت سے منسلک رہے اور بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ زندگی بسر کی۔

زلالی خوانساری ۔ ملا زلالی خوانساری استرآباد کے میر محمد باقر داماد معروف بہ میر داماد کے مدّاح اور شاہ عبّاس کبیر کے ملک الشعرا تھے۔ انھوں نے سات مثنویاں لکھی تھیں۔ ان سات مثنویوں کو زلالی کی بلند خیالی اور طرز آفرینی کا سبعہ سیّارہ سمجھا جاتا ہے۔ ان میں مثنوی "محمود و ایاز" سب سے زیادہ مقبول ہوئی اور ایک مثنوی "میخانہ" ہے۔ زلالی کا انتقال ۱۰۳۱ھ میں اور بقول پروفیسر براؤن ۱۰۲۴ھ میں ہوا۔

سروجنی نائڈو ۔ سروجنی نائیڈو صاحبہ بنگال کے ایک اعلیٰ خاندان میں پیدا ہوئیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ ۱۹۲۵ء میں آل انڈیا نیشنل کانگرس کی صدر منتخب ہوئیں۔ آزادی کے بعد اُتر پردیش کی گورنر ہوئیں۔ نائڈو صاحبہ کو انگریزی زبان پر اس قدر قدرت حاصل تھی کہ وہ انگریزی زبان میں اعلیٰ درجے کی شاعری کرتی تھیں۔ انگلینڈ کے انگریز ناشر نے ان کی نظموں کا مجموعہ شائع کیا۔ نائیڈو صاحبہ کو بلبل ہند کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

سعدی ۔ شیخ سعدی ۶۰۵ یا ۶۰۶ ہجری میں شیراز میں پیدا ہوئے۔ دربارِ اتا بکانِ فارس میں بڑی قدر و منزلت حاصل تھی۔ سعدی کا شمار فارسی کے عظیم ترین شاعروں میں ہوتا ہے۔ یہ مسلم الثبوت غزل کے پیغمبر ہیں۔ انھوں نے صنفِ غزل کو نہ صرف ترقی دی بلکہ اس کی تکمیل بھی کی۔ لیکن ان کی غزلیات ان کی اخلاقیات کی کتابوں گلستاں و بوستاں کے آگے ماند پڑ گئیں۔ سعدی کی گلستاں و بوستاں صرف مشرق میں نہیں بلکہ مغرب میں بھی بڑی مقبول ہیں اور سعدی اپنی انھیں دو کتابوں کی وجہ سے مشہور عالم ہیں۔ ۶۹۱ھ میں رحلت فرمائی۔

سید غلام علی وحشت ۔ سید غلام علی وحشت خلف میر فرحت اللہ خاں مراد آباد میں پیدا ہوئے۔ لیکن بنارس اور شاہ جہاں آباد میں نشو و نما ہوئی۔ بلند شہر میں ایک ممتاز انگریزی عہدے پر فائز تھے۔ مومن خاں مومن کے شاگرد تھے۔ شاید مومن کے انتقال کے بعد غالب کو کلام دکھایا۔ ان کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

کیا مکدر کہیں وہ آئینہ رخسار ہوا
سارے عالم میں صفائی ہوئی اپنی وحشت

پھرے وحشت بھرے دل بھر کے جو دیکھا اس نے
گردشِ چشم ہوئی گردشِ دوراں مجھکو

سلیم ۔ مرزا محمد قلی سلیم طرخی طہرانی شاہجہاں کے عہد میں ہندوستان میں آئے اور میر عبد السلام مشہدی مخاطب بہ اسلام خاں کے ندیم ہوئے۔ ۱۰۵۷ھ میں فوت ہوئے۔ سلیم ایک خوشگو شاعر تھے۔ لیکن وہ دوسرے

شاعروں کے خیالات کو خوب اپنا لیتے تھے۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں۔

گفت حافظ، دید چوں کلکِ بیانم را سلیم
بلبلے برگِ گلے خوش رنگ در منقار داشت

وارستہ نے سلیم کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

دخلے کہ نکردی بکلام اللہ است   بیتے کہ نبردۂ بیت اللہ است

لیکن خود سلیم کو شکایت تھی کہ دوسرے شاعران کے چمن شاعری کو لوٹ کر اپنا چمن آراستہ کرتے ہیں۔ کہتے ہیں۔

دیوان خود بدست حریفاں مدہ سلیم   غافل مشو کہ غارت باغ تو می کنند

اس لوٹ کا الزام صائب پر بھی رکھتے ہیں۔

دیوان کیست از سخنانم تہی سلیم   تنہا نہ بر من ایں ستم از دست صائب است

سنائی۔ مجدالدین سنائی غزنوی معروف بہ حکیم سنائی فارسی کے عظیم ترین شاعروں میں ہیں۔ ۴۷۳ھ میں پیدا ہوئے۔ ابراہیم بن مسعود کے عہد میں غزنی میں تھے اور دربار سے متعلق تھے بعد کو تارک الدنیا ہو گئے۔ عمر کا بقیہ حصہ زاہدانہ و عارفانہ اشعار کہنے میں بسر کیا۔ سنائی شعرائے عارفین میں بہت بلند مقام رکھتے ہیں۔ ۵۲۵ھ میں راہی جنت ہوئے۔

سیماب۔ عاشق حسین سیماب ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۰ء میں اکبرآباد میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۸ء میں داغ دہلوی کے شاگرد ہوئے۔ ۱۹۲۹ء سے ملازمت چھوڑ کر علمی مشاغل و تصنیف میں مصروف ہوئے۔ تقسیم ہند کے بعد کراچی میں جا رہے اور وہیں ۱۹۵۱ء میں وفات پائی۔ ساز و آہنگ، سوز غم،

نفیرِ غم، کارِ امروز، دستور الاصلاح اور وحیِ منظوم سیماب کی تصانیف ہیں۔

شاہ عالم۔ شاہ عالم مارہرہ کے پیر صاحب حضرت صاحب عالم کے صاحبزادے تھے۔ سنہ ۱۲۴۰ھ میں پیدا ہوئے۔ یہ شاعری میں غالب کے شاگرد تھے اور شائق تخلص کرتے تھے۔ سنہ ۱۲۸۲ھ میں دہلی گئے اور غالب کے دولت خانے پر غالب کی زیارت کی۔

شاہ عالم بادشاہ۔ غالب کے بیان کے مطابق غالب کے دادا قوقان خاں جن شاہ عالم کے عہد میں ہندوستان آئے تھے وہ ہیں شاہ عالم ثانی جو سنہ ۱۷۶۱ء سے سنہ ۱۸۰۶ء تک بادشاہ دہلی رہے۔ شاہ عالم ثانی شاعری بھی کرتے تھے اور آفتاب تخلص کرتے تھے۔ ان کا ایک اُردو دیوان اور ایک فارسی دیوان موجود ہے۔ بڑے بڑے شاعر مثلاً سودا، میر، شاہ نصیر، انشاء اللہ، نظام الدین ممنون، عبدالرحمٰن احسان وغیرہ ان کی سرکار کے دُعاگو تھے۔

شبلی نعمانی۔ مولانا شبلی نعمانی سنہ ۱۸۵۷ء یا سنہ ۱۸۵۹ء میں ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے۔ شبلی مختلف کمالات کے جامع تھے۔ تاریخ ادب اُردو میں لکھا ہے کہ "اگر کوئی ایک شخص شاعر، فلسفی، مورّخ، ناقد، ماہرِ تعلیم، واعظ، مصلح، جریدہ نگار، فقیہ، محدث سب کچھ ہو سکتا ہے وہ ہیں مولانا شبلی نعمانی۔ سنہ ۱۸۹۲ء میں ترکی گئے تو سلطان عبدالحمید ثانی نے انھیں تمغۂ مجیدی عنایت کیا۔ پھر اسی زمانے کے قریب انگریزی حکومت نے شمس العلما کا خطاب دیا۔ بیسیوں گراں قدر علمی، ادبی، تاریخی اور تنقیدی کتابیں ان کی تصانیف ہیں۔ دار المصنفین اعظم گڈھ مولانا کی یادگار ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی جیسے جلیل الشان

صاحبِ علم و قلم مولانا شبلی کے شاگرد اور جانشین تھے۔ مولانا کا انتقال ۱۹۱۴ء میں ہوا۔

شجاع الدولہ۔ نواب شجاع الدولہ ۱۷۳۹ء سے ۱۷۵۴ء تک اودھ کے حکمراں رہے۔ انھیں کے بیٹے نواب آصف الدولہ اور نواب سعادت علی خاں تھے۔

شرف الدین علی یزدی۔ شرف الدین علی یزدی اپنے وقت یعنی قرن نہم کے مشہور علما اور تاریخ نویسوں میں تھے۔ بادشاہ شاہ رخ کے اور خاص کر ان کے بیٹے ابراہیم سلطان کے دربار میں یزدی کو بڑا اعزاز حاصل تھا۔ ابراہیم سلطان کے بعد یونس خاں کے جو مغل خوانین میں تھے ثناخواں ہوئے بعد کو عراق عجم کے حکمراں میرزا سلطان کے ندیموں میں شامل ہوئے۔ شرف الدین ۸۴۶ھ میں راہیٔ ملک بقا ہوئے۔ ظفر نامہ ان کی تالیفات میں سے ہے۔

شفائیؔ۔ شرف الدین حسین شفائی اصفہان کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد طبیب تھے۔ وہ خود بھی طبابت کرتے تھے اور شاید اسی وجہ سے شفائی تخلص اختیار کیا تھا۔ مرزا شفائی ۱۰۳۷ھ میں فوت ہوئے۔ صائب کہتے ہیں۔

در اصفہاں کہ بدرد سخن رسد صائبؔ — کنوں کہ نبض شناس سخن شفائیؔ نیست

شمس فخری۔ ملک الشعرا شمس فخری اصفہان کے رہنے والے تھے۔ نصرت الدین اتابیک لرستان کے دربار سے منسلک تھے۔ معیار نصرتی اور قصیدۂ مصنوع شمس کی تصانیف ہیں۔

شوکت بخاری۔ محمد اسحاق جو شوکت بخاری کے نام سے مشہور ہیں بخارا میں پیدا ہوئے۔ بخارا ہی میں ان کی نشو و نما ہوئی۔ برسوں ہرات اور مشہد میں

مقیم رہے۔ بہت دنوں تک میرزا سعدالدین وزیر ممالک خراسان کی مصاحبت میں اوقات گذارے۔ بعد کو شوکت نے اصفہان میں کنج تنہائی اختیار کر لیا تھا۔ میر عبدالباقی کہتے ہیں کہ شوکت کو اصفہان میں جب کبھی دیکھا روتا دیکھا اور دوسرے لوگ بھی کہتے تھے کہ ہم شوکت کو ایک زمانے سے دیکھ رہے ہیں اور اسی حال میں دیکھ رہے ہیں۔ بقول حزیں ۱۱۰۷ھ میں اور بقول صاحب مراۃ الصفا ۱۱۱۱ھ میں شوکت نے وفات پائی۔

شہاب الدین ثاقب۔ مرزا شہاب الدین ثاقب نواب ضیاءالدین خاں نیر و درخشاں کے بڑے صاحبزادے تھے۔ ۱۸۴۰ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں آنریری مجسٹریٹ تھے۔ ۱۸۶۵ء میں وفات پائی۔ غالب سے تلمذ تھا۔ ان کے چار بیٹے تھے اور چاروں ہی شاعر تھے۔

شیدا۔ نواب صدیق حسن نے تذکرہ شمع انجمن میں لکھا ہے کہ شیدا کے والد مشہد سے ہندوستان آئے تھے۔ شیدا فتحپور سیکری (علاقہ اکبرآباد) میں پیدا ہوئے اور وہیں ان کی نشوونما ہوئی۔ یہ اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد کے شاعر تھے۔ پہلے میرزا عبدالرحیم خانخاناں کی رفاقت میں رہے۔ پھر شہریار بن جہانگیر سے وابستہ ہوئے اور آخر میں شاہ جہاں کی سرکار سے منسلک ہوئے لیکن بعد کو ملازمت ترک کر دی اور کشمیر جا کر گوشہ نشیں ہو گئے۔ شیدا کا انتقال ۱۰۸۰ھ میں ہوا۔

شیدا کو اپنی شاعری پر بہت گھمنڈ تھا۔ وہ اپنے عہد کے کسی شاعر کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ انھوں نے ابوطالب کلیم اور صائب کی بھی ہجو کی ہے۔ شیدا کے

اس انداز فکر سے ان کے حریفان سخن ان سے سخت ناراض تھے۔ ایک دفعہ سب نے مل کر انھیں بھری محفل میں ذلیل کرنے کی سازش کی۔ چنانچہ اس مقصد کے تحت ایک محفل آراستہ ہوئی۔ محفل میں طالب آملی، ملّا عطائی جونپوری، انور لاہوری اور ملّا فیروز بھی شریک تھے۔ چونکہ ان میں ملّا فیروز کی یاد داشت بہت اچھی تھی اور اساتذہ کے ہزاروں شعر ان کی نوک زبان پر تھے اس لئے شیدا کی تذلیل کی ذمہ داری انھیں کو سونپی گئی۔ جب شیدا محفل میں آئے تو بڑی گرم جوشی سے ان کا خیر مقدم کیا گیا اور ان سے درخواست کی گئی کہ آپ اپنا وہ شعر سنایئے جو سب سے اچھا ہے۔ شیدا نے کہا

چیست دانی بادۂ گلگوں مصفّا جوہرے
حسن را پروردگارے عشق را پیغمبرے

ملّا فیروز بول اٹھے کہ شعر تو ماشاء اللہ بہت خوب ہے مگر رودکی کہتا ہے۔

عشق را پیغمبر ولیکن — حسن را آفریدگار توئی

اس پر شیدا نے دوسرا شعر سنایا۔

زبسکہ کردہ غمت بند در جگر ناخن — چو پشت ماہیم از پائے تا بسر ناخن

ملّا فیروز بولے کہ یہ مضمون غیاثائے حلوائی کا ہے۔ غیاثا کہتا ہے۔

از بسکہ سینہ کندم و ناخن بران نشست — چو پشت ماہی است سر و پائے سینہ ام

اب شیدا نے ذرا جھنجھلا کر تیسرا شعر سنایا۔

گر بصحرا موفشانی دشت پر سنبل شود — ور بدریا رو بشوئی خار ماہی گل شود

ملّا فیروز کہنے لگے کہ یہ مضمون تو کاتبی کا ہے۔ کاتبی کہتا ہے۔

گر بدریا اُفتد از عکسِ جمالِ او فروغ　　خار ماہی آورد در قعر دریا پا بگل

شیدا نے بگڑ کر یہ شعر سُنایا۔

ذاتِ تو بود صحیفۂ کون کہ کرد　　از روئے ادب مہر خدا بر پشتت

مُلّا فیروز نے کہا کہ کاتبی نے کہا ہے۔

نبوت را توئی آں نامہ در مُشت　　کہ از تعظیمش آمد مہر بر پشت

اب شیدا نے یہ شعر سُنایا

زُلف او را رشتۂ جاں گفتم و گشتم خجل　　زانکہ ایں معنی چو زلفش پیش پا افتادہ است

مُلّا فیروز بولے کہ ہاتفی آپ سے پہلے کہہ چکا ہے۔

کس نیاورد مصرعۂ پیچیدۂ زلف کجت
گرچہ ایں مضموں تُرا در پیش پا اُفتادہ است

اس پر شیدا بہت ناراض ہوئے اور اصرار کے باوجود اور کوئی شعر نہیں سُنایا۔

شیکسپیر۔ ولیم شیکسپیر ۱۵۶۴ء میں پیدا ہوئے۔ انگلینڈ کے سب سے بڑے اور دُنیا کے سب سے مشہور و مقبول ڈرامہ نویس ہیں۔ ڈرامہ نویس کے علاوہ بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ ۱۶۱۶ء میں ان کا انتقال ہوا۔

صاحب عالم۔ صاحب عالم ۲۹ اکتوبر ۱۶۹۶ء میں بلگرام میں پیدا ہوئے۔ یہ فرزند احمد صغیر بلگرامی کے نانا تھے۔ صاحب عالم مارہرہ (ضلع ایٹہ) میں سجادہ نشیں تھے۔ شاعری میں مرزا قتیل کے علاوہ اپنے ماموں سید ذوالفقار علی ذرہ سے اکتساب فن کیا۔ غالب ان کا حد درجہ احترام کرتے تھے۔

غالب کو صاحب عالم سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔ آپ نے ۲۴ مارچ ۱۸۹۱ء کو دُنیائے فانی سے کوچ فرمایا۔

صادق خاں اختر ۔ قاضی صادق خاں اختر ضلع ہوگلی (مغربی بنگال) کے ایک قاضی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام قاضی لعل محمد خاں تھا۔ جوانی کے ایام میں غازی الدین حیدر شاہ اودھ کے زمانے میں لکھنؤ میں متوطن ہو گئے۔ لکھنؤ میں ان کی بڑی قدر ہوئی۔ غازی الدین حیدر نے انھیں ملک الشعرا کا خطاب دیا۔ اختر مرزا قتیل کے شاگرد تھے۔ آفتاب عالمتاب کے نام سے فارسی شاعروں کا ایک تذکرہ مرتب کیا تھا جس کے لئے غالب سے بھی حالاتِ زندگی اور منتخب کلام مانگا تھا۔ غالب نے جواب لکھا تھا کہ "جو کچھ برا بھلا کلام تھا وہ سب ایک دیوان میں جمع کر لیا گیا، اس سے انتخاب فرمائے، جب آپ خود صاحب ذوق ہیں تو یہ کام آپ ہی کیجئے۔ رہا حالات کا لکھنا، سو میرے نزدیک یہ لکھ دیجئے تو مجھ پر احسان ہوگا۔ از ناکسان روزگار و بیکسان دہلی دیار، مسلمان زادہ ایست کہ فرماجراو گبرے مسلمان نماکہ غلط نمائی غالب تخلص می کند۔"

قاضی صاحب فارسی اور اُردو دونوں میں شعر کہتے تھے۔ انتقال ۱۸۵۹ء میں ہوا۔ قاضی صاحب کی گیارہ تصنیفات ہیں جن میں ایک دیوان فارسی اور ایک دیوان ریختہ بھی ہے۔ ان کو شعبدہ بازی کے فن میں بھی کمال حاصل تھا۔

صائب ۔ مرزا محمد علی صائب کی ولادت ۱۰۱۰ھ میں تبریز میں ہوئی۔ عین جوانی میں وطن سے نکل پڑے۔ ناظم کابل ظفر خاں کی رفاقت میں رہنے کا

جو موقع ملا تو اپنے حُسن اخلاق سے ظفر خاں کا دل جیت لیا۔ خان موصوف نے صائب کو اعزاز پر اعزاز بخشا۔ جہانگیر بادشاہ کے عہد کے اواخر میں ہندوستان آئے۔ جب وہ برہان پور میں مقیم تھے تو ان کے والد ہندوستان آئے اور ان کو وطن واپس لے گئے۔ صائب تا حین حیات سلاطین صفویہ کی نظر میں معزز و مکرم رہے۔ ۱۰۸۰ھ میں دار فانی کو چھوڑا۔ صائب اپنی شاعری کے بارہ میں کہتے ہیں۔

زصد ہزار سخنور کہ در جہاں آید　　　　یکے چو صائب شوریدہ حال برخیزد

صدرالدین آزردہ ۔ مفتی صدرالدین آزردہ ۱۷۸۹ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ آزردہ کے وقت میں علم و ادب میں جامعیت کے اعتبار سے دہلی میں آزردہ کی ٹکر کا کوئی عالم نہ تھا۔ غالب نے ان کو علامۂ روزگار اور ختم العلماء المتبحرین کے لقب سے یاد کیا ہے۔ عہدۂ صدر الصدور پر فائز تھے اور یہ عہدہ اس زمانے میں سب سے بڑا عہدہ تھا۔ مفتی صاحب کو درس و تدریس سے اس حد تک شغف تھا کہ اپنے فرائض منصبی انجام دینے کے بعد درس و تدریس میں مصروف رہتے تھے۔ عربی، فارسی اور اُردو تینوں زبانوں پر قدرت حاصل تھی اور تینوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ آزردہ غالب کے بہت بڑے دوست اور خیر خواہ تھے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں آزردہ نے بھی مولوی فضل حق خیرآبادی کے فتوی جہاد پر دستخط کئے تھے۔ لہٰذا غدر کے بعد یہ بھی مورد الزام ٹھہرے۔ ان کی جائداد ضبط ہو گئی۔ مگر بعد کو نصف واپس مل گئی۔ زندگی کا آخری حصہ پریشانیوں میں گزار کر ۱۸۶۸ء میں وفات پائی۔

ضیاءالدین نیر درخشاں ۔ نواب ضیاءالدین احمد خاں نیر درخشاں

نواب احمد بخش خاں والئ فیروز پور جھرکہ کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ ان کو لوہارو کی ریاست سے اٹھارہ ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ ملتا تھا جو گھٹ کر بارہ ہزار ہوگیا تھا۔ ضیاء الدین بڑے صاحب علم تھے اور ان کو علم نجوم و علم ہیئت، جغرافیہ اور تاریخ میں دستگاہ حاصل تھی۔ ان کا ذاتی کتب خانہ اس وقت دہلی کا سب سے بڑا کتب خانہ تھا۔ اُردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی میں نیّر اور اُردو میں رخشاں تخلص کرتے تھے۔ چچیرے سالے کے علاوہ غالب کے شاگرد بھی تھے۔ شاعری میں غالب نے ان کو اپنا خلیفۂ اوّل اور ان کے بھتیجے علائی کو خلیفۂ دوم بنایا تھا۔ انتقال ۲۷ جون ۱۸۸۹ء میں ہوا۔

طالب آملی۔ طالب آملی مازندران کے ایک مقام آمل کے رہنے والے تھے۔ آمل سے نکل کر ہندوستان کا رُخ کیا۔ کچھ دنوں جہانگیر بادشاہ کی طرف سے ناظم قندھار میرزا غازی کے ساتھ رہے اور میرزا غازی کی نوازشوں سے مالا مال ہوتے رہے۔ میرزا غازی کے انتقال کے بعد ناظم گجرات عبداللہ خاں کے ساتھ رہے۔ بعدہٗ جہانگیر کے زیر عاطفت رہے اور ملک الشعرا کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ عین جوانی میں ۱۰۳۶ھ میں فوت ہوگئے۔

طاہر وحید۔ مرزا محمد طاہر وحید قزوینی اپنے عہد میں علوم و فنون اور نظم نگاری و انشاپردازی میں یکتائے زمانہ تھے۔ شاہ عباس ماضی والیِ ایران کے دفتر نویس تھے اور ترقی کرکے وزارت کے عہدے پر پہنچ گئے تھے۔ ان کا دیوان قریب تیس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔

ظہوری۔ نورالدین ظہوری ترشیزی کی ولادت اور نشوونما ترشیز (ایران) میں ہوئی۔ عراق و فارس کی سیاحت کرتے ہوئے دکن (ہندوستان) آئے اور بیجاپور میں اقامت گزیں ہوکر بادشاہ ابراہیم عادل شاہ کی مصاحبت سے منسلک اور شاہ موصوف کی مدح سرائی میں مصروف ہوئے۔ ساقی نامہ لکھنے پر شاہ موصوف نے ظہوری کو چند ہاتھی نقد و جنس سے لاد کر عنایت کیے۔ ظہوری صرف بلند پایہ شاعر ہی نہ تھے بلکہ بلند پایہ نثار بھی تھے۔ سہ نثر ظہوری بہت مشہور ہے۔ ملا ظہوری کا انتقال ۱۰۲۵ھ میں دکن میں ہوا۔

عاقل خاں رازی۔ رے کے رہنے والے تھے۔ اورنگ زیب کے عہد سلطنت میں ہندوستان میں آئے تھے۔

عبدالباری آسی۔ مولوی عبدالباری آسی ضلع میرٹھ کے ایک مقام الدن کے رہنے والے تھے۔ لیکن لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔ جلیل قدوائی لکھتے ہیں کہ آسی ہمیشہ تازہ بتازہ غالب کا غیر مطبوعہ کلام سنایا کرتے تھے۔ غالب کے غیر مطبوعہ اشعار ان کی نوک زبان پر رہتے تھے جو حقیقت میں غالب کے اشعار نہ تھے لیکن ان میں غالب کے فن کی چھوٹ ضرور پڑتی تھی۔ نادم سیتاپوری لکھتے ہیں کہ آسی جب لکھنؤ آئے تو اسی کے ساتھ غالب کے دیوان میں نیا اضافہ ہونے لگا۔ چنانچہ آسی نے کلام غالب میں کئی سو اشعار شامل کرکے "مکمل شرح دیوان غالب" تصنیف فرمادی۔ آسی کی ایک تصنیف "معرکہ سخن" ہے۔ اس میں شاعروں کے کلام پر اعتراضات کو جمع کیا

گیا ہے اور ان کا محاکمہ کیا گیا ہے۔

عبدالجلیل ۔ قاضی عبدالجلیل بریلوی ۱۸۳۵ء میں پیدا ہوئے۔ عہدۂ قضا پر فائز رہے۔ ان کو خان بہادر کا خطاب بھی ملا تھا۔ ۱۹۰۰ء میں دُنیا سے اُٹھے۔ غالب سے اُردو کلام پر اصلاح لیتے تھے۔

عبدالرزاق شاکر ۔ سید محمد عبدالرزاق شاکر مچھلی شہر میں پیدا ہوئے۔ شدہ شدہ سب جج اور عدالت خفیہ کے جج بن گئے۔ ۱۹۲۲ء میں سفرِ آخرت اختیار کیا۔ اُردو فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔

عبدالقادر بیدل ۔ میرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی شاہ جہاں بادشاہ کے عہدِ حکومت میں ۱۰۵۴ھ میں عظیم آباد (پٹنہ) میں پیدا ہوئے۔ اوّل شاہجہاں کے بیٹے شاہ شجاع کی سرکار سے منسلک ہوئے۔ بعد کو شاہجہاں کے دوسرے بیٹے معظم شاہ کے دربار میں پانصدی منصب پر فائز ہوئے۔ مگر جذبہ بے نیازی کے زیرِ اثر نوکری ترک کر دی اور شاہجہاں آباد جاکر گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ بیدل کا شمار عرفائے اسلام میں ہوتا ہے۔ بیدل کی شاعری متصوفانہ حقائق و معارف اور معنوی حسن و جمال کی شاعری ہے۔ ۱۱۳۰ھ میں بیدل کا وصال ہوا۔ مرزا غالب ابتدائے ریختہ گوئی میں انھیں اپنا رہبر سمجھتے تھے۔

مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں غالبؔ
عصائے خضرِ صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا

عبدالقادر رامپوری ۔ علائی کے بیان کے مطابق عبدالقادر رامپوری کالج گورنمنٹ (شاید فورٹ ولیم کالج) میں معلّم تھے اور مشاہیر میں سے تھے۔ شاید وہی عبدالقادر رامپوری ہوں جنھوں نے "بھینس کے انڈے" والا شعر کہہ کر

دیوان غالب پر اعتراض کیا۔ یہ اعتراض کرنے والے عبدالقادر رامپوری کچھ روز قلعہ معلی میں رہے تھے۔

عبداللہ قطب شاہ۔ عبداللہ قطب شاہ محمد قطب شاہ کے بیٹے اور قطب شاہی سلسلے کے چھٹے بادشاہ تھے۔ ۱۶۱۵ء میں تخت نشین ہوئے۔ ان کا دربار عرب اور عجم کے عالموں اور فاضلوں سے بھرا رہتا تھا۔ اکثر کتابیں ان کے نام سے منسوب کی گئیں۔ فارسی اور اُردو میں ان کے دیوان موجود ہیں۔ ۱۶۷۲ء میں انتقال ہوا۔

عبدالواسع ہانسوی۔ ملّا عبدالواسع ہانسوی کی قاعدہ فارسی اور گلستاں و بوستاں کی شرحیں مشہور ہیں۔ عبدالواسع قریب عالمگیر کے زمانے میں اُردو ہندی الفاظ کے معنی فارسی میں لکھے تھے۔ انھوں نے اُردو ہندی کے جو معنی لکھے تھے ایک مُدّت کے بعد سراج الدین علی خاں آرزو نے اس کی نظر ثانی کر کے غلطیاں درست کیں اور اس میں بہت سے الفاظ اضافہ کر کے نوادر الفاظ کے نام سے موسوم کیا۔

غالب نے مُلّا عبدالواسع ہانسوی کی ایک غلطی کو کئی جگہ دُہرایا ہے۔ بقول غالب عبدالواسع نے لکھا ہے کہ لفظ "بے مراد" صحیح اور "نامراد" غلط ہے۔ چنانچہ مولوی معنوی کا مصرع ہے۔

عاشقاں از بے مرادیہائے خویش

غالب کہتے ہیں کہ اہل علم جانتے ہیں کہ لفظ "بے مراد" کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ لفظ "نامراد" کی ترکیب غلط ہے۔ بے مراد کے معنی اور ہیں اور نامراد کا محل استعمال

اور بے مراد اسے کہتے ہیں کہ جس کی کوئی مراد ہی نہ ہو۔ لہٰذا یہ بے نیاز ہوتا ہے۔ نامراد وہ ہے جس کی کوئی مراد بر نہ آئی ہو۔ اسی طرح بے کس و ناکس ہے۔

عبدالہادی وفا رامپوری۔ حکیم عبدالہادی وفا رامپوری رامپور کے رہنے والے تھے۔ شاید ۱۲۸۲ھ میں پیدا ہوئے اور انتقال ۱۳۳۴ھ میں فرمایا۔ داغ اور امیر کے شاگرد تھے۔ طرز غالب کے اچھے مقلدین میں تھے۔ ایک غزل پڑھ کر دیکھیے۔

پھر رگِ شعلۂ جاں سوز میں نشتر گذرا ۔۔۔ نالہ کیوں آبلۂ دل سے الجھ کر نکلا

میں ہوں دلداریٔ افسونِ وفا پر نازاں ۔۔۔ جو رقیبوں پہ نہ گذرا تھا وہ مجھ پر گذرا

کیا محیطِ مے بیرنگ میں طوفاں آیا ۔۔۔ جوشِ رنگ انجمنِ ناز سے باہر گذرا

تشنۂ حسرت جاوید ہوں میں کیا جانوں ۔۔۔ کیوں گلے سے مرے تلخابۂ کوثر گذرا

آ دیکھ مرے دلِ افسردہ کی تمکیں دیکھو ۔۔۔ جاؤ اس کشمکشِ ناز سے میں در گذرا

لٹ گئی جان تو امید کے پہلو ڈھونڈے ۔۔۔ مٹ گئی راہ تو اندیشۂ رہبر گذرا

اس تکلف سے گئی عمر گراں مایہ وفا ۔۔۔ ایک دم سیکڑوں برسوں کے برابر گذرا

علاء الدین علائی۔ نواب علاء الدین احمد خاں علائی نواب امین الدین احمد خاں والیٔ لوہارو کے بیٹے اور نواب ضیاء الدین احمد نیر کے بھتیجے تھے۔ ۱۸۳۲ء میں دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ اردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے اور غالب کے رنگ میں کہتے تھے۔ غالب نے ان کو اپنا خلیفہ اور جانشین نمبر ۲ بنایا تھا۔

علی اکبر دہخدا۔ علی اکبر دہخدا ۱۲۹۷ھ قمری میں تہران میں پیدا ہوئے۔ دس برس کی عمر میں والد کا انتقال ہوگیا۔ والدہ نے تعلیم دلوائی۔ دو سال تک یورپ میں رہے اور وہیں رہ کر فرانسیسی زبان سیکھی اور جدید معلومات حاصل کیں۔ محمد علی شاہ

کے عہد میں تحریک مشروطیت میں حصہ لینے کی وجہ سے یورپ میں جلا وطن کر دے
گئے۔ دفتر وزارت معارف، تفتیش وزارت عدلیہ، مدرسہ عالی اور مدرسہ علوم
سیاسی میں عہدہ دار رہے۔ ۱۳۳۴ھ شمسی میں وفات پائی۔ متعدد تصانیف
ان کی یادگار ہیں۔

علی اکبر خاں طبا طبائی۔ نواب علی اکبر خاں طبا طبائی سیر المصنفین
کے مصنّف کے بھتیجے اور ہوگلی امام باڑہ کے متوَلّی تھے۔ غالب جب کلکتہ آئے تھے تو
محمد علی صدر امین باندہ و برادر سراج علی خاں قاضی القضاۃ کا خط لے کر علی اکبر خاں
کے پاس گئے تھے جس کا نتیجہ بہت خوشگوار نکلا۔ غالب ان کے بڑے مدّاح تھے
اور وہ بھی غالب پر بڑے مہربان تھے۔

عُرفی۔ شیخ جمال الدین عُرفی شیرازی شیراز سے فتحپور (ہندوستان)
آئے، اور ملک الشعرا فیضی کے ساتھ رہے۔ بعد میں فیضی کے ساتھ شکر رنجی ہو جانے
کی وجہ سے عبد الرحیم خانخاناں کی مصاحبت سے وابستہ ہوئے۔ عرفی کی شاعری
روز بروز ترقی کرنے لگی اور ساتھ ہی ان کا اعزاز بڑھنے لگا۔ لیکن افسوس کہ چھتیس
برس کی عمر میں قضا کر گئے۔ عرفی کے قصائد معرکۃ الآرا اور تغزل لئے ہوئے ہیں۔ غزل
میں بھی عُرفی کا پایہ بہت بلند ہے۔ عرفی کی معنی آفرینی اور لطافت معنی مسلم ہے۔
جہانگیر کے عہد تک زندہ رہے۔ ۹۹۹ھ میں لاہور میں وفات ہوئی۔

عمر خیّام۔ ابو الفتح غیاث الدین عمر خیام نیشاپور میں پیدا ہوئے۔
عمر خیام سلجوقی سلاطین ملک شاہ اوّل سے لے کر سلطان سنجر کے عہد تک میں تھے
اور سب سلاطین ان کے قدر داں تھے۔ عمر خیام نے فلسفہ، علم نجوم اور ریاضی

میں وہ کمال حاصل کیا مشرق و مغرب کے جملہ محققین متفق ہیں کہ وہ اپنے وقت کے سب سے بڑے فلسفی، منجم اور ریاضی داں تھے۔ شاعری عمر خیام کا پارٹ ٹائم شغل تھی۔ شعرائے مشرق میں عمر خیام کی شاعری کو یورپ اور امریکہ میں جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ کسی اور شاعر کی شاعری کو نصیب نہ ہوئی (تفصیل کے لئے میری کتاب تجلیات شورستان فارسی دیکھئے)۔

عنصری - ابوالقاسم حسن عنصری بلخ کے رہنے والے تھے۔ سلطان محمود غزنوی کے دربار کے ملک الشعرا اور دربار مذکور کے چارسو شاعروں کی انجمن کے صدر تھے۔ سلطان محمود کی قدر دانیوں سے مالا مال ہو کر کہتے ہیں۔

اگر کمال بجاہ اندرست وجاہ بمال ــــــ مرا ببیں کہ ببینی کمال را بکمال

عنصری نے ۴۳۱ھ میں اس دار فانی کو چھوڑا۔

غلام حسنین قدر - سید غلام حسنین قدر بلگرام میں ۱۸۳۳ء میں پیدا ہوئے۔ بعد کو لکھنؤ چلے گئے اور سحر کے شاگرد ہوئے۔ مرزا فتح الدولہ برق اور امداد علی بحر سے علم عروض حاصل کیا۔ آخر میں غالب کے شاگرد ہوئے۔ قدر پہلے سرکاری محکمۂ تعلیم میں ملازم ہوئے۔ ہردوئی میں مدرس رہے۔ پھر وہاں سے تبدیل ہو کر کیننگ کالج میں فارسی و عربی کے استاد مقرر ہوئے۔ ان کے قصیدے سے متاثر ہو کر نظام دکن انہیں حیدرآباد لے گئے۔ لیکن وہ وہاں جاکر بیمار پڑ گئے اور لکھنؤ واپس آکر ۱۸۸۴ء میں انتقال کر گئے۔

غلام غوث بیخبر - خواجہ غلام غوث بیخبر ۱۸۲۵ء میں پیدا ہوئے۔ لفٹنٹ گورنر غرب و شمال میں میر منشی تھے۔ خان بہادر اور ذوالقدر

خطاب تھے۔ ۱۹۰۴ء میں الٰہ آباد میں انتقال کیا۔ غالب کے بڑے معتقد اور محسن تھے۔ لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ ایک دفعہ بےخبر کے ایک دوست نے غالب سے کہدیا کہ بےخبر آپ کی قاطع برہان کی تردید میں کچھ لکھ رہے ہیں۔ غالب بہت گھبرائے اور بےخبر سے خط لکھ کر پوچھا۔ بےخبر بہت ناراض ہوئے کہ غالب کو ان کے متعلق ایسا گمان نہیں ہونا چاہیے تھا۔

غلام نجف خاں ۔ حکیم غلام نجف خاں کا اصل وطن بدایوں تھا۔ لیکن بہت کم سنی ہی میں دہلی آ گئے تھے۔ اپنے زمانے میں دہلی کے حاذق اطبا میں تھے۔ غالب ان کے منھ بولے باپ تھے۔ وہ امراؤ بیگم کو ماں کہتے تھے۔

غنی ۔ سیّد محمد طاہر غنی کشمیری مُلّا محمد محسن فانی کے شاگرد تھے۔ بہت تنگی اور تنگدستی کے باوجود حد درجہ بے نیاز اور مستغنی تھے۔ اسی مناسبت سے انھوں نے غنی تخلص اختیار کیا تھا۔ ۱۰۷۹ھ میں رحلت فرمائی۔ مستند فارسی داں اور بلند پایہ شاعر تھے۔ مرزا صائب ان کی غزل پر تضمین کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

ایں جواب آں غزل صائب کہ میگوید غنی	یاد ایامیکہ دیگ شوق ما سرپوش داشت

غنی کا دیوان اکناف عالم میں بہت مقبول ہوا۔ چند اشعار غنی۔

بزم مے پرستاں محتسب خوش عزتی دارد	کہ چوں آید بمحفل شیشہ خالی میکند جا را
رفتیم سوے یار و ندیدیم روے یار	مانند رہروی کہ رود سوئے آفتاب
نمی کند بمن ناتواں نگہ آں شوخ	ز بیم آنکہ نگویند ناتواں بین است
رفیقِ اہل غفلت عاقبت از کار می ماند	چو یک پا خفت پای دگر از رفتار می ماند

دہر چو قدسیان ز چشم او صہبائے مدہوشی	سبوئے عرش از دوش ملایک بر زمیں افتد
بادامنِ تر شدم بہ محشر	گفتند در آفتاب بنشیں
موگشت سفید و ریخت دنداں	در صبح شود ستارہ پنہاں

غنیمت۔ محمد اکرام غنیمت کنجاہ (پنجاب) کے رہنے والے تھے۔ میر محمد زماں راسخ لاہوری کے شاگرد تھے۔ ۱۱۰۰ھ میں انتقال کیا۔ غنیمت نے ایک دیوان چھوڑا ہے۔ کوئی کہتا ہے۔

چو ابیاتش پس از گفتن شمردم	باعداد "غنیمت" راہ بردم

یعنی لفظ "غنیمت" سے ان کی ابیات کی تعداد نکلتی ہے۔ دیوان میں پندرہ سو شعر ہیں۔ دیوان ۱۲۹۶ھ میں چھپا تھا۔ ان کی ایک مثنوی نیرنگ عشق" ہے۔ اس کی یہ بیت ہے۔

بنامِ شاہدِ نازک خیالاں	عزیزِ خاطرِ آشفتہ حالاں

چند اشعارِ غنیمت

نگردد قطع ہرگز جادۂ عشق از دویدن ہا	کہ می بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدن ہا
از بس خیال من خندہ لبریزِ جلوہ اش	ہر جاکہ سر بسجدہ نہم نقش پائے اوست
یار آمد آں زماں بہ سرکہ در تن جاں نماند	بخت شد بیدار ہنگامیکہ مارا خواب برد

غازی الدین حیدر۔ غازی الدین حیدر لکھنؤ کے نواب سعادت علی خاں کے فرزند تھے۔ اپنے والد کے بعد ۱۸۱۴ء میں مسند وزارت پر متمکن ہوئے۔ پانچ برس کے بعد انگریزی حکومت نے ان کو بادشاہ اودھ مانا۔ لہٰذا ۱۸۱۹ء میں ان کی تخت نشینی بھی ہوئی۔

فاخر مکیں - مرزا محمد فاخر مکیں شاہ جہاں آباد میں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے - شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کے عہد وزارت میں لکھنؤ میں ان کا مستقل قیام تھا - مرزا رفیع سودا ان کے معاصر تھے - لیکن اپنے وقت کے مشہور فارسی شاعر تھے - ان کو اپنی فارسی دانی، سخن فہمی اور ناقدانہ صلاحیت کا بہت زیادہ احساس تھا - انھوں نے ایک کتاب میں اساتذہ ایران کے اشعار پر نہ صرف اعتراض کئے بلکہ اصلاحیں بھی دیں - مرزا سودا نے ایک رسالہ عبرت الغافلین میں مرزا فاخر کی غلط فہمیوں کو اصول انشا پردازی کے بموجب کما حقہ ظاہر کیا - فاخر مکیں کا انتقال ۱۲۳۰ھ ہوا - اشعار مکیں -

در کوے یار طرفہ تماشا بود مکیں ۔۔۔ رسوا شود کسے و تماشا کند کسے

دل چاک چاک دیدہ گریانم ایں چنیں ۔۔۔ کشتی ہزار رخنہ و طوفانم ایں چنیں

فخرالدین حسین سخن - خواجہ فخرالدین سخن دہلوی ۱۲۵۸ھ کے لگ بھگ دہلی میں پیدا ہوئے - شادی کر کے آرہ میں رہ پڑے اور وکالت کا پیشہ کرتے رہے - بعد میں منصف اور سب جج ہو گئے - رشتے میں غالب کے نبیرہ تھے - بچپن میں غالب سے اردو اور فارسی پڑھی تھی - ۱۹۰۰ء میں کلکتہ میں انتقال کیا - ان کا دیوان ۱۸۶۵ء میں چھپا - سروش سخن نثر میں ان کا ایک افسانہ ہے -

اشعار سخن سے

وعدہ ہی کر کے ہائے نہ تسکین دو مجھے ۔۔۔ یہ بھی دعا کرو کہ خدا اعتبار دے

اس بت کو بھی دعویٰ ہوا یکتائی کا اپنی ۔۔۔ اللہ تری شان خدائی نظر آئی

یوں ناز تو ہر ایک ترا قہر ہے لیکن ۔۔۔ اک بات نئی ہے ترے بے ساختہ پن میں

اس کے آنے کی مسرت ہے مگر فکر ہے یہ　　کیا کہوں گا جو مرے حال کا پرساں ہوگا

فخر الدین گرگانی۔ فخر الدین گرگانی پہلے گرگان میں رہے۔ پھر طغرل و ملک شاہ کے درباری شاعروں میں شامل ہوئے۔ ۴۴۲ھ میں دنیا سے کوچ کیا۔

فرخی۔ ابوالحسن علی فرخی سیستانی پہلے ابوالمظفر احمد بن محمد امیر چغانیاں کے دربار سے وابستہ رہے۔ پھر سلطان محمود غزنوی کے درباری شاعروں میں شامل ہوئے۔ شاعری کے علاوہ موسیقی میں بھی مہارت حاصل تھی۔ ۴۲۹ھ میں رحلت کی۔

فردوسی۔ ابوالقاسم منصور فردوسی ۹۳۴ء میں طوس میں پیدا ہوئے۔ سلطان محمود غزنوی کے دربار سے منسلک ہو کر تیس پینتیس برس میں شاہنامہ مکمل کیا جس کے ذریعہ سے انھوں نے زرتشتی ایران کے شاندار ماضی اور ایرانی قوم کو از سر نو زندہ کر دیا۔ اسی وجہ سے اہل ایران شاہنامہ کو قرآن عجم کہتے ہیں اور فردوسی کو اپنا نیشنل ہیرو، مورخ اعظم، مجدد اکرم اور جنگ آزادی کا اولین و عظیم ترین مجاہد مانتے ہیں اب فردوسی کی عظمت کا احساس اس قدر نازک ہو گیا ہے کہ ایرانی محققین یہ بھی ماننے کو تیار نہیں ہیں کہ فردوسی کو محمود غزنوی کے دربار سے کسی قسم کا تعلق تھا۔ سعید نفیس لکھتے ہیں کہ "فردوسی کو شعرائے دربار محمود میں محسوب کرنا بڑا فاحش ظلم ہے جو فردوسی پر کیا جاتا ہے۔ فردوسی محمود کے دربار سے یا کسی بھی دربار سے وابستہ نہ تھے۔ طوس میں ان کی آبائی جائداد تھی جس کی آمدنی پر فردوسی گذارہ کرتے تھے اور شاہنامہ لکھتے تھے۔" لیکن میرے خیال میں صرف قدیم روایات سے انکار کر دینا ہی کافی نہیں بلکہ انکار بدلیل ہونا چاہیے۔

فسونی۔ محمود بیگ فسونی تبریزی شاہ عباس بادشاہ ایران کے مدح گو شاعروں میں تھے۔ ہندوستان میں آکر اکبر بادشاہ کی سرکار سے وابستہ ہوئے۔ ۱۰۲۶ھ میں الٰہ آباد میں وفات پائی۔

فضل حق خیرآبادی۔ مولوی فضل حق خیرآبادی ۱۷۹۷ء میں خیرآباد میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان علمی وجاہت اور دُنیوی ریاست و امارت کے اعتبار سے ایک معروف خاندان تھا۔ تیرہ سال کی عمر میں تمام مروّجہ علوم عقلیہ و نقلیہ اور حفظ قرآن سے فراغت حاصل کر لی۔ مولانا فضل حق نے سیاسی سرگرمیوں میں بھی بہت بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے موقع پر جہاد کی تبلیغ شروع کر دی۔ جس کی وجہ سے وہ مجرم قرار دیے گئے اور ۱۸۵۹ء میں انھیں گرفتار کر کے جزیرہ انڈمان بھیج دیا گیا۔ وہیں ۱۸۶۱ء میں شہادت کے مرتبے کو فائز ہوئے۔

مولوی فضل حق غالب کے بڑے قدر داں دوست تھے۔ انھیں کی کوششوں سے غالب دربار رامپور سے وابستہ ہوئے اور نواب یوسف علی غالب سے اصلاح لینے اور غالب کی درخواست پر غالب کو سو روپیہ مشاہرہ دینے لگے۔

فغانی۔ فغانی شیراز کے رہنے والے تھے۔ شاہ اسماعیل صفوی والیِ ایران کے عہد حکومت میں تھے۔ ۹۲۵ھ میں انتقال فرمایا۔ شاعری میں فغانی کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ فغانی ایک خاص رنگ سخن کے موجد ہیں۔ ان سے پہلے اس رنگ میں کسی نے سخن سرائی نہیں کی۔ اکثر اساتذہ مثلاً وحشی یزدی، نظیری

نیشاپوری، ضمیر اصفہانی، حسین ثنائی، حکیم رکنا کاشی، محتشم کاشی وغیرہ فغانی کے تلامذہ اور خوشہ چین تھے۔

فقیر اللہ آفریں۔ فقیر اللہ آفریں لاہور کے باشندہ تھے۔ ۱۱۵۴ھ میں وفات پائی۔ نغز گو شاعر تھے۔ ایک ضخیم دیوان چھوڑا ہے۔ اشعار آفریں۔

دیوانگی و مستی از بوئے تو می خیزد — بہر فتنہ کہ می خیزد از کوئے تو می خیزد

شدم محو تصور بسکہ حسن بے مثالش را — بود ہر قطرۂ خونم دل دیگر خیالش را

فیضی۔ شیخ ابو الفیض فیضی ۱۵۴۷ء میں اکبر آباد میں پیدا ہوئے۔ ابو الفضل کے بڑے بھائی تھے۔ تاریخ، فلسفہ، طب اور ادبیات کے ماہر تھے۔ اکبر بادشاہ کے دربار کے ملک الشعرا تھے۔ فیضی نے نظامی کے جواب میں مرکز ادوار، سلیمان و بلقیس، نلدمن، ہفت کشور اور اکبر نامہ پانچ رزمیہ مثنویاں لکھیں۔ مہابھارت کا ایک حصہ فارسی میں ترجمہ کیا۔ قرآن شریف کی بے نقطہ تفسیر بھی لکھی جس کا نام سواطع الالہام ہے۔ ان کی تصانیف کی تعداد ایک سو دس ہے۔ ایک ضخیم دیوان بھی چھوڑا۔ انتقال ۱۵۹۵ء میں ہوا۔

قتیل۔ مرزا محمد حسن قتیل کا سابق نام دیوانی سنگھ تھا۔ قتیل کے والد لالہ درگاہی مل تھے۔ بزرگوں کا وطن بٹالہ (ضلع گورداس پور پنجاب) تھا۔ قتیل فرید آباد (نواح دہلی) میں ۱۱۷۰ھ میں پیدا ہوئے۔ اٹھارہ برس کی عمر میں اپنے استاد میرزا محمد باقر شہید اصفہانی کی تعلیم سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔ نواب سعادت علی خاں کے عہد وزارت میں لکھنؤ آئے اور نواب موصوف نے انھیں میر منشی کا عہدہ دیا۔ پورے ہندوستان قتیل کی فارسی دانی

شاعری، نثر نگاری اور علم و تحقیق کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ قتیل کے تلامذہ اور معتقدین کا حلقہ بہت وسیع تھا اور اس حلقہ میں باوقار لوگ بھی شامل تھے ۱۳ جنوری ۱۸۱۸ء کو انتقال فرمایا۔

قطران ۔ ابو منصور قطران تبریزی آذربیجان کے اُمرائے سلسلہ دہسو دانیان کے درباری شاعر تھے۔ قطران ایک طرز خاص کے موجد تھے۔ رشید الدین وطواط اور عبد الواسع جبلی گرجستانی ان کے طرز کے مقلد تھے۔ کہتے ہیں کہ انوری نے شاعری میں ان سے اکتساب فن کیا۔ شاہنامہ فردوسی کی طرح انھوں نے بھی حکایات ایران نظم کی تھیں جس کا نام کوشنامہ ہے۔ تفاسیر کے نام سے لغات کی ایک کتاب ان سے منسوب ہے۔ ۴۶۵ھ میں انتقال کیا۔

قلق ۔ سید امجد علی قلق لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ لیکن کدورہ (کالپی) میں رہتے تھے۔ شاعر تھے اور فخر الدولہ نواب میر مینو بیتاب کے شاگرد تھے۔ ان کا ایک دیوان بھی تھا۔ نواب انور الدولہ سعد الدین خاں بہادر شفق رئیس کالپی پہلے انھیں قلق کے شاگرد تھے۔ بعد کو غالب کے شاگرد ہوئے۔ غالب کو قلق سے بہت تعلق خاطر تھا۔ غالب شفق کو لکھتے ہیں کہ جناب میر امجد علی صاحب کا جو آپ کے خط میں ذکر نہیں آیا تو اس خیر خواہ احباب کا دل بہت گھبرایا۔ اب کے جو خط لکھیے، تو ان کی خیر و عافیت بہر نمط لکھیے۔

قمی ۔ ملا ملک قمی نے کاشان اور قزوین میں کسب کمال کیا۔ ۹۸۶ھ میں دکن (ہندوستان) میں پہلے احمد نگر کے حکمراں مرتضی نظام شاہ اور بعد کو برہان شاہ سے وابستہ ہوئے۔ پھر ایک مدت تک بیجا پور میں برہان نظام اور

ابراہیم عادل شاہ کے دربار میں رہے۔ ۱۰۲۴ھ میں گذر گئے۔

کرم حسین بلگرامی۔ غالب کے خطوط میں ایک اُن کرم حسین کا ذکر ملتا ہے جن کی فرمائش پر کلکتے میں چکنی ڈلی پر ایک قطعہ کہا تھا جس کی اوّلین بیت یہ ہے۔

ہے جو صاحب کے کف دست پہ یہ چکنی ڈلی　　زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے

انھیں کرم حسین کے بارہ میں غالب نے لکھا ہے کہ کرم حسین زندہ ہوتے تو رونا کس کا تھا۔ مگر دونوں جگہ ان کرم حسین کے نام کے ساتھ بلگرامی کا لفظ نہیں ہے۔ اس لئے یہ کرم حسین بلگرامی کوئی اور ہوں گے۔ شاید یہ کرم حسین بلگرامی وہی ہوں جو فورٹ ولیم کالج میں میر منشی شعبہ عربی و فارسی تھے اور ان لوگوں میں تھے جن کے تعاون سے کپتان ٹامس روبک نے برہان قاطع کا ایک مصحح نسخہ ۱۸۱۸ء میں شائع کیا تھا۔

کلیم۔ ابو طالب کلیم ہمدان میں پیدا ہوئے۔ دو دفعہ ہندوستان آئے۔ پہلی دفعہ جہانگیر بادشاہ کے عہد میں دوسری دفعہ شاہجہان کے عہد میں۔ شاہجہان کے مدّاحوں میں شامل ہو کر ملک الشعرا کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ کلیم ۱۰۶۱ھ میں انتقال کیا اور کشمیر میں مدفون ہوئے۔

کمال اسماعیل۔ کمال الدین اسماعیل اصفہان میں پیدا ہوئے۔ قرن ہفتم کے عظیم شاعروں میں محسوب ہوتے ہیں۔ آخری شاہان خوارزم شاہی کے ثنا خواں تھے۔ ان کے اشعار دقیق اور رنگین مضامین کے حامل ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے انھیں خلاق المعانی کا لقب دیا گیا ہے۔ شعرائے عراق کے

رنگ سخن کو انھوں نے منتہائے کمال پر پہنچا دیا۔ ان کا سال وفات سعید نفیس نے ۶۳۵ھ اور صاحب شمع انجمن نے ۶۴۶ھ لکھا ہے۔

گوئٹے۔ گوئٹے جرمنی کی عظیم ترین ادبی شخصیت ہیں۔ ۲۸ اگست ۱۷۴۹ء میں پیدا ہوئے اور ۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء کو سفر آخرت اختیار کیا۔ نقاشی موسیقی، نیچرل سائنس، قانون دانی اور مختلف زبانوں میں کمال حاصل کیا۔ اعلیٰ درجے کے شاعر اور فلسفی تھے۔ ڈرامے بھی لکھے ہیں۔

مادھو رام۔ مادھو رام نواب لطف اللہ ولد سعد اللہ خاں بادشاہ زادہ جہاندار شاہ بہادر اور نواب کوکلتاش کے سرکاری عرائض اور خطوط لکھنے کے عہدے پر مامور تھے، انشا پردازی میں ماہر تھے۔ شاعر بھی تھے۔ اس لئے قدیم انشا پردازوں کی طرح خطوط کو جا بجا اپنے شعروں سے آراستہ بھی کرتے تھے۔ ان کے فارسی خطوط کا ایک مجموعہ انشائے مادھو رام کے نام سے موجود ہے اور میری نظر سے گذرا ہے۔ انشائے مادھو رام دو فصلوں پر مشتمل ہے۔ فصل اوّل میں نواب لطف اللہ اور نواب کوکلتاش کے عرائض اور خطوط ہیں اور فصل دوم میں وہ مکتوبات ہیں جو ان کے احباب کے نام ہیں۔ دیباچے میں مادھو رام لکھتے ہیں۔

بفضل خدائے عز و جل — یافت ایں نسخہ صورت انجام
ہاتفے گفت سال تاریخش — کہ زہے منشآت مادھو رام

یعنی سال تدوین ۱۱۱۱ھ ہے۔

متنبی۔ متنبی کا نام احمد بن حسن اور کنیت ابو طیب تھی۔ ۳۰۳ھ

میں پیدا ہوئے۔ یہ متنبی اس لئے مشہور ہوئے کہ انھوں نے نبوّت کا دعویٰ کیا تھا۔ متنبی کے معنی ہیں خود ساختہ نبی۔ دعویٰ نبوّت کے وقت یہ مصر میں تھے۔ ان کو گرفتار کر کے دمشق بھیج دیا گیا۔ مگر انھوں نے معافی مانگ لی اور رہا کر دئے گئے۔ ۳۵۴ھ میں عرب قزّاقوں نے انھیں ہلاک کر دیا۔

محمد جان قدسی ۔ حاجی محمد جان قدسی مشہد سے ہندوستان آئے اور ۱۰۴۲ھ میں شاہ جہاں بادشاہ کے دربار سے وابستہ ہوئے۔ اول روز انھوں نے جو قصیدہ پیش کیا تھا اس کا مطلع یہ ہے۔

اے قلم بر خود ببال از شادی و بکشا زباں
در ثنائے قبلۂ دیں ثانیٔ صاحبقراں

انعام میں خلعت اور دو ہزار روپئے ملے اور حلقہ مدّاحان شاہ میں شامل کئے گئے۔ بعد میں ملک الشعرا کا خطاب بھی ملا۔ قدسی کا انتقال ۱۰۵۰ھ یا ۱۰۵۶ھ میں لاہور میں ہوا۔ قدسی کی ایک نعتیہ غزل بہت مقبول و مشہور ہوئی۔ مطلع ہے۔

مرحبا سیّد مکّی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

بے شمار شاعروں نے اس غزل کی تضمین کی ہے۔ غالب کو اپنی عظمت کا احساس اس قدر تھا کہ انھوں نے کبھی کسی کے کلام کی تضمین نہیں کی۔ مگر قُدسی کی غزل کی تضمین کی ہے۔

محمد حسن ۔ محمد حسن گورنر جنرل کے دفتر فارسی سے متعلق تھے۔

کلکتہ کے مشاعرے میں غالب کے کلام پر اعتراض کئے جانے پر غالب کی طرف سے جواب دینے والوں میں تھے ۔ لارڈ بینٹنگ جب کلکتے سے دہلی گئے تھے تو یہ بھی ہمرکاب تھے اور دو دن غالب کے یہاں ٹھہرے تھے ۔ غالب نے پنج آہنگ میں ان کی معزولی کا بھی ذکر کیا ہے ۔

محمد علی علوی ۔ محمد علی خاں علوی دہلی کے رہنے والے اور غالب کے معاصر تھے ۔ اپنے وقت میں فارسی کے نامور شاعر تھے ۔ غالب نے اپنی ایک بیت میں اپنے وقت کے جن فارسی کے عظیم المرتبت شاعروں کے نام لئے ہیں ان میں ایک علوی بھی ہیں ۔ غالب کی بیت ہے ۔

مومن و نیر و صہبائی و علوی وانگاہ
حسرتی، اشرف و آزردہ بود اعظم شان

مخفی ۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی صاحبزادی زیب النسا جو اپنے عہد کی مشہور شاعرہ تھیں اور مخفی تخلص کرتی تھیں ۔

مسیح کاشی ۔ حکیم مسیح کاشی شاہ عباس ثانی والیٔ ایران کے مصاحبین میں تھے ۔ بعد کو ہندوستان آئے اور اکبر سے لے کر شاہ جہاں کی سرکار سے وابستہ رہے ۔ سنہ ۱۰۶۶ھ میں کاشان میں سفر آخرت کیا ۔

ملٹن ۔ انگلینڈ کے مشہور و عظیم المرتبت شاعر جان ملٹن سنہ ۱۶۰۸ء میں پیدا ہوئے ۔ بی ۔ اے اور ایم ۔ اے کی ڈگریاں رکھتے تھے ۔ کلاسیکل ادبیات، فلسفہ، ریاضی اور موسیقی کا اچھا علم حاصل کیا تھا ۔ پیراڈائز لوسٹ تصنیف کرنے کے بعد اپنے عہد کے سب سے بڑے شاعر تسلیم کئے گئے ۔ انتقال سنہ ۱۶۷۴ء میں ہوا

منت - یہ منت شاید قمرالدین منت ہوں جو دہلی کے رہنے والے تھے اور غالب کی پیدائش سے چار پانچ سال قبل انتقال کر گئے تھے۔ میر نورالدین نوید اور شمس اللہ فقیر سے تلمذ تھا۔ بہت پُرگو شاعر تھے۔ ایک کلیات ڈیڑھ لاکھ اشعار کا چھوڑا۔ متعدد مثنویاں اور گلستان سعدی کے جواب میں شکرستان لکھی۔ ۱۱۹۱ھ میں دلّی چھوڑ کر لکھنؤ آئے۔ یہاں مسٹر جانسٹن سے ملاقات ہوئی۔ یہ ان کو کلکتہ لے گئے اور ہندوستان کے گورنر جنرل مارکوئس آف ہیسٹنگز کے روبرو پیش کیا۔ لارڈ موصوف نے ان کے قصیدے سُن کر ان کو ملک الشعرا کا خطاب دیا۔ ۱۲۰۰ھ میں گورنر جنرل نے ایک خاص سفارت پر ان کو حیدرآباد بھیجا۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے نظام دکن کی مدح میں ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا اور انعام و اکرام سے مالامال ہوئے ۱۲۰۸ھ میں دُنیا سے کوچ فرمایا۔

مولوی روم - مولانا جلال الدین مولوی روم، مولانا روم اور مولوی معنوی کے القاب سے مشہور ہیں۔ آپ کی مثنوی شریف بہت مشہور ہے جس کے متعلق مولانا جامی فرماتے ہیں۔

مثنوی مولوی معنوی   ہست قرآں در زبان پہلوی

مومن - حکیم مومن خاں مومن ۱۲۱۵ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ مومن کو اپنی شاعری پر بڑا ناز تھا۔ وہ اچھے اچھوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ گلستان سعدی کے بارہ میں کہتے تھے کہ "بس گفت ہی گفت" ہے۔ ذوق تو ذوق، غالب کو بھی نظر میں نہیں لگاتے تھے۔ مومن بہت

خود دار اور دماغ دار تھے۔ طبعاً ذوق اور غالب کے بالکل متضاد تھے۔
تاریخ ادبیات اُردو مترجمہ مرزا عسکری میں لکھا ہے کہ "خیال، فلسفۂ حیات
اور ذہانت و طباعی میں غالب اپنے معاصرین ذوق و مومن سے بڑھ کر تھے
مگر روزمرہ اور سادگیٔ بیان اور محاورہ بندی کے اعتبار سے ذوق ان سے
بڑھے ہوئے ہیں گو کہ مومن اس میں بھی کم ہیں۔"

میر انیس۔ میر ببر علی انیس ۱۲۱۶ھ یا ۱۲۱۷ھ میں فیض آباد
میں پیدا ہوئے لیکن بعد کو لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کر لی ۱۸۷۴ء
میں انتقال فرمایا۔ انیس نے مرثیہ گوئی کو منتہائے کمال پر پہنچا دیا۔ انیس
کے مدّ مقابل میرزا سلامت علی دبیر تھے۔ یہ دونوں باکمال شاعر مرثیہ گوئی
میں حریف سمجھے جاتے تھے۔ ان دونوں کے مقابلے سے اہل لکھنؤ دو گروہوں
میں تقسیم ہو گئے تھے اور انیسیے اور دبیریے کہلاتے تھے۔ دونوں کے طرفدار
بہت جوش و خروش کا اظہار کرتے تھے۔

میر تقی میر۔ میر تقی میر اکبرآباد میں پیدا ہوئے۔ والد کے انتقال کے
بعد دلی آ کر رہے۔ اگرچہ شاہ عالم کے دربار میں ان کو عزت حاصل تھی مگر
خوشحالی نہ تھی۔ بہت تنگ حال تھے۔ لکھنؤ آئے تو آصف الدولہ نے دو سو روپیہ
مہینہ کر دیا۔ ۱۲۲۵ھ میں رحلت فرمائی۔ میر کا کلام بہت زیادہ ہے۔ تمام
ارباب نقد و نظر میر صاحب کو اُردو کا سب سے بڑا غزلگو شاعر تسلیم کرتے ہیں۔
ان کو خدائے سخن کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ غالب جس طرح ہندوستان
کے فارسی شاعروں میں صرف امیر خسرو کو مسلم الثبوت اُستاد سخن مانتے تھے

اسی طرح اُردو شاعروں میں صرف میر کی اُستادی کے قائل تھے۔

میر محمد زماں راسخ۔ میر محمد زماں راسخ کا خاندان عراق عجم سے آیا تھا۔ راسخ ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ شہزادہ محمد اعظم شاہ کی سرکار میں ہفت صدی منصب پر فائز تھے۔ فارسی کے مشہور شاعر تھے۔ رضا قلی خاں ہدایت نے مجمع الفصحا میں ان کا ذکر کیا ہے۔ ۱۱۰۷ھ میں وفات پائی۔

میر غلام علی آزاد۔ میر غلام علی آزاد ۱۱۱۶ھ میں بلگرام میں پیدا ہوئے۔ فارسی و عربی میں دیوان کے علاوہ بہت ساری تصنیفات ہیں۔ تذکرہ شمع انجمن میں ان کی بہت تعریفیں ہیں۔ صغیر بلگرام کے مورث اعلیٰ تھے۔

میرزا مظہر جانجاناں۔ شمس الدین نام، مظہر تخلص اور جانجاناں عرف۔ ۱۶۹۱ء کے لگ بھگ صوبہ مالوہ کے کالا باغ میں پیدا ہوئے۔ ۱۷۸۱ء میں جاں بحق ہوئے۔ صوفی باصفا، درویش کامل اور صاحب دل تھے۔ ان کی شان بے نیازی ضرب المثل تھی۔

چند اشعار

سوز دل از ہر بُن موئیم نمایاں کردہ اند / ایں جفا جویاں مرا سرو چراغاں کردہ اند

چشم بر چشم چو افتاد گرفتار بہاست / حلقہ بر حلقہ چو افزود دگر زنجیر است

نیاز شہد پروانہ شمع خواہم بُرد / اگر وصال تو ایں بار رو نمود مرا

میاں داد خاں سیاح۔ میاں داد خاں سیاح کے والد منشی عبداللہ خاں تھے جو اورنگ آباد کے امیر لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ لیکن داد خاں کے جوان ہوتے ہوتے ساری جائداد ختم ہو چکی تھی۔ ۱۸۵۷ء میں داد خاں پر جعلی کرنسی نوٹ

بنانے کا مقدمہ قائم ہوا اور چودہ سال کی سزائے قید ہوئی۔ مگر بعد کو تخفیف ہوگئی۔ ۱۸۶۲ء میں نواب میر خان بابا رئیس سورت کی مصاحبت اختیار کرلی۔ نواب موصوف کے انتقال کے بعد دس برس تنگی میں بسر کرکے ۱۹۰۱ء میں وفات پائی۔ فارسی اور اُردو دونوں میں شعر کہتے تھے۔ غالب کے شاگرد تھے۔

میلی ۔ مرزا قلی ہروی برسوں نورنگ خاں کی ملازمت اور مدح خوانی میں مصروف رہے۔ مالوہ میں ان کا انتقال ہوا۔

ناصر علی سرہندی ۔ شیخ ناصر علی سرہندی جو علی تخلّص کرتے تھے سہرند (یعنی سرہند) میں پیدا ہوئے اور وہیں پروان چڑھے۔ شروع میں مرزا فقیر اللہ مخاطب بہ سیف خاں بدخشی کی مصاحبت میں رہے۔ لیکن جب شاہجہاں نے سیف خاں کو الٰہ آباد کی حکومت عطا کی تو ناصر علی بھی ان کے ساتھ الٰہ آباد گئے۔ سیف خاں کے انتقال کے بعد ۱۱۰۰ھ میں ناصر علی بیجا پور گئے اور وزیر اعظم ذوالفقار خاں بن اسد کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا۔ مطلع ہے۔

اے شانِ حیدری ز جبینِ تو آشکار نامِ تو در نبرد کند کارِ ذوالفقار

ذوالفقار خاں نے ایک ہاتھی اور کثیر رقم انعام دی۔ ناصر علی نے اسی وقت اور اسی جگہ تمام روپے لوگوں میں تقسیم کر دیئے اور خالی ہاتھ گھر لوٹے۔

ناطق مکرانی ۔ گل محمد خاں ناطق مکرانی اپنے وطن سے ہندوستان آئے اور لکھنؤ میں محمد علی شاہ، امجد علی شاہ اور دیگر اُمرا کی قصیدہ خوانی کرتے

رہے۔ ۱۲۶۴ھ میں فوت ہوئے۔

ناظم ہروی ۔ ناظم ہروی ہرات کے رہنے والے تھے عباس علی خاں ولد حسن خاں شاملو کی سرکار میں اعلیٰ رتبہ اور اعزاز کے مالک تھے۔ ناظم بڑے فیض رساں آدمی تھے۔ شاعر اچھے تھے جس کا ثبوت ان کی مثنوی "یوسف زلیخا" سے ملتی ہے۔ ناظم کا انتقال ۱۱۰۰ھ میں ہوا۔ **اشعار**

قطرۂ آبی کفِ خونی شد و بر آب ریخت
آدم خاکی چہ طرف از عالمِ ایجاد بست

بسکہ از بے اعتبار پہلے خود شرمندہ ام
آں چناں سوی تو می آیم کہ گویا می بردم

نبی بخش حقیر ۔ منشی نبی بخش حقیر آگرے کے رہنے والے تھے۔ انگریزی عدالت فوجداری میں سررشتہ دار تھے۔ مدتوں کول (علیگڈھ) میں مقیم رہے۔ حقیر پہلے نظیر اکبر آبادی کے بیٹے گلزار علی سے اصلاح لیتے تھے۔ بعد کو غالب سے اصلاح لینے لگے۔ اردو فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ ۱۸۶۱ء میں انتقال کیا۔ **اشعار حقیر** ۔

آج پھر اس بتِ کافر نے حقیر
وہ ادا کی کہ خدا یاد آیا

وہ نگاہیں جن سے تھی مجھکو تسلی کی امید
تشنۂ خوں، آفت دل، دشمن جاں ہو گئیں

زخوں فشانی چشم ترا بخوں گیرند
کہ ہم ز شست مرا آنچہ در دل افتاد است

در گلستاں گزرش زاں افتد
کہ گل از چشم گلستاں افتد

نساخ ۔ مولوی عبدالغفور خاں بہادر نساخ وڈپٹی کلکٹر اور ڈپٹی ڈپٹی مجسٹریٹ تھے۔ پہلی شوال ۱۲۴۹ھ میں کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۴/ جون ۱۸۸۹ء مطابق ۱۳۰۶ھ میں کلکتہ میں وفات پائی۔ میرے خیال میں متحدہ

بنگال میں نساخ سے بڑا اُردو کا شاعر نہیں گذرا۔ نساخ بنگال کے میر تقی میر تھے۔ نساخ اور وحشت میں وہی فرق ہے جو میر اور غالب میں ہے۔ نساخ نے اپنے دیوان دفتر بے مثال کا ایک نسخہ غالب کو بھیجا تھا۔ غالب نے ان کو ایک خط لکھا جو اُردوئے معلّٰی اور عود ہندی میں موجود ہے۔ لکھتے ہیں کہ دیوان فیض عنوان اسم بامسمٰی ہے۔ دفتر بے مثال اس کا نام بجا ہے' الفاظ متین' معنی بلند' مضمون عمدہ' بندش دلپسند' ہم فقیر لوگ اعلان کلمۃ الحق میں بے باک و گستاخ ہیں' شیخ امام بخش ناسخ طرز جدید کے موجد اور پرانی ناہموار روشوں کے ناسخ تھے۔ آپ ان سے بڑھ کر بصیغۂ مبالغہ (بے مبالغہ نساخ ہیں تم دانائے رموز اُردو زبان ہو' سرمایہ نازش قلمرو ہندوستان ہو" تفصیل کے لئے میری کتاب نساخ سے وحشت تک دیکھیے)

نظامی۔ نظام الدین الیاس نظامی گنجوی شہر گنجہ (آذربیجان) میں ۵۴۰ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ فردوسی کے بعد یہ دوسرے مثنوی نگار شاعر ہیں جن کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ ان کی پانچ مثنویاں مخزن الاسرار' خسرو شیریں' لیلیٰ و مجنوں' اسکندر نامہ اور اقبال نامہ خمسۂ نظامی کے نام سے مشہور ہیں۔ نظامی کے سال وفات میں بہت اختلاف ہے۔ لیکن سعید نفیس ۵۹۵ھ کو صحیح بتاتے ہیں۔

نظم طباطبائی۔ علی حیدر نظم طباطبائی ۱۲۶۹ھ یا ۱۲۷۰ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ مٹیا برج میں شاہزادوں کو تعلیم دیتے تھے۔ نواب واجد علی کے انتقال کے بعد حیدر آباد میں نظام کالج میں پروفیسر ہوئے حیدرآباد

میں شہزادوں کے اتالیق بھی ہوئے اور نواب حیدر یار جنگ کا خطاب پایا۔ دارالترجمہ میں ناظر ادبی بھی رہے۔ ۱۹۳۳ء میں وفات پائی۔ ان کی لکھی ہوئی "شرح دیوان غالب" بہت وقیع اور مشہور شرح ہے۔ ان کی غزلیات کا مجموعہ بھی شائع ہوا ہے۔

نظیری ۔ محمد حسین نظیری نیشاپور (خراسان) کے باشندہ تھے۔ اکبر بادشاہ کے عہد حکومت میں ہندوستان آئے اور مرزا عبدالرحیم خانخاناں جیسا قدردان اور جوہر شناس سرپرست ملا۔ انھوں نے خانخاناں کی تعریف میں قصیدے کہے اور خانخاناں کی فیاضی سے مالامال ہوئے حج سے لوٹ آنے کے بعد احمد آباد (گجرات) میں مقیم ہوئے ایک دفعہ جہانگیر بادشاہ نے ایک عمارت کے لئے ایک کتبہ لکھنے کو کہا۔ نظیری نے ایک غزل لکھ کر پیش کی۔ غزل کا مطلع ہے

ایں خاک درت صندل سر گشتہ سراں را   بادہ مژہ جاروب رہت تاجوراں را

بادشاہ نے انعام میں قریب تین ہزار بیگھ زمین عنایت کی۔ درویش صفت اور صوفی سیرت آدمی تھے۔ سنہ ۱۰۲۳ھ میں دارفانی سے کوچ کیا۔

نعمت خاں عالی ۔ مرزا محمد نعمت خاں عالی کے والد فتح الدین شیراز سے ہندوستان آئے اور عالی ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد کے ساتھ شیراز گئے اور اکتساب علم کر کے پھر ہندوستان آئے۔ سنہ ۱۱۲۱ھ میں انتقال ہوا۔

نواب سعادت علی خاں ۔ نواب سعادت علی خاں بہادر لکھنؤ کے نواب آصف الدولہ کے مختلف البطن بھائی تھے۔ سنہ ۱۷۹۷ء میں مسند وزارت پر

جلوہ افروز ہوئے۔ ان میں اور انگریزوں میں ایک معاہدہ ہوا تھا جس کی وجہ سے ان کے ملک کا دو تہائی حصہ انگریزی علاقے میں شامل ہو گیا۔ نواب سعادت علی خاں علوم و فنون کے قدر داں تھے۔ انشا اللہ خاں ان کے درباری شاعر تھے جو شاعری سے زیادہ مسخرہ پن سے نواب صاحب کا دل بہلاتے تھے۔ اور نواب صاحب کا عیش و عشرت کے سوا کچھ کام نہ تھا۔

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ ۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ جہانگیر آباد (ضلع میرٹھ) کے جاگیردار تھے۔ علاوہ اس کے انگریزی حکومت سے بیس ہزار روپیہ سالانہ ملتا تھا۔ شیفتہ ۱۸۰۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ مختلف کامل الفن اساتذہ کی نگرانی میں تعلیم حاصل کی۔ ابتدائی زندگی میں "شوق صنم" اور "ذوق مے نوشی" بھی رہا۔ بعد کو توبہ کر لی اور ۱۸۳۹ء میں حج بیت اللہ بھی کر آئے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں معتوب ہوئے۔ جاگیر ضبط ہو گئی۔ سات برس قید کی سزا ملی۔ مگر اپیل پر بری ہو گئے۔ شیفتہ اُردو فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ اُردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے۔ اُردو کلام پر مومن سے اور فارسی کلام پر غالب سے اصلاح لیتے تھے۔ شیفتہ کا لکھا ہوا تذکرہ "گلشن بے خار" مشہور ہے۔ ان کے صاحبزادے نے ان کے کلام کا ایک مجموعہ بھی شائع کیا تھا۔ اشعار

ہم طالب شہرت ہیں ہمیں ننگ سے کیا کام
بد نام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
ہے آگ سی جو سینے کے اندر لگی ہوئی

طوفان نوح لانے سے اے چشم فائدہ
دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

رحم است بر کسیکہ دراں کوے می رود
در دست نامۂ من و بر لب سلام ما

در انجمنت بسر رسیدیم
در عشق تمیز پا و سر نیست

عمر کوتاہ دادہ اند مرا
گو شبِ غم بود دراز چہ باک

نواب کلب علی خاں۔ نواب کلب علی خاں بہادر نواب یوسف علی خاں بہادر والیِ رام پور کے فرزند اکبر تھے۔ ۱۸۳۵ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۶۵ء میں اپنے والد کی رحلت پر رامپور کے حکمراں ہوئے۔ خلیفہ غیاث الدین عزّت صاحبِ غیاث اللغات سے فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ بہت پابند شرع تھے۔ غیر شرعی آمدنی سے خزانے کی دولت کو پاک رکھتے تھے۔ ان کا دربار اہل فضل و کمال سے بھرا رہتا تھا۔ روزانہ کسی نہ کسی علمی یا ادبی مسئلہ پر اہل دربار کی طبع آزمائی کرتے تھے۔ اردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ اردو کے چار دیوان اور فارسی کا ایک دیوان چھوڑا۔ ۱۸۸۶ء میں راہ فردوس اختیار کی۔ غالب سے کوئی تلمّذ نہ تھا۔

نواب یوسف علی خاں۔ نواب یوسف علی خان بہادر ۵ مارچ ۱۸۱۶ء میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد نواب محمد سعید خاں کے انتقال کے بعد ۱۸۵۵ء میں رامپور کے حکمراں ہوئے۔ مفتی صدرالدین آزردہ اور مولانا فضل حق جیسے جید علما سے عربی اور دیگر عقلی و نقلی علوم حاصل کیے۔ فارسی خلیفہ غیاث الدین عزّت جامع غیاث اللغات اور غالب سے پڑھی۔ ۲۱ اپریل ۱۸۶۵ء میں انتقال فرمایا۔ نواب صاحب اردو فارسی دونوں میں فکر سخن کرتے تھے۔ فروری ۱۸۵۷ء سے غالب کے کلام پر اصلاح لینی شروع کی اور

بعد کو غالب کو سو روپیہ ماہوار وظیفہ دینے لگے۔ غالب کی تجویز پر ناظم تخلّص اختیار کیا تھا۔ نواب صاحب غالب کو بہت مانتے تھے۔ ۱۸۷۰ء میں ان کا دیوان شائع ہوا۔

نوعی ۔ مُلّا رضا نوعی خبوشان (خراسان) کے رہنے والے تھے۔ بچپن میں اپنے والد کے ساتھ ہندوستان آئے۔ مگر تھوڑے ہی دنوں کے بعد خبوشان لوٹ گئے۔ والد کے انتقال کے بعد پھر ہندوستان آئے اور مرزا یوسف خاں کی سرکار میں ملازم ہو گئے۔ یوسف خاں کے قصیدہ گو اور مصاحب بنے رہے۔ یوسف خاں جب کشمیر گئے تو یہ بھی ساتھ گئے۔ کشمیر کی آب و ہوا نے ان کی شعر گوئی کے جذبے کو اُبھارا۔ بعد کو شاہزادہ دانیال نے ان کو اپنے مدّاحین کے زمرے میں شامل کر لیا۔ نوعی نے ایک ساقی نامہ لکھا تھا جس سے متاثر ہو کر خان خاناں نے دس ہزار روپے اور ہاتھی گھوڑے عنایت کئے۔ ساقی نامہ میں سات سو ابیات ہیں۔

نیاز فتحپوری ۔ محمد خاں جو نیاز فتحپوری کے نام سے مشہور ہیں ۱۸۸۴ء میں فتحپور میں پیدا ہوئے۔ مدرسہ عالیہ فتحپور، مدرسہ عالیہ رامپور اور ندوۃ العلما کے دارالعلوم سے تعلیم حاصل کر چکنے کے بعد پرائیوٹ طور پر انگریزی میں ایف۔ اے کیا۔ مختلف روزانہ اخبارات میں کام کیا۔ ماہنامہ نگار اول رامپور سے اور پھر بعد میں لکھنؤ سے نکالتے رہے۔ پاکستان جانے کے بعد نگار پاکستان کے نام سے نکالا۔ نگار کو کامیابی کے ساتھ نکال کر نیاز صاحب نے اُردو زبان کی عظیم الشان خدمت انجام دی۔ نگار کے تمام

سالنامے بہت اہم ہیں جن میں قرآن نمبر، خدا نمبر، فرمانروایانِ اسلام نمبر، اسلامی علوم و علمائے اسلام نمبر، بزمِ نگار نمبر، اصنافِ سخن نمبر بہت مفید اور معلوماتی ہیں۔ نیاز صاحب کی تحریرات اور تصنیفات سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کو علم و ادب کے کئی اصناف میں کمال حاصل تھا۔ چند سال قبل دُنیائے فانی کو چھوڑا۔

وارستہ سیالکوٹی ۔ سیالکوٹی مل وارستہ سیالکوٹ (پاکستان) میں پیدا ہوئے تھے۔ وطن سے نکل کر جہان آباد اور دوسرے مقامات کی سیر کی۔ ۱۱۸۰ھ میں ملتان میں وفات پائی۔ آدمی پست قد اور طرار زباں تھے۔ اپنے اکثر معاصرین کی ہجو کی ہے۔ انھوں نے ایک تذکرہ مرتّب کیا تھا جس میں اکثر شاعروں پر اعتراض وارد کئے ہیں۔ یہ حقیقت میں تذکرہ نہ تھا بلکہ اعتراض نامہ تھا۔ وارستہ کو فارسی نظم و نثر دونوں پر قدرت حاصل تھی۔ یہ ناقد بھی تھے اور محقق بھی۔ انھوں نے کئی مفید رسالے لکھے ہیں۔ ان میں ایک مصطلحات الشعرا ہے۔ اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ "میں نے فارسی دواوین اور الفاظ و محاورات کا مطالعہ کیا اور زبان دانوں کے اشعار میں مستعمل الفاظ کی تحقیق کا ارادہ کیا۔ اگرچہ محاورات کی تلاش میں کتب لغات کی اوراق گردانی کی مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ناچار زباندانان ایران کے ساتھ رہنے لگا اور پندرہ سال تک جستجو میں رہ کر مصطلحات الشعرا لکھی۔" خان آرزو نے اپنے رسالہ سراج منیر میں وارستہ کے ایک دوست حکیم بیگ خاں حاکم کے کلام پر اعتراض کئے تھے۔ وارستہ نے اس کے رد میں "جواب شافی" لکھا

ایک اعتراض اور اس کی تردید ملاحظہ ہو۔

حاکم۔

کلکم بوصف ابروے پرجبین او بکف — چو شاخ آہو است ز سر تا بپا گرہ

خان آرزو۔ شاخ آہو میں گرہیں نہیں ہوتیں پیچ و خم ہوتا ہے۔

وارستہ۔ اساتذہ کے کلام سے ثابت ہے کہ گرہیں ہوتی ہیں۔ صائب کہتا ہے۔

عقدۂ حرص از مرور زندگی گردد زیاد — شاخ آہو پر گرہ از کثرت سال خود است

واقف۔ مولانا نور العین واقف بٹالوی سراج الدین علی خاں آرزو کے شاگرد تھے۔ واقف کے والد مولانا امانت اللہ شرفائے پنجاب اور انبالہ (من مضافات لاہور) کے قاضی تھے۔ واقف کا انتقال غالب کی ولادت سے تقریباً بارہ سال قبل ۱۲۰۰ھ مطابق ۱۷۸۵ء میں ہوا۔ واقف کا دیوان ۱۳۰۰ھ میں چھپا۔ دیوان کا مطلع ہے۔

اے بزم شوق تو نالاں بہر سو سازہا — رفتہ در ہر گوشۂ زاں سازہا آوازہا

رضا قلی خاں ہدایت نے مجمع الفصحا میں لکھا ہے کہ واقف ہندی اسمش نور العین و از شعراے معاصرین بودہ۔ از اشعار اوست و شعر ثانی را میر آزاد کشمیری وقتے بر من خواند و بخود نسبت می دارد۔

در دسند از کوچۂ دلدار می آیم — آہ کز دار الشفا بیمار می آیم

یارب چہ چشمہ ایست محبت کہ من ازاں — یکقطرہ آب خوردم و دریا گریستم

واقف کے چند اور اشعار ملاحظہ

خجل ز انجمنم شرمسار از چمنم — نہ عندلیب نہ پروانہ کردہ اندمرا

رسید یار و گریبان من درید و گذشت
براد کوتہئ دست من رسید و گذشت

نے جیب من درید و نہ دامان من کشید
مارا دریں بہار نیامد بکار دست

زہر کسے بجہاں یادگار می ماند
بکوئے یار ز ماہم غبار می ماند

قسمت ببیں کہ از لبِ شیریں نو خطش
حلوا بدیگران د بما دود می رسد

ترا کہ گفت کہ مائل بہ سیرِ بستاں باش
بنوش یکدو سہ جامے و خود گلستاں باش

شود سالک ز بندِ خود رہا آہستہ آہستہ
رود از دست چوں رنگِ حنا آہستہ آہستہ

نو آمدم بدام تو زودم چہ می کنی
بگذار یکدو روز بکنج قفس مرا

خامہ را احوال ما تقریر کردن مشکل است
زانکہ اورا بر زباں زخم است مارا در دل است

وہاب حیدر۔ وہاب حیدر غالب کے مشہور کارٹونسٹ تھے۔ انھوں نے ساری عمر غالب کے اشعار کی شرحیں اپنے کارٹونوں میں کیں۔ وہاب حیدر حیدرآباد (ہند) کے رہنے والے تھے۔ ذریعہ معاش کے

سلسلے میں بمبئی بھی رہے۔ روزنامہ سیاست (حیدرآباد) اور روزنامہ انقلاب بمبئی سے زیادہ تر وابستہ رہے۔ ہمیشہ بیمار اور پریشان رہے۔ بہت زیادہ پیتے تھے۔ انتقال ۷ ستمبر ۱۹۶۶ء کو ہوا۔

ہرگوپال تفتہ۔ منشی ہرگوپال تفتہ ۱۷۹۹ء یا ۱۸۰۰ء میں سکندرآباد میں پیدا ہوئے۔ وکیل تھے اور مدّتوں انگریزی محکمہ بندوبست میں قانونگو رہے۔ ۲ ستمبر ۱۸۷۹ء کو سکندرآباد میں وفات پائی۔

تفتہ کو واقف بٹالوی کا دیوان پڑھ کر شعر گوئی کا شوق ہوا تھا۔ پہلے رامی تخلص کرتے تھے۔ غالب کے شاگرد ہوئے تو غالب کے مشورے سے تفتہ تخلص اختیار کیا اور غالب نے ان کو مرزا کا لقب دے کر مرزا تفتہ بنا دیا۔ تفتہ نے چار ضخیم دیوان چھوڑے ہیں۔ اس قدر زود گو تھے کہ غالب ان کی زود گوئی سے گھبراتے تھے مگر ناز برداری میں کمی نہیں کرتے تھے۔

ہمام۔ خواجہ ہمام الدین ہمام تبریزی آذربیجان کے نامور شاعروں میں محسوب ہوتے ہیں۔ فن غزل کے ماہر تھے۔ شیخ سعدی کے ہمعصر تھے۔ بہت خوش مزاج آدمی تھے۔ ہمام عمر طولانی پاکر ۷۱۴ھ میں تبریز میں وفات پائی۔

یحییٰ کاشانی۔ یحییٰ کاشانی کاشان سے ہندوستان آئے اور داراشکوہ کے ثنا خواں ہوئے۔ ۱۰۶۴ھ میں وفات پائی۔

یگانہ چنگیزی۔ مرزا واجد حسین جو پہلے یاس تخلص کرتے تھے اور یاس عظیم آبادی مشہور تھے لکھنؤ جا کر یاس سے یگانہ اور پھر یگانہ سے یگانہ چنگیزی بن گئے۔ ۱۸۸۴ء میں عظیم آباد (پٹنہ) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۴ء میں

لکھنؤ میں مستقل قیام اختیار کر لیا۔ یگانہ سے یگانہ چنگیزی بن کر بڑے بڑے ادبی جھگڑے اور فساد برپا کئے اور آخر میں چنگیزی جذبہ اس قدر بڑھ گیا کہ دماغ کا توازن قائم نہ رہا اور وہ کام کر گزرے کہ آپ کو شاتم رسول کے لقب سے ملقّب کر کے شاہراہ عام پر ذلیل کیا گیا۔ ۱۹۵۶ء میں آپ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔ چراغ سخن، آیات وجدانی، غالب شکن ترانہ اور گنجینہ یگانہ آپ کی قابل ذکر تصانیف ہیں۔

اسرار کریمی پریس الہ آباد

مصنّف کی دیگر تصنیفات

(۱) نساخ سے وحشت تک (بنگال کے چار اُردو اساتذۂ سخن کا تذکرہ ... ... ۵۰ — ۳

(۲) تجلّیات شعرستان فارسی (بارہ فارسی شاعروں پر مقالات ۰۰ — ۵

(۳) غالب سرائی (غالب کی مدح میں غزلیں اور رُباعیات — ۷۵ — ۰

(۴) کیف و اضطراب (غزلوں، قصیدوں، نظموں اور رُباعیوں کا مجموعہ ... ... ۷۵ — ۲

ملنے کا پتہ

عثمانیہ بُک ڈپو

۱۰۴ لور چیت پور روڈ کلکتہ ۱